چین کدھر؟

چین کدھر؟

لال خان

لوگو لگانا، پبلیکیشنز

’جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں‘

نام کتاب: چین کدھر؟
مصنف: لال خان
تعارف و تحقیق: آدم پال
ایڈیشن: مارچ 2015ء
تعداد اشاعت: 1100
ناشر: طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز 105 منگل مینشن رائل پارک لکشمی چوک لاہور
فون: 042-36316214 042-36365659:
پرنٹرز: یاسر عمیر پرنٹرز
صفحات: 239
قیمت: 500

e-mail: editor@struggle.com.pk

www.struggle.com.pk

www.marxist.com

اِنتساب

مارکسی استاد

ٹیڈ گرانٹ

کے نام، جن کا انقلابِ چین 1949ء کا تناظر

تاریخ کی کسوٹی پر سچ ثابت ہوا

اظہارِ تشکر

اگر چند ساتھیوں کی محنت اور مخلص لگن شامل نہ ہوتی تو شاید یہ کتاب منظر عام تک نہ پہنچ پاتی۔ کامریڈ راشد خالد جنہوں نے دن رات محنت کر کے اس کتاب کی پروف ریڈنگ کی، زبان کو سہل بنایا اور تمام کام چھوڑ کر اس کتاب کی وقت پر اشاعت ممکن بنائی۔ ان کی معاونت کراچی سے کامریڈ پارس جان اور جامپور سے کامریڈ رؤف لنڈ نے کی۔ کامریڈ رنگ الٰہی نے اس کتاب کے سرورق اور لے آؤٹ کو اپنے تجربے اور مہارت سے دیدہ زیب اور جامع بنایا۔ گزشتہ تیس سال سے ہمارے رفیق اور ساتھی آصف بٹ صاحب نے ہمیشہ کی طرح پرنٹنگ کے ہر مرحلے پر انتھک محنت سے لوڈ شیڈنگ سمیت تمام مصائب کو شکست دے کر اس کو کتابی شکل میں مکمل کروایا۔ کامریڈ آدم پال نے نہ صرف اس کتاب کے لئے تحقیق کی بلکہ اس مسودے کو تشکیل دینے کی کاوش میں ان کا کلیدی کردار ہے۔ میں اپنے چار دہائیوں سے دوست اور ساتھی کامریڈ ایلن ووڈز کا بھی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا فلیپ تحریر کیا اور اپنی حمایت اور سپورٹ سے اس کتاب کو مرتب کرنے کے لئے ہمارے حوصلے بلند کئے۔ اس کتاب میں کسی غلطی یا کمی کی ذمہ داری صرف میری ہوگی۔

لال خان

لاہور، فروری 2015ء

فہرست

پیش لفظ	12
تعارف	33
باب I: قدیم چین	39
تاریخ نویسی	40
پتھر کا دور	44
شہری انقلاب	47
ہان خاندان	52
چین کے شاہی خاندان	54
قدیم چینی سماج	56
ادب، فنون اور ثقافت	64
کسان بغاوتیں	65
باب II: چین کی نوآبادکاری	68
بغاوتیں	69
پہلی افیون جنگ	71
دوسری افیون جنگ	75
فرانس کے ساتھ جنگ	79
کوریا اور جاپان	80

''باکسر'' بغاوت 82
باب III: 1911ء کا سرمایہ دارانہ انقلاب 84
باب IV: کمیونسٹ پارٹی کا قیام اور تیسری انٹرنیشنل 96
مزدور تحریک 96
4 مئی کی تحریک 99
کمیونسٹ پارٹی کا قیام 102
تیسری انٹرنیشنل 104
باب V: 1925-27ء کا انقلاب 109
چیانگ کائی شیک 111
20 مارچ 1926ء کا کُو (قومی بغاوت) 114
اسباق 117
باب VI: لانگ مارچ 122
باب VII: 1945-49ء کا انقلاب 132
تجزیہ 139
باب VIII: بعد از انقلاب چین کا ارتقا 149
ثقافتی انقلاب 155
باب IX: سرمایہ دارانہ رد انقلاب 164
1978ء کا موڑ اور ڈینگ 168
1992ء: ''چینی خدوخال کے ساتھ سوشلسٹ منڈی کی معیشت'' 173
قصبوں اور دیہاتوں کی صنعتیں (TVEs) 178
باب X: سرمایہ دارانہ استواری اور ریاست کا کردار 180
ڈبلیوٹی او (WTO) میں شمولیت کا عمل 182

سرد بدلاؤ؟(Cold Transition)
184
اکیسویں صدی کے آغاز پر چین 190
باب XI: چینی سامراج؟ 195
کرنسی کی جنگ 196
عسکری تیاری 199
روس اور وسطی ایشیا 201
جاپان اور کوریا 204
بحرالکاہل کے دیگر ہمسائے 205
افریقہ 207
لاطینی امریکہ 209
مشرقِ وسطیٰ 210
جنوبی ایشیا 211
پاک چین ''دوستی''؟ 213
قومی جبر، تائیوان اور ہانگ کانگ 214
باب XII: چین کدھر؟ 218
کمیونسٹ پارٹی 221
معیشت کا تناظر 223
طبقاتی جدوجہد کا تناظر 226
مزدور تحریک 228
انقلاب کی تیاری کا عمل 232
حوالہ جات 236

تعارف

لوشون چینی ادب کا عظیم نام ہے۔ 1936ء میں وفات پانے والے کمیونسٹ تحریک کے اس کارکن کا عظیم افسانہ 'پاگل آدمی کی ڈائری' پہلی دفعہ مئی 1918ء میں شائع ہوا جسے نہ صرف جدید چینی ادب کا پہلا افسانہ کہا جاتا ہے بلکہ یہ اس عہد کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اس افسانے کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

''میرے اندر اس بات کو سوچنے کا حوصلہ نہیں۔

مجھے ابھی احساس ہوا ہے، جہاں میں رہ رہا ہوں وہاں پچھلے چار ہزار برسوں سے انسانی گوشت کھایا جا رہا ہے۔ جب ہماری بہن کی موت واقع ہوئی تھی اُس وقت بھائی نے گھر کا نظام سنبھالا ہی تھا۔ ممکن ہے اُس نے چاولوں اور دوسرے کھانوں میں بہن کا گوشت ڈالا ہو۔ ہم نے غیر ارادی طور پر وہ کھالیا۔

ممکن ہے میں نے غیر ارادی طور پر اپنی بہن کا گوشت کھایا اور اب میری باری ہے۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے جیسا آدمی جس کے پیچھے چار ہزار سال آدم خوری کی تاریخ ہو (شروع میں، میں اس بارے میں لاعلم تھا) ایک صحیح آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے۔

غالباً ابھی کچھ ایسے بچے ہیں جنہوں نے آدمی کو نہیں کھایا۔ ان بچوں کو بچانا چاہئے۔۔۔''

بیسیوں صدی کے انقلابات اور ردِ انقلاب کے طوفانی واقعات سے گزرنے کے بعد آج پھر چین ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ سرمایہ دارانہ استحصال اور جبر پوری شدت کے ساتھ چین کے سماج کو نوچ رہا ہے۔ کروڑوں محنت کش غربت، بھوک، بیماری، ذلت اور محرومی کی زندگی گزارنے

پر مجبور ہیں۔ جبکہ دوسری طرف بھوکے اور بیمار محنت کشوں کی پیدا کی گئی دولت نہ صرف چین کے حکمرانوں کی پرتعیش زندگی کا باعث ہے بلکہ پوری دنیا کے سرمایہ داراس پر گدھ کی طرح حملہ آور ہیں۔ایسے میں چین کو عالمی کارپوریٹ ذرائع ابلاغ پر ایک ابھرتی ہوئی معیشت اور طاقت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔کروڑوں چینیوں کے خون اور پسینے پر استوار ہونے والی اس دیوہیکل ریاست کو گرتے ہوئے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ایک کلیدی سہارے کے طور پر دیکھا جا رہا تھا۔لیکن دوسری جانب ان محنت کشوں کی حالتِ زار اوران کی جدوجہد پر جہاں چین کی خونی ریاست لوہے کے پردے ڈالتی ہے وہاں مغربی ذرائع ابلاغ بھی یا تو اس سے نظریں چراتے ہیں یا اسے اپنے سامراجی مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ چین کے سماج کا طبقاتی بنیادوں پر تجزیہ کیا جائے اور دوسرے خطوں کے محنت کشوں تک ایک حقیقی تصویر پیش کی جائے۔

دائیں بازو کے حملوں کے ساتھ ساتھ چین کی تاریخ اور موجودہ کیفیت کو بائیں بازو کے زوال پذیر دانشوروں نے بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام سے مفاہمت، مزدوروں کی تحریک اور بائیں بازو کے انقلابی نوجوانوں کی جدوجہد کو اقتدار کے حصول کے لیے استعمال کرنے کے لیے سابقہ سٹالنسٹ اور نام نہاد بائیں بازو کے لیڈر چین کے موجودہ ماڈل کو مثال بنا کر پیش کرتے ہیں۔اس مقصد کے لیے چین کے محنت کشوں کی عظیم انقلابی روایات کو بھی مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں زیرِ نظر کتاب خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب میں چینی سماج کی پوری تاریخ کو تاریخی مادیت کی بنیادوں پر پرکھ کر ایک حقیقت پر مبنی نکتہ نظر کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔موجودہ کیفیت کا تجزیہ کر کے آئندہ کے بارے میں حالات کے رخ کی پیش گوئی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس خطے کی تاریخ کو درست انداز میں سمجھا جائے۔

اس مقصد کے لیے پہلے باب میں چین کی قدیم تاریخ کا مارکسی بنیادوں پر تجزیہ کیا گیا ہے۔ چین کی قدیم تاریخ بیسویں صدی میں متعدد بار مارکسی تجزیہ نگاروں میں بحث کا موضوع رہی ہے۔تیسری انٹرنیشنل میں بھی چین میں انقلاب کے کردار کا تعین کرنے کے لیے جو بحثیں ہوئیں ان میں قدیم تاریخ کا تجزیہ بھی مختلف حوالوں سے کیا گیا۔ٹراٹسکی نے واضح کیا تھا کہ چین میں انقلاب کا کردار سوشلسٹ ہوگا اور اس کے لیے کسی سرمایہ دار طبقے سے مفاہمت کرنا خودکشی کے

مترادف ہوگا۔اسی طرح ان بحثوں کے دوران مارکس کے ایشیائی طرز پیداوار پر کیے گئے کام پر بھی بحث کی گئی۔لیکن سٹالنزم کے غیر مارکسی نظریات کے باعث مارکس کے نظریات کو رد کرتے ہوئے میکانکی انداز میں یورپ کے سماج کے تاریخی مراحل کو چینی سماج پر مسلط کر دیا گیا۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹیوں کی سٹالنسٹ قیادتوں نے یہاں بھی ایسا ہی کیا۔ 1949ء کے غیر کلاسیکی سوشلسٹ انقلاب کے بعد بھی اس حوالے سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اور چین کی قدیم تاریخ انقلابیوں کے لیے ایک معمہ بنی رہی۔اس حوالے سے یہ باب اہمیت کا حامل ہے۔

انیسویں صدی میں چین پر ہونے والا سامراجی تسلط بھی توجہ کا مستحق ہے جس نے وہاں کے سماج کو جہاں تاراج کیا وہاں انقلابات کے بیج بھی بوئے۔چین کے حکمران طبقات اس دور کو جہاں ذلت اور شرمندگی کا عہد قرار دیتے ہیں وہاں مارکسسٹ سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کرتے ہوئے اس عہد کے ذریعے چین کو ایک تکلیف دہ عمل سے عالمی سرمایہ داری سے جڑتے ہوئے اور وہاں ایک پرولتاریہ کا ظہور ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔انہی تبدیلیوں کے باعث 1911ء کا بورژوا انقلاب برپا ہوا جس نے چین میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا اور اسے قدامت سے نکال کر جدید دنیا کے ساتھ جوڑا۔دوسرے اور تیسرے ابواب میں انہی حوالوں سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کا قیام چین کے ہزاروں سال پرانے سماج میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر جہاں عالمی مزدور تحریک منظم ہو رہی تھی اور چینی گماشتہ سرمایہ داری کا جنم ہو رہا تھا، ساتھ ہی چین میں ایک تازہ دم پرولتاریہ بھی لڑائی کے لیے انگڑائی لے رہا تھا۔ایسے میں ہمسایہ ملک روس میں ہونے والا 1917ء کا سوشلسٹ انقلاب اس محنت کش طبقے کے لیے بہت بڑے تحرک کا باعث بنا۔اسی دوران چین کی کمیونسٹ پارٹی کا قیام اور پھر 27-1925ء کا انقلاب ایسے واقعات ہیں جو پوری دنیا کے انقلابیوں کے لیے نہ صرف اس وقت اہمیت کے حامل تھے بلکہ آج بھی اہم نتائج اخذ کرنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ تیسری انٹرنیشنل کی ان واقعات میں مداخلت اور اس پر ٹراٹسکی کا جرات مندانہ مؤقف کی تفاصیل چوتھے اور پانچویں ابواب میں درج ہیں۔

لانگ مارچ آج پوری دنیا میں جدوجہد کی علامت سمجھا جاتا ہے۔دائیں بازو کے مفاد

پرست سیاستدانوں سے لے کر انقلابی راہنماؤں تک ہر کوئی اس علامت کو اپنے کارکنوں کو تحریک دینے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ اس کی حقیقت اور اس کے کردار سے واقف ہیں۔ انقلاب کی جدوجہد میں مگن کارکنوں کو اس تاریخ کے اہم ترین واقعہ کا علم ہونا ضروری ہے۔ بہت سی بائیں بازو کی قیادتیں اس لانگ مارچ کی معروضی وجوہات اور اس کے کردار کو سمجھے بغیر اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور مسلح جدوجہد کے لیے اسے دلیل کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے بھی اس واقعہ کو اس کے تاریخی پسِ منظر میں جاننا ضروری ہے۔ دوسری جانب سامراجی طاقتیں بھی گوریلا جنگ کے لائحہ عمل اور طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے ماؤ کے لانگ مارچ پر خصوصی تحقیق جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عالمی سامراجی قوتیں جنگ کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے ٹراٹسکی، کلازیوٹز اور سن تزو کے ساتھ ساتھ ماؤ کو بھی کلیدی نظریہ دان تسلیم کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کو درست طور پر صرف مارکسی بنیادوں پر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ چھٹے باب میں اسے مارکسی مؤقف اور تجزیئے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح 1949ء میں چین میں برپا ہونے والا سوشلسٹ انقلاب انسانی تاریخ کا 1917ء کے روس کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد دوسرا اہم ترین واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس انقلاب کی نظریاتی بنیادوں اور اہم واقعات کے ساتھ ساتھ اس کی زوال پذیری پر بھی اہم بحث ساتویں اور آٹھویں باب میں کی گئی ہے۔

اس عظیم انقلاب کے خلاف ردِ انقلاب اور چین میں سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام کی استواری بھی مارکسی نظریات سے وابستہ انقلابیوں کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل موضوعات ہیں۔ ماضی میں کیے جانے والے جرائم پر پردہ پوشی سے نہ تو کچھ سیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی آئندہ کی جدوجہد اور انقلابات کو لاحق خطرات سے درست انداز میں لڑا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چین کے موجودہ کردار کو سمجھنے اور وہاں کے حکمران طبقے کی حقیقت جاننے کے لیے بھی اس ردِ انقلاب کا مارکسی تجزیہ ضروری ہے۔ اس لیے نواں اور دسواں باب اہمیت کے حامل ہیں۔

گیارہواں باب چین کی خارجہ پالیسی اور دنیا بھر میں اس کی ابھرتی ہوئی سامراجی قوت پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ چین نہ صرف پوری دنیا سے خام مال درآمد کر رہا ہے بلکہ اس کی ترسیل کو محفوظ بنانے کے لیے اقدامات بھی کر رہا ہے۔ اسی طرح چینی مصنوعات کی دنیا بھر میں موجود منڈی کا تحفظ کرنے کے لیے اختیار کی جانے والی معاشی اور اقتصادی پالیسیاں

دیگر سامراجی قوتوں سے ٹکراؤ کا باعث بن رہی ہیں۔ گیارہواں باب انہی تضادات کی وضاحت کرتا ہے۔ جبکہ آخری باب چین کی موجودہ صورتِ حال، حکمران طبقات کے تضادات اور محنت کش طبقے کی کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تحریک کا تناظر پیش کرتا ہے۔

اس حوالے سے یہ نسبتاً مختصر کتاب چین کی ہزاروں سال پر محیط تاریخ کا مارکسی نکتہ نظر پیش کرتی ہے۔ بہت سے قارئین میں ان تمام موضوعات کو مزید تفصیل میں جاننے کی خواہش ضرور موجود ہوگی جس کے لیے انہیں زیرِ نظر کتاب میں تشنگی اور کمی محسوس ہوسکتی ہے۔ اسی لیے یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ اس تصنیف میں موجود ہر باب پر ایک علیحدہ کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

حقیقت کو جاننے کا عمل کبھی بھی مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ ہمیشہ جاری وساری رہتا ہے۔ سائنسی بنیادوں پر علم کے حصول کا عمل مسلسل گہرائی کی جانب گامزن رہتا ہے۔ محض واقعات کو بیان کر دینا کافی نہیں ہوتا اور نہ ہی انہیں کیلنڈر کے مطابق ترتیب دینے سے تاریخ کو جانا جاسکتا ہے۔ حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف واقعات کے درمیان معروضی تعلق کو تلاش کیا جائے اور ایک سے دوسری کیفیت میں تبدیلی کے عمل کو جانا جائے۔ اس کے لیے تاریخ کے قوانین کو جاننا ضروری ہے جو خود اس تاریخ میں سے ہی اخذ کیے گئے ہوں نہ کہ محض خیال کی پیداوار ہوں اور انہیں تاریخ پر تھوپ دیا جائے۔ اسی طرح تاریخ کو ایک مسلسل عمل کے تسلسل میں جاننا ضروری ہے۔ بچپن سے بڑھاپے تک انسان بہت سی اشیا اور عوامل کو جانتا ہے۔ لیکن کسی بھی عمل یا شے کو جیسے ایک بچہ دیکھتا ہے ایک بزرگ اسے مختلف انداز میں دیکھتا ہے۔ ایک ہی بات کسی ناتجربہ کار نوجوان کی زبان سے ادا ہو تو اس کے معنی اور ہوتے ہیں لیکن وہی جملہ ایک وسیع تجربے کا حامل شخص بیان کرے تو اس کی گہرائی اور معنی مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا عمومی شعور بھی مسلسل گہرا ہوتا جاتا ہے اور اس عمل کا کوئی اختتام نہیں بلکہ یہ ہمیشہ جاری وساری رہے گا۔ اینگلز اپنی تصنیف ''لڈوگ فیورباخ اور کلاسیکی جرمن فلسفے کا خاتمہ'' میں لکھتا ہے،

''تاریخی لحاظ سے یکے بعد دیگرے آنے والے سارے سماجی نظام انسانی سماج کے ارتقا کے لامحدود دھارے میں، نیچے سے لے کر اوپر تک محض عبوری منزلیں ہوتے ہیں۔ ہر منزل ضروری ہے اور اسی لئے اس وقت اور حالات کے لئے مناسب ہوتی ہے جن کی وہ پیداوار ہوتی ہے۔ لیکن نئے اور زیادہ بلند حالات کے سامنے جو خود اس کے بطن میں پرورش پاتے ہیں، یہ منزل اپنا جواز اور معقولیت کھو بیٹھتی ہے۔ اس کو زیادہ بلند منزل کے لئے اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے اور یہ

بھی اپنی باری آنے پر فرسودہ ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔۔۔جدلیاتی فلسفہ مختتم (Marginal) اور مطلق سچائی کے تمام نظریات اور اس سے مطابقت رکھنے والی انسانیت کی ساری مطلق حالتوں کے تصورات کو ختم کر دیتا ہے۔ جدلیاتی فلسفے کے لئے کچھ بھی مختتم، قطعی اور مقدس نہیں۔ وہ ہر چیز میں اور ہر چیز پر لازمی زوال کی چھاپ دیکھتا ہے۔ ہستی اور نیستی کے متواتر اور نیچے سے اوپر کی طرف بلند ہونے کے لامحدود عمل کے سوا اور کوئی چیز اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ اور خود جدلیاتی فلسفہ سوچنے والے دماغ میں اس عمل کے عکس کے سوا اور کچھ نہیں۔''

مذکورہ بالا بنیادوں پر لکھی جانے والی یہ کتاب چین کی تاریخ کو جاننے اور اس کے مستقبل کا تناظر تخلیق کرنے کے لیے تمام قارئین کے علم میں یقیناً اضافہ کرے گی اور دنیا بھر کے محنت کشوں کو یکجا کرتے ہوئے پاکستان، ایشیا اور عالمی سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد میں لازماً اپنا کردار ادا کرے گی۔

آدم پال

لاہور، 25 فروری 2015ء

پیش لفظ

اکیسویں صدی کے پہلے ڈیڑھ عشرے میں عالمی طور پر جتنا چین کی ''ترقی'' اور ''معجزے'' کے بارے میں شور کیا جا رہا ہے اتنا اس سے قبل شاید ہی کسی اور ملک کے بارے میں کیا گیا ہو۔ چین کی معاشی ترقی، شرحِ نمو، سفارتی طاقت، فوجی عزائم اور قوت اور کسی حد تک سماجی صورتحال ذرائع ابلاغ، اخبارات اور عام بحثوں میں شاید سب سے زیادہ گفتگو کا موضوع ہیں۔ لیکن اگر ہم کچھ گہرائی میں جا کر اس ''معجزے'' کا مطالعہ کریں تو ہمیں صورتحال کی چمک کافی ماند پڑتی ہوئی محسوس ہوگی۔ گو چین میں ترقی کا معیار ہندوستان کی نسبت کہیں زیادہ ٹھوس اور دوررس ہے لیکن جس طرح ''شائننگ انڈیا'' کے شعلے کی چمک تیزی سے بجھی اسی طرح چین کے اس شعلے کی چمک اور روشنی باہر کچھ زیادہ اور اندر کم ہے اور یہاں کے باسیوں کی اکثریت کے لئے اندھیرے کچھ زیادہ ہی سایہ فگن ہیں۔ عالمی سرمایہ دارانہ ماہرین اور ان کے جرائد کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ چین میں سرمایہ داری کی دوبارہ استواری ان عالمی سرمایہ دارانہ سیٹھوں کے لیے سوویت یونین میں ''سوشلزم کے خاتمے'' سے بھی زیادہ باعثِ مسرت ہے۔ اگرچہ زیادہ سخت گیر سامراجی تجزیہ نگار اور ناقدین چین کے حکمرانوں پر ''جمہوری حقوق''، ''انسانی حقوق'' اور ''مزید آزادیوں'' کے ایشوز پر ایک مخصوص تنقید کرتے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد چین کے محنت کش عوام کی زندگیوں کو سہل بنانے اور انکے حقوق کے حصول کی کاوش نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد سامراجی اجارہ داریوں اور سرمایہ دارانہ استحصال کو زیادہ مواقع فراہم کرنے کے لیے منڈی کو مزید آزاد کرنے اور معیشت سے ریاست کے کردار کو مزید کم کرتے جانا ہے تاکہ یہ گدھ زیادہ منافع خوری کر سکیں۔ چینی افسر شاہی جو اس وقت کافی حد تک ایک حکمران سرمایہ دارانہ طبقے میں منتقل ہو چکی ہے اپنی ریاستی گرفت

کے ذریعے معیشت پر اپنی ملکیت اور قبضے سے حاصل کردہ دولت اور مراعات کے تحفظ کے لیے ''پارٹی'' کی آمریت کو قائم رکھتے ہوئے عالمی اجارہ داریوں کی سرمایہ کاری کے تحت چین کی شرح نمو کو جاری رکھنے کی حامی ہے۔ کیونکہ اسی میں اس اشرافیہ کے مفادات کا تحفظ اور دولت کے اجتماع کا راز پنہاں ہے۔ دوسری جانب چین میں تیزی سے جو صنعتی ترقی ہوئی ہے وہ زیادہ تر مخصوص ''زونوں'' یا علاقوں تک محدود ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں چین کے دور دراز علاقوں میں جو دیوہیکل پراجیکٹ شروع کیے گئے ہیں ان میں تبت تک دنیا کی سب سے اونچی ریلوے لائن اور بے پناہ غیر ضروری ڈیموں اور ہاؤسنگ کے منصوبوں کی تعمیر شامل ہے۔ اس کا مقصد ان علاقوں کو ترقی دینا نہیں بلکہ بحران کی شدت کو کم کرنے کے لیے ریاستی سرمایہ کاری کے ذریعے شرح نمو کی سطح کو قائم رکھنا یا اس میں اضافہ کرنا تھا۔ لیکن سرمایہ دارانہ استواری جو چین کی ''کمیونسٹ پارٹی'' کے سرمایہ دارانہ رجحانات کے حامل لیڈر ڈینگ ژیاؤپنگ نے ماؤزے تنگ اور چواین لائی کی وفات کے بعد 1978ء میں شروع کی اس کی رفتار، پھیلاؤ اور مستفید ہونے کی تمام کیفیات انتہائی ناہموار اور سماجی طور پر متضاد نوعیت کی رہی ہیں۔ اب یہ کھل کر واضح ہو چکا ہے کہ ''کمیونسٹ پارٹی'' نہ تو کمیونسٹ ہے اور نہ ہی کوئی پارٹی بلکہ ایک رجعتی اشرافیہ ہے جس کا مقصد جونکوں کی طرح چین کے محنت کشوں کا خون چوسنا ہے۔

سامراجی ماہرین اور پالیسی سازوں اور چینی اشرافیہ کے معیشت دانوں کے درمیان تضادات سرمایہ دارانہ نظام کے داخلی اور باہمی طریقہ کار اور لائحہ عمل کے رہے ہیں، بنیادی سسٹم کو چیلنج کرنے کے لیے نہیں۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود اگر ہم سامراج کا عمومی رویہ جانچنے کی کوشش کریں تو یہ محسوس ہوگا کہ نہ صرف وہ اس سے بہت خوش ہیں بلکہ چین کو وہ سرمایہ دارانہ نظام کی سربلندی اور برتری کی مثال بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ چین میں سرمایہ داری کی استواری سے ''لاکھوں کے غربت کی گہرائی سے نکالے جانے'' کا بہت شور کرتے ہیں اور بار بار اس کا ذکر دہراتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان کروڑوں کا میڈیا میں ذکر کم ہی ہوتا ہے جو اس استواری سے غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنستے چلے گئے ہیں۔ یہ ٹھوس اور ہولناک حقیقت کم ہی سننے یا پڑھنے کو ملتی ہے کہ اس وقت اس سرمایہ دارانہ استواری، ترقی اور معجزے میں جنوبی افریقہ کے بعد دنیا میں امارت اور غربت کی سب سے بڑی خلیج چین میں پیدا ہو چکی ہے جو بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ فلپائن اور پیرو جیسے غریب ممالک میں بھی امارت اور غربت کی خلیج چین سے کم ہے۔

2008ء میں عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے حالیہ تاریخ میں بدترین کریش اور زوال کے بعد بیشتر سامراجی معیشت دانوں کی علمیت، مہارت، تناظر اور تجزیے بھی چکناچور اور بڑے بڑے نوبل انعام یافتہ معیشت دانوں کے سرمایہ داری نظام کے عروج وزوال کے سائیکل کے خاتمے اور بحرانوں کے اختتام کے دعوے سرِ عام ذلیل ورسوا ہوئے۔ جہاں نسبتاً کچھ سنجیدہ معاشی ماہرین نے مارکس کے اقتصادی اور معاشی تجزیوں کی صداقت کو تسلیم کیا وہاں ان سرمایہ داری کے سرخیل ماہرین کی اکثریت نے ایک نیا تناظر پیش کیا کہ چین میں شرح نمو میں اضافے کے جاری رہنے سے سرمایہ دارانہ نظام دوبارہ بحال ہوگا اور بحرانوں سے جلد نکل جائے گا۔ چین کے ساتھ انہوں نے 4 بڑی ابھرتی ہوئی (ایمرجنگ) معیشتوں کو بھی اس بحران کے خاتمے اور عالمی سرمایہ داری کی بحالی اور ترقی کا ذریعہ گردانا تھا۔ ان ممالک کو ''برکس'' کا نام دیا گیا تھا۔ ان میں برازیل، روس، ہندوستان، چین اور جنوبی افریقہ شامل تھے۔ اگر ہم اس کے پانچ یا چھ سال بعد کے عرصے کا جائزہ لیں تو ان میں سے کوئی بھی ایسا ملک نہیں جس کی شرح نمو میں بڑی گراوٹ نہ آئی ہو بلکہ یہ ممالک شدید سماجی اور معاشی ابتری اور انتشار کا شکار ہیں۔ نہ صرف داخلی طور پر ان ممالک میں غربت اور محرومی میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ شرح نمو دھڑام سے بہت نیچے گر گئی ہے اور خارجی طور پر بھی یہ ممالک نئے تضادات، شورشوں اور تصادموں کو جنم دے رہے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت ان ممالک میں غیر ہموار اور متضاد طرز کی سرمایہ داری کے بحران کی شدت اور تضادات کے پھٹ پڑنے سے رونما ہوا ہے۔ روس کی شرح نمو 6.7 فیصد سے منفی اعداد میں غرق ہوگئی ہے۔ روس جس کو وہ سرمایہ داری کے احیا کا ایک آلہ کار سمجھ رہے تھے، سوویت یونین کے ٹوٹنے اور سرمایہ داری کی استواری سے مغربی سامراج کے لیے روس اور مشرقی یورپ میں اتنی بڑی منڈی کے حصول پر جشن منا رہے تھے، آج وہی روس ان کے لیے وبال جان بن گیا ہے۔ روس میں پیوٹن کی سربراہی میں جس مافیائی سرمایہ داری کے مجرمانہ نیٹ ورک نے گرفت حاصل کی ہے وہ اس قدر متحارب قوت بن گیا ہے کہ یوکرائن سے لے کر ایران اور مشرقِ وسطیٰ میں سامراج کے گلے میں ایک کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔ سفارت کاری سے لے کر پراکسی جنگوں تک منڈیوں اور وسائل کی لوٹ کی لڑائی میں روسی مافیائی اشرافیہ مغربی سامراجیوں کے لیے وبالِ جان بن گئی ہے۔ اس تبدیلی یا مفروضے کو کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے 1992ء میں واضح تناظر کی شکل میں پیش کر دیا تھا کہ آج یہ سامراجی حکمران جس سوویت یونین کے ٹوٹنے کا جشن منا رہے ہیں وہاں

کبھی بھی صحت مند سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں ہو سکے گا بلکہ وہاں اس سرمایہ داری کے تاریخی زوال کے عہد میں ایک مجرمانہ کرپٹ اور مافیا طرز کی سرمایہ داری جنم لے گی جو ان سامراجیوں کے لیے سٹالنزم سے بھی زیادہ تکلیف دہ بن جائے گی۔ آج روس اور پیوٹن کے خلاف سامراجی میڈیا اور حکمرانوں کی چیخ وپکار شفاف وضاحت کے ساتھ کامریڈ ٹیڈ گرانٹ کے اس تناظر کی سچائی کو ثابت کر رہی ہے۔ اب یہ تنازعات کم یا حل ہونے والے نہیں، بلکہ یہ مزید شدت اختیار کریں گے اور عالمی طور پر بے چینی اور عدمِ استحکام کو مزید پرانتشار کریں گے۔ حتیٰ کہ خونریز اور زیادہ تباہ کن شکلیں بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ برازیل میں بھی شرح نمو 1.8 فیصد تک گر گئی ہے وہاں داخلی بحران بھی شدت اختیار کر رہا ہے اور خارجی طور پر بھی برازیل کے حکمران امریکی سامراج کے لیے ماضی کے اس اہم حمایتی خطے لاطینی امریکہ میں مزاحمت اور مخاصمت کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ پالیسیاں بھی برازیل کے موجودہ اصلاح پسند لیڈروں کی ضرورت ہیں کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کا بحران جس داخلی مزاحمت کو ابھارتا ہے اسے زائل کرنے کے لیے ان حکمرانوں کو نیم امریکی مخالفت کا ناٹک کرنا پڑتا ہے۔ لاطینی امریکہ میں بائیں بازو کی لہر جو شاویز کے 1998ء میں وینزویلا کے صدر بننے کے بعد پھٹ کر سطح پر نمودار ہوگئی تھی وہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی اور ایک کے بعد دوسرے ملک میں مزدوروں کی تحریکوں، بائیں بازو کے مختلف رجحانات کا پھیلاؤ اور سوشلسٹ کہلوانے والے لیڈروں اور حکومتوں کا منتخب ہونا ایک معمول بن کر رہ گیا ہے۔ ہندوستان میں کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کی سیکولرازم، آئین اور جمہوریت کے نام پر انتخابی مہمات اور سرمایہ دارانہ پالیسیوں کی عبرتناک شکست ہوئی ہے۔ مودی نے امیر اور غریب کا جعلی ناٹک اور انفرادی اور شخصی مثالوں کے ساتھ ایک فریبی ترقی کا جھانسہ دے کر ہندو بنیاد پرستی کی حکومت مسلط کر دی ہے۔ اس میں ہندوستان کی شرح نمو کا 10 فیصد سے گر کر 4.4 فیصد تک پہنچ جانا بھی اہم عنصر تھا کیونکہ درمیانہ طبقہ جس کا گزارہ اس پھیلاؤ کی وجہ سے کسی حد تک بہتر ہو رہا تھا اس کی جھنجلاہٹ میں مزید اضافہ ہوا اور وہ مذہبی جنون اور مودی کے جعلی پاپولرازم کا شکار ہو گیا۔ مودی کی تمام تر ڈرامہ بازی کے باوجود ہندوستان میں بھی دوبارہ 10 فیصد کی شرح نمو کا حصول ناممکنات میں شامل ہے۔ لیکن لمبے عرصے تک مودی کی یہ شعبدہ بازیاں اور ہندو رجعتیت کا تسلط چل نہیں سکے گا۔ ترقی کی شرح میں اضافہ اور تیزی نہ آنے سے درمیانے طبقے کی وہی پرتیں جن پر بی جے پی کا انحصار ہے اپنے الٹ میں تبدیل ہو کر اس حکومت کو ایک بڑے

بحران اور انتشار میں مبتلا کرسکتی ہیں جس سے داخلی اور خارجی محاذوں پر یہ ہندو بنیاد پرست نیولبرل سرمایہ دارانہ حکومت راست اقدامات پر اتر سکتی ہے جس سے صورتحال سنگین ہو جائے گی اور پورا خطہ بڑی تباہ کاریوں کا شکار ہوسکتا ہے۔اس میں چین کے ساتھ سرحدی تنازعے کو بھڑکا کر مودی سرکار قومی شاونزم کے ذریعے اپنی تنزلی کو روکنے کا ذریعہ بنانے کی کوشش بھی کرسکتی ہے۔لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہندوستان کا پرولتاریہ جواب تک نسبتاً جمود کی کیفیت میں بکھرا ہوا ہے وہ کسی نئی بغاوت اور تحریک میں ابھر کر پورے تناظر کو کاٹ کر مثبت حالات کی جانب سماجی دھارے کا رخ بھی موڑ سکتا ہے۔مودی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ وہ پورے سرمایہ دارانہ نظام کو بھی چیلنج کردے گا۔جنوبی افریقہ کی صورتحال بھی مختلف نہیں رہی۔نہ صرف اس کی شرح نمو میں ایک بڑی گراوٹ واقع ہوئی ہے بلکہ داخلی طور پر اے این سی حکومت نے سفید فام اقلیتی آمریت کی طرز کا ہی جبر جنوبی افریقہ کے محنت کشوں پر روا رکھا ہوا ہے۔دوسری جانب جہاں افریقہ کے دوسرے ممالک کی شرح نمو میں چاہے مصنوعی طور پر ہی سہی مگر اضافہ ہو رہا ہے وہاں جنوبی افریقہ غیر مساوی اور ناہموار بنیادوں پر بھی یہ معاشی ترقی حاصل کرنے سے معذور ہوگیا ہے۔اس کی شرح نمو انہدام کا شکار ہے اور بیروزگاری کا سمندر ہے کہ پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

لیکن برکس کے ان تمام ممالک میں عالمی سرمایہ داری کے لیے سب سے اہم ملک چین ہی تھا اور ہے۔ 2008ء کے کریش سے پیشتر تقریباً دو دہائیوں تک عالمی سرمایہ داری کا بحرانوں سے نکلنے اور پیداوار میں اضافے کے عمل میں چین کا فیصلہ کن کردار رہا ہے۔چین میں ابتدائی سالوں میں مغربی اجارہ داریوں کی سرمایہ کاری کی بنیاد درحقیقت چین کی سستی مگر اس سے بھی اہم ہنرمند محنت کش طبقے کے استحصال پر مبنی تھی۔ایک طرف چین دنیا کی دوسری سب سے بڑی معیشت بن گیا تو دوسری طرف چین عالمی طور پر پیداواری انجن کے کردار کا حامل بھی ہوگیا تھا۔بڑے پیمانے پر سامراجی صنعت کاری سے حاصل کردہ منافعوں سے جہاں عالمی سرمایہ داری شرح منافع کے بحران سے بار بار نکلتی رہی وہاں تاریخ کا المیہ یہ تھا کہ چین میں 1949ء کے انقلاب کے بعد منڈی کی معیشت کے خاتمے اور منصوبہ بند معیشت کے اجراء سے ہونے والی حاصلات میں بڑے پیمانے پر چین میں ایک ہنرمند، کسی حد تک تعلیم و تربیت یافتہ اور ووکیشنل ٹریننگ سے مرصع مزدور طبقہ تشکیل پایا تھا۔چین میں سرمایہ دارانہ ردِانقلاب کے بعد چین کی سٹالنسٹ افسر شاہی خود اشرافیہ میں تبدیل ہوگئی اور منڈی کی معیشت کو فروغ دینے کے لئے منصوبہ بند معیشت کے ان ثمرات کو

چینی اور عالمی طبقات کی منافع خوری اور دولت کے اجتماع کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ لیکن اس جدید صنعت اور ٹیکنالوجی کی آمد اور وسعت اختیار کرنے سے چین کے محنت کش طبقے کا نہ صرف حجم بڑھنے لگا بلکہ اسکی شعوری سماجی اور پرولتاری طاقت میں بھی اضافہ ہونے لگ گیا تھا۔ جس سے بتدریج اس عمل کو جاری رکھنے اور سرمایہ کاری کی صنعت کو چلانے کے لیے اس پرولتاریہ کی اجرتوں میں مسلسل اضافہ کرنا پڑ گیا تھا۔ محنت کش طبقہ چاہے براہِ راست اس نظام کو اکھاڑ پھینکنے والے عمل میں داخل نہ بھی ہو لیکن اسکی ٹیکنیکی طاقت اور ضرورت صنعت کاروں پر ایک مسلسل دباؤ ڈالتی رہی ہے جس کی بنا پر اجرتوں میں بتدریج اضافہ اس عمل کو کسی حد تک کسی خلل اور ہلچل سے بچانے کے لیے اس عمل کا ناگزیر حصہ بننا شروع ہو گئے۔

اس عمل میں اتنی طویل اور بھاری صنعتی پیداوار کی سرمایہ کاری سے امریکہ یورپ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ملکوں اور خطوں میں صنعتی شعبہ تنزلی کا شکار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مغرب میں سرمایہ داروں نے پیداواری شعبے کی بجائے زیادہ کاروبار مالیاتی اور سروسز کے شعبوں میں کرنا شروع کر دیا۔ لیکن پھر اس مالیاتی کاروبار میں بینکوں کے قرضے، سٹاک مارکیٹ میں سٹہ بازی، جوا اور دوسرے سودی کھلواڑ اتنے بڑھے کے مالیاتی نظام پھٹ گیا جو ہمیں 2008ء کے کریش کی صورت میں ملتا ہے۔ مغربی منڈیوں کے اس زوال میں سکڑنے سے چین میں ہونے والی صنعتی پیداوار کی کھپت گرنے لگی۔ چین میں داخلی منڈی اتنی بڑی نہیں تھی کہ وہ اس کھپت کو اپنے اندر سموسکتی۔ یہاں سے چین کی معیشت پر بوجھ بڑھنے لگا۔ تمام بڑی یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے معیشت کے ماہرین کا یہ خیال کہ چین اور برکس کے دیگر ممالک اس بحران سے سنبھالا دیں گے محض ایک خود فریبی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چینی معیشت کی صورتِ حال ان کی معاشی جاہلیت کی عکاسی کر رہی تھی۔ چین کی ان درآمدات میں یورپ اور امریکہ کی منڈیوں کے سکڑنے سے کمی براہِ راست پیداوار کو کم کرنے اور صنعتوں کو بند کر کے بیروزگاری میں اضافے کے عمل کا دباؤ پیدا کرنے لگی ہے۔ چین میں شرح نمو میں گراوٹ 14 فیصد سے 7 فیصد تک آن پہنچی ہے۔ چین کی آبادی اور سماجی بحران کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو چین کے معاشرتی ارتقا کی سست ترین رفتار کو بھی برقرار رکھنے کے لیے یہ شرح بمشکل پوری ہوتی ہے۔ اس سے بڑی گراوٹ سے چین میں سماجی دھماکہ ہو سکتا ہے کیونکہ چین میں درمیانے طبقے کے پیدا ہونے اور اسکے وسعت اختیار کر جانے کا عمل تقریباً رک سا گیا ہے لیکن یہ درمیانہ طبقہ اس مقام اور حجم میں اس شرح نمو سے برقرار بھی

نہیں رہ سکتا۔ چین میں جو کروڑوں کی آبادی انتہائی غربت کا شکار ہے اسکے سامنے درمیانے طبقے میں جانے کا یہ امکان اور امیدیں بھی ختم ہو رہی ہیں لیکن شرح نمو کے مزید گرنے سے یہ تضادات اگر پھٹتے ہیں تو چین میں ایسا انتشار ہوگا کہ جو نہ صرف عالمی سرمایہ داری کی معیشت کو ہلا کر رکھ دے گا بلکہ اس سے کئی خوفناک سیاسی اور سماجی مضمرات بھی سامنے آئیں گے۔ جس سے چین کی حکمران اشرافیہ کے اقتدار اور مراعات کو شدید خطرہ لاحق ہوگا۔ شرح نمو کے مزید کم ہونے کے محض امکانات ہی نہیں بلکہ یہ دنیا کے اہم ترین سامراجی ادارے آئی ایم ایف کی سنجیدہ پیش گوئی ہے۔ آئی ایم ایف کے مطابق 2014ء کی شرح نمو 7.4 فیصد سے گر کر یہ شرح نمو 2016ء میں 6.8 فیصد ہو جائے گی۔ جبکہ 2019ء میں یہ مزید گر کر 6.3 فیصد تک جا پہنچے گی۔ حکمرانوں کے پالیسی ساز ماہرین اور ادارے سخت گھبراہٹ کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین کی حکومت بے دریغ قرضے لے کر بڑے بڑے پراجیکٹ ریاستی سرمایہ کاری سے جاری کیے ہوئے ہے۔ اس کا مقصد اس معاشی دھارے کو چلائے رکھنا ہے تاکہ شرح نمو زیادہ تیزی سے نہ گر سکے اور اس میں اضافے کی کاوش بھی کی جائے۔ اس عرصے میں اب تک چینی حکومت نے سرکاری طور پر 157 ارب ڈالر کے پراجیکٹوں پر کام شروع کر رکھا ہے۔ لیکن یہ براہِ راست سرمایہ کاری اور بلاواسطہ سرکاری و نجی سرمایہ کاری زیادہ سے زیادہ قرضے لے کر ایک بلبلے کی طرح معیشت کو پھیلا رہی ہے۔ 2008ء میں مختلف سرکاری بینکوں نے 9000 ارب ڈالر کے ناقص قرضے دیئے جبکہ ''ایشیا ریسرچ'' کی ماہر معاشیات چارلین لیو کے مطابق 2014ء دسمبر تک ان ناقص قرضوں کی مقدار 28000 ارب ڈالر ہو چکی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کے بینک UBS نے اس عدد کی تصدیق کی ہے۔ لیکن شرح نمو میں گراوٹ کا سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ چین میں کروڑوں بیروزگاروں کے اس بحر میں ایک بڑے حجم کے اضافے سے بے روزگاری کا یہ ٹائم بم کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے جو چین کے پورے سماج میں ایک بھونچال برپا کر دے گا۔ 2010ء میں چین میں رجسٹرڈ بیروزگاروں کی تعداد 15 کروڑ تھی جبکہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اب یہ تعداد بڑھ کر 20 کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن ان میں وہ کروڑوں بیروزگار شامل نہیں ہیں جو روٹی روزی کی تلاش میں دیہاتوں سے شہروں کو ہجرت کرنے پر مجبور ہیں۔ دیہی علاقے میں کام کرنے والی آبادی 57 فیصد سے کم ہو کر 39 فیصد رہ گئی ہے۔ لیکن یہ نسخہ بھی بیماری کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہو رہا۔ چین کی معیشت اور شرح نمو میں اضافے کے لیے ریاستی سرمایہ اتنا زیادہ انڈیلا گیا

ہے کہ اس سے چینی معیشت اب ''امیون'' (بے اثر) ہوگئی ہے۔ جیسے کوئی جسم یا بیماری انٹی بایوٹک لے لے کر اس نہج پر پہنچ جاتی ہے کہ اس پر دوائی اپنا اثر کرنا چھوڑ دیتی ہو۔

اس وقت چین کی ریاست ایک بہت بڑے قرضے اور ادھار کے غبارے پر کھڑی ہے اور اس کو مزید پھیلایا جا رہا ہے۔ لیکن اس قرضے سے ہونے والی سرمایہ کاری کے 4 ڈالر سے اتنی ترقی کا اضافہ ہوتا ہے جتنا آج سے 10 سال قبل صرف ایک ڈالر کی ریاستی سرمایہ کاری سے ہوا کرتا تھا۔ چین اور ''برکس'' ممالک پر عالمی سرمایہ دارانہ ماہرین معیشت کا انحصار ان ممالک کی موجودہ معاشی و اقتصادی صورتحال میں مضحکہ خیز ہو گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو نظام گل سڑ گیا ہو، تاریخی اور معاشی طور پر استرداد کا شکار ہو اس نظامِ معیشت کے ماہرین بھی کس قدر کج فہم اور جاہل بن جاتے ہیں۔ ان کو اتنا اندازہ تک نہیں ہوا کہ دنیا کے 68 فیصد GDP رکھنے والے امریکہ، یورپ اور جاپان میں ہونے والے سرمایہ داری کے زوال کو چین اور دوسرے برکس ممالک بھلا کیسے زائل کر سکتے تھے۔ امریکہ، یورپ اور جاپان میں مسلسل زوال مختلف درجوں میں جاری ہے جبکہ اب چین کے بارے میں عالمی حکمران طبقات اور چین کی سرمایہ دارانہ اشرافیہ کو چین کی صورتحال کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا ہے جس سے وہ ششدر ہو کر عجیب و غریب معاشی ہتھکنڈے اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آج سے نصف صدی پیشتر مغربی سامراجی میڈیا کسی ایسی خبر یا گڑبڑ کی تلاش میں رہتا تھا جس سے وہ منصوبہ بندی پر مبنی چین پر کوئی پراپیگنڈے کا وار کر سکے اور اس طرزِ معیشت کو مغربی اور باقی دنیا کے محنت کشوں اور نوجوانوں کی آنکھوں میں رسوا اور بدنام کر سکے۔ آج صورتحال اس کے بالکل الٹ ہو کر رہ گئی ہے۔

لیکن اب بڑے ذرائع ابلاغ کی کمپنیوں اور نشریاتی اداروں کی کوشش ہوتی ہے کہ مزدوروں کی ہڑتالوں اور طبقاتی تحریکوں کو دبایا جائے اور مذہبی رجحانات اور درمیانے طبقے کی نان ایشو کے گرد چھوٹے چھوٹے ہم جنسی تعلقات وغیرہ کے پرچار کرنے والے مختلف النوع گروہوں کی سرگرمیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ اگر چین میں مزدوروں اور کسانوں کی ہڑتالوں یا تحریکوں کی کوئی خبر سامراجی میڈیا دیتا بھی ہے تو وہ بھی سوشل میڈیا میں ایسی خبروں کے گردش کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پھر ان کو ایسے انداز اور طریقہ کار سے پیش کیا جاتا ہے جس سے ان کا معاشی بنیادوں اور نظام کی خرابیوں سے تعلق محسوس نہ ہوتا ہو۔ فوکس کون (Fox Con) اور دوسرے جدید صنعتی اور تیکنیکی اداروں کے ہراول مزدور دستوں کی ہڑتالوں کو بہت تاخیر سے پیش

کیا گیا۔ پھر میڈیا پر عمومی طور پر چینی ''کمیونسٹ پارٹی'' کے زیادہ سرمایہ دار اور سامراج نواز دھڑوں اور اصلاح پسند سرمایہ دار دھڑوں کے باہمی تنازعات کو دکھایا جاتا ہے۔ چین میں چونکہ کسی دوسری پارٹی کا وجود ہی نہیں اس لیے چین کا حکمران طبقہ اور اس کے تمام دھڑے اپنی منافع خوری کے لیے اسی پارٹی کو سیاسی اور ریاستی طاقت کے حصول کا آلہ کار بنائے ہوئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بہت حد تک یہ ''کمیونسٹ پارٹی'' درحقیقت اشرافیہ کی گرفت میں اسی نئے نومولود حکمران طبقے کی پارٹی بن چکی ہے۔ اس لیے یہ توقع کرنا کہ اس پارٹی کا کوئی بالادست دھڑا انقلابی سوشلزم کا راستہ اختیار کرسکتا ہے محض خودفریبی ہی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں انقلابی مارکسزم کی قوتوں کی تعمیر کے لیے اس پارٹی میں کوئی راستہ نکالنا ایک مخدوش تنظیمی تناظر ہے۔ عموماً یہاں بے پناہ بدعنوانی کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے جبکہ چین میں بدعنوانی اس نظام اور موضوعی جزو کا ایک ناگزیر حصہ ہے جو اس وقت رائج ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ اس میڈیا مہم میں چین کے حکمران طبقات کے ان حصوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے جو صرف شرح نمو میں اضافے پر مبنی پالیسیوں سے جنم لینے والی سماجی محرومی سے ابھرنے والی کسی عوامی بغاوت سے خوف زدہ ہیں۔ جبکہ اس وقت حاوی دھڑا بے دریغ جارحانہ سرمایہ دارانہ پالیسیوں پر گامزن ہے جو دولت کے اجتماع میں اتنا اندھا اور اسکے نشے میں اتنا دھت ہو چکا ہے کہ ان کو یہ پرواہ ہی ختم ہو چکی ہے کہ اس ظالمانہ معاشی واقتصادی جارحیت کی پالیسیوں کا انکے لیے کس قدر بھیانک انجام ہوسکتا ہے۔ چین کے نئے صدر ''شی جن پنگ'' نے اپنی گرفت کو سخت مضبوط کیا ہے۔ 1990ء کی دہائی میں اس وقت کے چینی وزیراعظم ''یورانگ یی'' نے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) میں شمولیت کے لیے چین کی سرکاری صنعت کی دیوہیکل کمپنیوں میں بڑے پیمانے پر پیداواری ڈھانچے تبدیل کیے تھے۔ انتہائی بڑے پیمانے پر ان صنعتوں کے مزدوروں کی برطرفیاں ہوئی تھیں۔ اب سرمایہ داری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے صدر شی زیادہ جارحانہ پالیسیاں لاگو کرنے کے درپے ہے۔ اس غرض سے اس نے اپنی ذاتی آمرانہ جکڑ مزید شدید کردی ہے۔ تمام سامراجی اور چینی ذرائع ابلاغ ''شی'' کی شخصیت کو بہت زیادہ اچھال کر اس کا شخصی تسلط زیادہ شدت سے چین کے معاشرے پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق صدر شی ماؤ کے طریقہ کار اور جبر کے ذریعے دوسرا ڈینگ ژیاؤ پنگ بننا چاہتا ہے۔ اس لئے جہاں وہ حد سے زیادہ کرپشن میں ملوث سرکاری اعلیٰ افسران (جن کی بدعنوانی سے

پوری سرمایہ دارانہ معیشت کو دھچکا لگ رہا ہے) کے خلاف سخت کاروائیوں کا انتباہ کر رہا ہے وہاں وہ انتہائی بے رحمی سے جارحانہ سرمایہ دارانہ پالیسیاں لاگو کر کے حکمرانوں اور سامراجیوں کے منافعوں میں بے پناہ منافع پیدا کروانا چاہتا ہے اور سرمایہ داری کی اس سلگتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے چین کے پرولتاریہ کو مزید کچلنا چاہتا ہے۔ کیونکہ آج سے 36 سال پیشتر ڈینگ ژیاؤ پنگ نے سرمایہ دارانہ استواری کے لیے جو اقدامات کیے تھے آج ان سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے اور سخت گیر اقدامات کرنے کی چینی سرمایہ داری کو ضرورت ہے۔ لیکن یہ اقدامات معاشی اعتبار سے نہ صرف سیدھے سادے نہیں ہیں بلکہ اقتصادی لحاظ سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور گھمبیر بھی ہیں۔ چین کے محنت کشوں کو تمام سرمایہ دار ماہرین کسی بہت بڑی آفت کے لیے صبر آزما ہونے کی تلقین کرتے ملتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ پہلے سے ہی شدید سماجی بحران کی کیفیت میں کیا جا رہا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق چین کے 50 کروڑ باسی انتہائی غربت کی حالت میں رہ رہے ہیں۔ ان میں ایسے اقدامات سے مزید اضافہ ہی ہوگا۔ ویسے تو چین دنیا کی دوسری سب سے بڑی معیشت ہے۔ لیکن امارت کے حوالے سے چین ''گلوبل فنانس ریسرچ'' کے میگزین کے مطابق 90 ویں نمبر پر آتا ہے۔ امریکہ 7 ویں پر اور پاکستان 138 ویں نمبر پر آتا ہے۔ لیکن عام انسانوں کے ساتھ یہ اعداد و شمار بھی انصاف نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ فی کس آمدن کا معیار پوری آبادی پر پورے ملک کی دولت یا جی ڈی پی کو تقسیم کر کے متعین کیا جاتا ہے۔ جب ملکوں میں امارت اور غربت کی اتنی بڑی خلیج ہو تو اس سے محض غربت کی شرح اور مقدار چھپانا ہی مقصود ہوتا ہے۔ اس وقت امریکہ میں فی کس آمدن 51 ہزار 298 ڈالر ہے جبکہ چین میں صرف 11 ہزار 850 ڈالر ہے۔ پاکستان میں فی کس آمدن اس طریقہ کار سے 2 ہزار 969 ڈالر بنتی ہے۔ چین میں سرمایہ دارانہ بحالی سے پیدا ہونے والا امارت اور غربت کا فرق ہولناک شدت اختیار کر گیا ہے 1976ء میں منصوبہ بند معیشت کے دوران یہ فرق ایک اور سولہ (1-16) کا تھا، سرمایہ داری کی استواری کے بعد 2012ء تک یہ فرق 1 اور 474 کا ہو گیا۔ جس میں مزید اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

جہاں تک چین کا دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن جانے کا سوال ہے اور اس کا بہت چرچا ہے تو یہ بھی تاریخی اعتبار سے ایک بہت ہی کم وقتی اور مصنوعی عمل ہے۔ تقریباً 10 سال قبل جب چین نے WTO میں شمولیت اختیار کی تو اس کرۂ ارض کی ہر کارپوریٹ اجارہ داری نے چین کا

رخ کیا اور یہ سامراجی کارٹیلوں کی آماجگاہ بن گیا۔ چین اس تاریخی طور پر قلیل عرصے میں دنیا میں کاروں کی سب سے بڑی منڈی بن گیا۔ اس طرح اس ناہموار ترقی سے جہاں طبقاتی اور علاقائی تفریق اتنی شدید ہے وہاں کروڑوں پر مبنی ایک درمیانہ طبقہ بھی پیدا ہوا اور چین تیل، لوہے، تانبے، صابن، شیمپو، سمارٹ فون، ٹوتھ پیسٹ اور استعمال کی دوسری اشیا کے لیے تیزی سے کھپت کی ایک منڈی بھی بن گیا۔ اگر تین دہائیوں کی معاشی پیداوار کی تیزی کو 1.3 ارب ڈالر کی منڈی پر تقسیم کریں تو یہ پیداوار، یہاں کی کھپت اور ظاہری عالیشان ترقی کوئی غیر معمولی یا مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ شرح نمو اور پیداوار کی ترقی میں کمی ہو رہی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ چین کے بارے میں ابہام اور اس کی ترقی کے جاری رہنے پر شکوک سرمایہ دارانہ معیشت دانوں میں بھی تیزی سے گردش کر رہے ہیں۔

چین کے دنیا کی دوسری سب سے بڑی معیشت کے طور پر قائم رہنے پر سوالیہ نشان لگ رہے ہیں۔ چین سے کچھ عرصہ پہلے ہی جاپان 80-1960ء کی دہائیوں میں تیزی سے ابھر کر دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن گیا تھا۔ اس کے پہلے سالوں میں جاپان میں بھی 14-13 فیصد شرح نمو (پیداوار) ہوئی تھی جس سے وہ اس مقام پر پہنچا تھا۔ لیکن 1990ء کے قریب آن کر جاپان گرنے لگا اور پھر اس کا معاشی معجزہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ آج 25 سال بعد بھی جاپان اس انہدام سے دوبارہ ابھر کر کھڑا نہیں ہو سکا۔ اس کی شرح نمو اب بھی منفی اعداد میں ہے۔ چین اور جاپان کی اس عارضی ترقی کے عمل میں بہت سی مماثلتیں ملتی ہیں۔ دونوں ممالک میں سرمایہ کاری کا حجم کھپت سے حاصل کردہ سرمائے سے کہیں زیادہ رہا۔ 2013ء میں چین میں جامد اثاثے اور انفراسٹرکچر جی ڈی پی کا 45 فیصد تھے جبکہ عام گھریلو اصراف اور کھپت 36 فیصد رہی۔ چین میں سرمایہ داری کو کامیاب بنانے کے لیے ان کو الٹا کرنا لازمی ہے۔ لیکن گرتی ہوئی شرح نمو کو بحال کرنے کے لیے ریاستی سرمایہ کاری کم ہونے کی بجائے زیادہ سے زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ جاپان میں بھی چین کی طرح تعمیرات کے شعبے میں سرمایہ کاری کے پھیلتے ہوئے بلبلے کو کم کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ لیکن معیشت کی موجودہ سست روی سے اس شعبے میں گراوٹ سے معیشت میں سرمائے کا بہاؤ گر رہا ہے جس سے دوسرے شعبوں میں بھی مندی آنا شروع ہو گئی ہے۔ لیکن چین میں یہ شاید اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ یہاں زیادہ سنگین مسئلہ بینکوں کے ناقص قرضے ہیں جن کا زیادہ تر استعمال پرانے قرضوں اور سود کی ادائیگی ہے۔ 2012ء میں کل نجی بینکوں سے حاصل کردہ قرضہ

پرانے سرکاری و نجی بینکوں کے قرضوں کی ادائیگی پر صرف ہوا تھا۔ قرضوں کا بڑا حصہ ایک سیاہ (شیڈو) بینکاری سے حاصل ہوتا ہے جو بنیادی طور پر کالے دھن اور بلیک مارکیٹ کے زمرے میں آتے ہیں اور یہی سب سے خطرناک قرضے ہیں کیونکہ انکی بنیاد پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ کالے سود خور ادارے 14 فیصد سے زیادہ شرح سود پر قرضے دیتے ہیں جن کو لے کر بہت ہی کم شرح سود پر حاصل کیے گئے سرکاری بینکوں کے قرضوں کی ادائیگی کا عمل چینی سرمایہ داری کو اندر سے مزید کھوکھلا کیے جا رہا ہے۔ اس سارے بحران کی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں مغربی ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کے 18ویں اور 19ویں صدی کے نسبتاً صحت مند عروج میں ٹھوس بنیادوں پر بورژوا انقلابات کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کو تعمیر کیا گیا تھا وہاں چین میں اس کو اوپر سے ایک سیاسی ردِانقلاب کے ذریعے ٹھونسا گیا جس کی وجہ سے اس ناہموار ایڈوانس ٹیکنالوجی کے طرز ارتقا کی بنیادیں کمزور تھیں۔ اس سے چین کے صنعتی، زرعی، مالیاتی اور سروسز کے شعبوں میں وہ ہموار اور گہری بنیادیں تعمیر نہیں ہوسکتیں تھیں جن پر سرمایہ دارانہ نظام کا مضبوط ڈھانچہ کھڑا کیا جاسکتا۔ ریاست اس منڈی کی معیشت کو ریگولیٹ کر رہی تھی لیکن وہ اس طرح کب تک کر سکتی ہے۔ اگر منڈی کی طاقتوں نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ چین کے وسائل چین کی معیشت کے کس حصے میں جانے ہیں تو پھر آخری تجزیے میں منڈی کی طاقتیں ہی قرضے کی سمت کی تقسیم اور تفریق کرتی ہیں۔ پھر ریاست لمبے عرصے تک ایسا نہیں کر سکتی۔ یہی ریاستی سرمایہ داری کا المیہ تاریخ میں بار بار شدید بحرانوں اور اس ماڈل کی تنزلی کا باعث بنا ہے۔

گزشتہ کئی سالوں سے چین میں سرمایہ داری کے لاکھوں افراد کو غربت سے نکالنے کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ جب کہ اصلیت اس کے برعکس ہے۔ چین میں 1995ء سے لے کر 2005ء تک ''چائنا بزنس ریویو'' کے مطابق 6000 ڈالر سے 25000 ڈالر سالانہ کی آمدن والا آٹھ کروڑ 70 لاکھ افراد پر مشتمل ایک درمیانہ طبقہ پیدا ہوا۔ ''ماسٹر کارڈ ایشیا پیسفیک'' کے مطابق 2016ء تک اس کی مقدار تینتیس (33) کروڑ 60 لاکھ ہو جائے گی اگر اس درمیانے طبقے کو چین کی کل 130 کروڑ کی آبادی میں سے منفی کریں تو تقریباً 96 کروڑ افراد سرمایہ دارانہ ماہرین کے مطابق غربت کی کسی نہ کسی سطح پر چین کے باسی ہیں۔ ان اعداد و شمار سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ سرمایہ دارانہ استواری سے چین میں یہاں کے محنت کشوں اور غریب عوام کی بھاری اکثریت کا کیا حشر ہوا ہے۔ دوسری جانب چینی ریاست پر قرضوں کا بوجھ اس کو ناگزیر طور پر سماجی

سہولیات میں کٹوتیوں کی جانب دھکیل رہا ہے۔ 2005ء میں چین کی صرف 6 فیصد آبادی 65 سال یا اس سے زیادہ ہوتی تھی۔ اوپر دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق 2020ء میں یہ 25 فیصد ہو جائے گی۔ ان کی پنشن، علاج اور دوسری سہولیات کی فلاحی پالیسی ایک زوال پذیر شرح نمو و ترقی میں تو ممکن نہیں۔ لیکن اس شرح نمو اور کاروبار میں مندی سے بیروزگاری میں اضافہ تیزی سے بڑھے گا جس سے درمیانہ طبقہ پھیلنے کی بجائے سکڑنے لگے گا اور چین میں سماجی انتشار شدت پکڑ جائے گا۔ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر ایک آمریت کا تسلط اس معیشت میں تیز ترقی کے ذریعے کسی حد تک چل سکتا ہے۔ اگر اس ترقی کی تنزلی شروع ہو جائے تو اس آمریت کے لیے سزائے موت کے مترادف بن جاتی ہے۔ سماجی بحران کی شدت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان معاشی جھگڑوں سے 49 فیصد خواتین گھریلو تشدد کا شکار ہیں۔

لیکن پھر سرمایہ دارانہ نظام کے گہرے زوال اور اس گراوٹ سے بحالی کے امکانات کا مخدوش ہونا ایک ایسی نفسیاتی مایوسی کی بیماری کو جنم دے رہا ہے کہ اس کا شکار بہت سے سنجیدہ ذرائع ابلاغ بھی مفلوج ہو گئے ہیں۔ لیکن چین کے سماج کی کوکھ میں بڑھتی ہوئی بے چینی سے اشرافیہ کے سنجیدہ حصے کافی خوفزدہ ہیں۔ اس لیے وہ جہاں چین کو سپر پاور بنانے کے خواب دکھا دکھا کر یہاں کے غریب باسیوں میں قوم پرستی کے جذبے کو ابھار کر انکو ٹھنڈا کرنے کی کاوش کر رہے ہیں، وہاں وہ بیرونی تضادات بھی ابھارنے کا عمل مرحلہ وار وقفوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کئی مرتبہ اسکی رفتار اور شدت میں تیزی بھی آ جاتی ہے۔ کہیں امریکہ کے ساتھ مقابلہ بازی کا شور مچایا جاتا ہے تو کہیں جاپان، جنوبی کوریا، فلپائن، فارموسا (تائیوان) وغیرہ کے ساتھ ماضی کے تنازعات، جزیروں کی ملکیت کے جھگڑے دوبارہ ابھار کر چینی عوام میں قومی شاونزم کو ابھارا جاتا ہے۔ اسی طرح جہاں ان کو بڑے پیمانے پر جبر کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ کسی بھی ظلم سے اجتناب نہیں کرتے۔ سنکیانگ، تبت اور وسطی منگولیا کے پسماندہ علاقوں میں اسی وحشیانہ ریاستی جبر کے کئی مظاہرے بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن ترقی یافتہ علاقوں میں ایڈوانس اور ہراول تیکنیکی مزدوروں پر ابھی تک کسی بڑے تشدد سے اس اشرافیہ نے گریز کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس طاقتور پرولتاریہ کو چھیڑنا بھی کسی ہراول اور منظم تحریک اور بغاوت کو جنم دے سکتا ہے جس سے خود چینی ریاست میں دراڑیں پڑ سکتی ہیں۔ گو چین میں صرف ایک سرکاری ٹریڈ یونین فیڈریشن کی اجازت ہے اور یہ یونین بھی ریاستی جبر کا آلہ کار بن کر بڑی ہڑتالوں کو رکوانے اور اندر سے سبوتاژ کرنے کی

واردات کرتی ہے۔لیکن پھر یہ کسی حد تک اجرتوں میں اضافے اور معمولی رعائتیں بھی تھوڑی تھوڑی دلواتی ہے کہ اسکی کچھ ساکھ تو بچی رہے۔حالیہ مہینوں میں جو بڑی ہڑتالیں جدید صنعتی اداروں میں ہوئی تھیں ان میں سب یونینوں کے بغیر عمل میں جنم لینے والی مزدوروں کی ایکشن کمیٹیوں کے ذریعے ابھری اور کامیاب ہوئی ہیں۔ 2012ء میں آئی ایم ایف اور آئی ایل او (ILO) نے چین کی حکومت سے آزاد ٹریڈ یونین اداروں کو بنانے کی پالیسی اختیار کرنے کی سفارش کی تھی۔ اس سامراجی پالیسی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پہلے ٹریڈ یونین بنا کران پر بیوروکریسی مسلط کی جائے جو مزدوروں کے اچانک بپھر کر بغاوتیں کرنے کے سیلاب کو کنٹرول کر سکے۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان اداروں اور چینی بیوروکریسی کے درمیان مذاکرات اور منصوبہ بندی فی الوقت جاری ہے۔خارجی محاذ پر اقتصادی طور پر اس وقت چین دنیا کا سب سے بڑا بیرونی سرمایہ کار بن چکا ہے۔یہ اپنا سرمایہ لاطینی امریکہ سے افریقہ، ایشیا اور آسٹریلیا کے براعظموں میں برآمد کر رہا ہے۔لینن نے اپنی عظیم تصنیف ''سامراج: سرمایہ داری کی آخری منزل'' میں یہ واضح کیا تھا کہ کسی بھی سرمایہ دارانہ ریاست کے سامراجی کردار اپنانے کا پہلا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے جب وہ سرمایہ برآمد کرنا شروع کر دیتی ہے۔اس برآمد کے حجم کے ایک حد سے بڑھ جانے سے ان ریاستوں کا سامراجی تسلط ایک مستقل کردار کا حامل بن جاتا ہے۔لیکن اس کو اس تعریف سے دیکھا جائے تو چین کی اشرافیہ اب ایک بڑی حد تک سامراجی کردار اپنا چکی ہے۔14 دسمبر 2014ء کو ''فنانشل ٹائمز'' میں چین کے صدر شی جین پنگ نے اعلان کیا ہے کہ اگلے دس سال کے اندر چین ایک ہزار دو سو پچاس ارب ڈالر سرمایہ کاری کی صورت میں مزید برآمد کرے گا۔اس سامراجی روش میں چین کے حکمرانوں کی چینی کرنسی کو ڈالر کے مقابلے میں بین الاقوامی کرنسی بنانا بھی مقصود ہے۔گو چین اور پاکستان جیسے دوسرے ممالک کے حکمران ظاہری ناٹک ماضی کی طرح دوستی اور مدد کا کرتے ہیں۔لیکن 1960ء کی دہائی کی نسبت چین کی اس ''امداد'' اور ''دوستی'' کا کردار یکسر بدل چکا ہے۔ماضی میں چینی سٹالنسٹ افسر شاہی اپنے قومی تسلط اور اس طرز کے ''قومی سوشلزم'' کے فروغ کے لیے امداد وغیرہ دیا کرتی تھی۔اس کا مقصد سفارتکاری اور عالمی سطح پر اپنا اثر ورسوخ اور قومی حیثیت کا منوائے جانا اور اپنا عالمی طور پر ایک مخصوص قومی مقام بنانا ہوتا تھا۔ان کا نظریہ طبقاتی رشتوں کی بجائے قوموں کے درمیان تعلقات پر مبنی تھا۔سٹالنزم کی تشریح ہی ''قومی سوشلزم'' تھی۔چینی سٹالنسٹ اور روسی سٹالنسٹ اس حد تک قوم

پرستی سے زہر آلود تھے کہ ''کامریڈ'' آپس میں بات چیت کی بجائے توپوں اور بارود کی زبان میں مخاطب ہوتے تھے۔ سفارتی محاذ پر ''چین'' اور ''روس'' کے درمیان ایک سرد جنگی جارحیت مسلسل جاری تھی جس سے یہ بدترین سرمایہ دارانہ حکمرانوں کو اپنا دوست بناتے تھے اور وہاں محنت کشوں کی بجائے ان پر ظلم واستحصال ڈھانے والوں سے تعلقات رکھتے تھے۔ 1960ء کے بعد سے سٹالنزم کی حاکمیت کے عرصے میں برصغیر میں چینی سٹالنسٹ حکمران ایوب خان کے پاکستان کی حمایت کرتے تھے۔ اور روسی سٹالنسٹ بھارتی مزدوروں پر مظالم ڈھانے والے اندرا گاندھی جیسے لیڈروں سے گہرے مراسم رکھتے تھے۔ لیکن آج کے دور میں چین سے امداد گرانٹوں میں نہیں آتی بلکہ مغربی سامراجی طاقتوں کی طرح یہ بڑے سود، شرائط اور منافعوں و مالیاتی فوائد کی گارنٹیاں حاصل کر کے آتی ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نومولود سامراجی طاقت کا کردار اور جبر مروجہ سامراجی طاقتوں سے بھی زیادہ جابرانہ اور درندگی پر مبنی ہے۔ اس لیے پاکستان اور چین کی پہاڑوں سے اونچی اور سمندروں سے گہری دوستی کا ناٹک دراصل اتنی ہی بھاری بھرکم اور وسیع سامراجی منافعوں اور مقامی حکمرانوں کے کمیشنوں کی خطیر رقم کے ساتھ ہی منسلک ہوتا ہے۔ لیکن زیمبیا اور دوسرے ملکوں میں ہونے والی کانگی اور چند دوسرے شعبوں میں سرمایہ کاری اور چینی حکمرانوں کا رویہ اور جبر واستحصال اتنا سفاکانہ ہے کہ اس کے خلاف مہم چلانے والے انتخابات تک جیت گئے ہیں۔ دوسرے کئی پسماندہ ممالک میں بھی ہمیں یہ صورتحال ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پاکستان کے مزدور بھی اس تلخ حقیقت سے ان منصوبوں اور چینی اجارہ داریوں میں کام کر کے جبر کا شکار ہو رہے ہیں اور اسی ''دوستی'' کے بھیانک روپ سے آشکار ہو رہے ہیں۔ منصوبہ بند معیشت کے دوران 1960ء اور 1970ء کی دہائی میں ٹیکسلا کے بھاری مکینیکل کمپلیکس جس میں صنعتی مشینری بنتی تھی اور بھاری فوجی ساز وسامان تیار ہوتا تھا اور کراچی میں مشین ٹول فیکٹری لگائے جانے کے منصوبے کی بنیادیں اور مقاصد موجودہ سرمایہ دار چین کے گوادر پورٹ سے لے کر کوئلے سے بجلی پیدا کرنے کے بھاری منصوبوں کی سرمایہ کاری کی شرائط سے بالکل الٹ تھیں۔ پہلے منصوبے حقیقی امداد پر مبنی تھے۔ آج کے منصوبے سامراجی سرمایہ کاری کی طرز پر تلخ شرائط کے ساتھ چین کے نجی سرمایہ کار اجارہ داروں کے لیے بھاری منافعوں پر مبنی ہیں۔ منصوبہ بند اور منڈی کی معیشت کا داخلی فرق اس کے خارجی معاشی واقتصادی کردار میں پوری طرح عیاں اور واضح ہوتا ہے۔ جہاں اس سامراجی پالیسی کے معاشی اقدامات بہت واضح

ہوگئے ہیں وہاں اس کے سیاسی، سفارتی اور قومی کردار میں بھی غلبے کا عنصر نمایاں ہوکر سامنے آیا ہے۔ اگر گوادر میں اقتصادی سرمایہ کاری ہے تو اسکے خلیج فارس کے لیے فوجی اور سفارتی عزائم بھی ہیں۔ اسی طرح بحرالکاہل اور ساؤتھ چائنا سمندر میں ہمیں چینی نیوی کی مداخلت ملتی ہے۔ سری لنکا، بنگلہ دیش اور ماریشس میں اڈے قائم کرنا بحرِ ہند میں سبقت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ افغانستان میں چین سب سے بڑا بیرونی سرمایہ کار بن چکا ہے۔ بھارت کے ساتھ جہاں تجارتی تعلقات ہیں وہاں سرحدی تناؤ بھی ہے اور دونوں ممالک کے عزائم کی نوعیت سامراجی ہے۔ بھوٹان، برما، ویتنام، لاؤس، کمبوڈیا اور اسکے جنوب کے دوسرے ممالک کی جانب بھی چینی حکمرانوں کا رویہ ایک غلبے اور حاوی پن کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ علاقائی غلبہ انفراسٹرکچر اور دوسرے شعبوں سے شروع ہوکر سیاسی اور سفارتی تسلط تک پہنچتا ہے۔ بڑے اور چھوٹے ملکوں کے درمیان تجارت میں استحصال لازم ہوتا ہے۔ اکانومسٹ کے مطابق ''مسٹر شی کا ''سلک روڈ'' کی تعمیر کا منصوبہ چینی مارشل پلان ہے''۔ اس کا دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکی سامراج کے یورپ، جاپان، کوریا، تائیوان وغیرہ میں جاری کیے گئے مارشل پلان سے موازنہ کیا گیا ہے۔ امریکہ اس مارشل پلان کے ذریعے ان خطوں کی تعمیرِ نو سے غلبہ حاصل کر کے ہی عالمی سامراجی طاقت بنا تھا۔

لیکن ذرائع ابلاغ کے تواتر سے کئی دہائیوں کے پراپیگنڈے کی وجہ سے عمومی طور پر سماجوں میں چین کے طریقہ کار کے بارے میں بہت گہری اور وسیع غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ عمومی طور پر چینی ماڈل کو ترقی کا راستہ سمجھا جاتا ہے۔ بیشتر سیاسی لیڈر اس ماڈل کو نہ صرف پاکستان میں بلکہ یورپ اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی اس بحرانی دور میں ایک ''نئے'' اور ''کرشمہ ساز'' حل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بعض سرمایہ دارانہ جمہوریت کے دلدادہ دانشور اور جرائد اب سرمایہ داری کو لاحق اس شدید معاشی و اقتصادی بحران کے حل کے لیے چینی ماڈل کو اسکی جابرانہ اور آمرانہ ''خاصیتوں'' کے ساتھ قبول کرنے کے حق میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ چین کی جو تصویر کشی کی جارہی ہے وہ ترقی اور خوشحالی کی ہے۔ جبکہ چین کی آبادی کی بھاری اکثریت جس کو اس ''ترقی'' کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے اس کی تحریکوں، امنگوں اور حالتوں کو بڑی عیاری سے روپوش کیا جاتا ہے۔

لیکن اس سارے عمل میں سب سے بھیانک کردار ان سابقہ ''سٹالنسٹ'' اور ''ماؤاسٹ''

دانشوروں کا ہے جنہوں نے چین میں سرمایہ دارانہ ردِانقلاب کو تسلیم کیا، جو دیوارِ برلن کے گرنے اور سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ''سوشلزم''، ''کمیونزم'' اور مارکسزم سے توبہ تائب ہوگئے اور سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ دوسرے الفاظ میں ان سابقہ بائیں بازو کے راہنماؤں اور دانشوروں نے فرانسس فوکویاما کے 1992ء کے ''تاریخ کا اختتام'' کے نظریئے کو قبول کرلیا تھا۔ فوکویاما نے اس نظریے کو اب خود مسترد کردیا ہے۔ اپنی نئی کتاب ''پولیٹکل آرڈر اینڈ پولیٹکل ڈیکے'' میں فرانسس فوکویاما نے تسلیم کیا ہے کہ ''حالات اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کرگئے ہیں جو میں نے تصور کیے تھے۔ چین میں ریاستی سرمایہ داری اور جبری حکمرانی کا ملغوبہ رائج ہے اور جمہوریت کا عمل روس اور زیادہ تر مشرقِ وسطیٰ اور دنیا کے دوسرے خطوں میں ناکام ہوچکا ہے۔۔۔'' لیکن یہ ہارے ہوئے عقیدہ پرست انقلابی اب بھی اس پر مصر ہیں اور سرمایہ داروں سے زیادہ بڑے سرمایہ داری کے وکیل بنے ہوئے ہیں۔ ایسے افراد کو چین میں سرمایہ داری کی کامیابی کے ان کرشموں کا بہت فائدہ ہوا ہے۔ جس نے انکی مفاد پرستی کو جواز بخشا ہے۔ ان کی مالیاتی بدعنوانی اور دولت کی ہوس کو تقویت ملی ہے اور اونچی سوسائٹی کا حصہ بننے کی جستجو اور ہوس پوری کرنے کا موقع بھی۔ بنیادی طور پر اس عرصے میں ان دیوہیکل منفی واقعات کے ہونے کے بعد سٹالنزم کی مرحلہ وار انقلاب کی تھیوری اب صرف ایک مرحلے تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ یعنی اب پہلے مرحلے میں ترقی پسند قومی بورژوازی کے ساتھ مل کر قومی جمہوری انقلاب کی تقسیم اور دوسرے مرحلے میں پھر پرولتاریہ اس سرمایہ دارانہ صنعتی انقلاب سے ہونے والے جنم سے سوشلسٹ انقلاب کیے جانے کے پرانے منشویک اور بعد میں سٹالنسٹ نظریئے کی بنیاد پر بننے والی یہ تھیوری اب صرف ایک مرحلہ یعنی سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب تک ہی محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ لیکن اس پر المیہ یہ ہے کہ یہ بونے اب مارکس، اینگلز اور لینن کی اصلاح کرنا شروع ہوگئے ہیں۔ ترمیم پرستی تو بڑا ہلکا سا لفظ ہے یہ لوگ تو مارکس اور لینن کے غلط ہونے کا اب سرعام اعلان کررہے ہیں اور ''نئے'' طریقہ کار کے لیے نئے نظریہ دان بنے بیٹھے ہیں۔ یہی لوگ کبھی مارکس اور لینن کو دیوتا اور نبی بنا کر پیش کرتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ ٹراٹسکی تو ان کے لیے ہمیشہ سے غدار رہا ہے۔ اس کو پڑھے بغیر ہی اس کے نظریات اور اسکی ذات کو جتنی گالیاں دی گئیں، جتنی تضحیک اس شخص کی کی گئی شاید ہی کسی اور انسان کے ساتھ تاریخ میں کبھی ایسی ستم گری ہوئی ہو۔ لیکن ان کے یہ ''نئے نظریات'' بھی بہت ہی پرانے ہیں۔ مارکس کو سمجھے بغیر

مارکسزم کورد کرنے کی اہلیت انہی مارکسزم کے بھگوڑوں میں ہی ہوسکتی ہے۔
اصلاح پسندی آخر کونسا نیا نظریہ ہے۔ یہ تو ہزاروں سال پرانا ہے۔اس کو مارکسزم سے فوقیت اور زیادہ درست قرار دینا انکی جہالت اور ان کے دقیانوسی ہونے کی ہی غمازی کرتا ہے۔لیکن پاکستان، ہندوستان اور جنوب ایشیا کے دیگر ممالک جہاں ابھی مزدور تحریکیں اور عوامی بغاوتیں بڑے پیمانے پر ابھری ہی نہیں ہیں یہ چینی ماڈل اتنا زیادہ خطرناک نہیں ہے کیونکہ یہ سابقہ بائیں بازو کے لوگ جواب زیادہ تر سول سوسائٹی اور این جی اوز کی ایک مخصوص اور بہت قلیل سی مخلوق بن کر رہ گئے ہیں، معاشرے کی وسیع پرتوں میں بے اثر اور بے معنی حیثیت رکھتے ہیں۔لیکن لاطینی امریکہ اور وسطی امریکہ کے ممالک میں جہاں تحریکوں کا ایک ابھار ہے اور بہت سے ممالک میں سوشلسٹ یا ورکرز پارٹیاں وسیع عوامی بنیادیں حاصل کر چکی ہیں، وہاں یہ ''چینی ماڈل'' زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔خصوصاً وہ سابقہ سٹالنسٹ دانشور جو ہار کر اپنی یونیورسٹیوں میں گم ہوگئے تھے وہ دوبارہ اس نئی طبقاتی کشمکش کے ابھار سے پھر سرگرم ہوگئے ہیں۔انہوں نے اپنی ظاہری دانشوری سے مقبول عام یا پاپولسٹ لیڈروں سے قربتیں حاصل کی ہیں اور نیچے سے ابھرنے والی انقلابی تحریکوں کو ''چینی ماڈل'' کے زور پر اصلاح پسندی کی کھائی میں غرق کرنے کے درپے ہیں۔ان کا اس نظام سے سمجھوتہ کر جانے کے بعد مفاد پرستی اور خودغرضی کے علاوہ کوئی اور نصب العین نہیں ہے۔ وینزویلا، ایکواڈور، بولیویا اور چند دوسرے لاطینی امریکی ممالک میں انقلابات کی تکمیل ابھی تک نہیں ہوسکی اسکی ایک اہم وجہ ان جعلی اور مارکسزم کے بھگوڑے دانشوروں کا پھیلایا ہوا تذبذب ہے۔لیکن اس کا زیادہ منفی اثر کیوبا جیسے ملک پر ہو رہا ہے جہاں پہلے سے منصوبہ بند معیشت موجود ہے۔راہول کاسترو کے گرد جو اس چینی ماڈل کے مداح اصلاح پسند حواری اکٹھے ہوگئے ہیں وہ اس کوشش میں ہیں کہ کیوبا میں بھی چین کی طرح سرمایہ دارانہ بحالی کا عمل تیز کیا جائے۔اس لیے مارکسی قوتوں کا ان ردِ انقلابی اصلاح پسندی کے رجحانات کو شکست دے کر انقلابی راستوں کو اجاگر کرنا اہم ذمہ داری بنتی ہے۔لاطینی امریکہ میں یہ انقلابی ضرورت اور بھی زیادہ شدت اختیار کر جاتی ہے۔ مارکسزم کے نظریات کو جہاں سابقہ بائیں بازو کے افراد مسترد کر چکے ہیں وہاں بہت سے سنجیدہ معیشت دان براہِ راست یا بالواسطہ تسلیم بھی کر رہے ہیں۔ سرمایہ داری کے سنجیدہ جریدے آج بھی بالشویک انقلاب کے امکان کو رد کرنے کی جرات نہیں کر رہے بلکہ الٹا حکمرانوں کو اس ''خطرے'' سے آگاہ کر رہے ہیں۔لیکن یورپ میں خصوصاً اور دنیا

بھر میں عمومی طور پر نوجوانوں میں دوبارہ مارکسزم کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا ایک نیا رجحان ابھرا ہے اور تیزی سے پھیل بھی رہا ہے۔ پاکستان میں بھی نوجوانوں کی ایک اہم تعداد تمام مصائب و آلام کے باوجود مارکسزم اور سوشلزم کے امکان اور ''حل'' کو سمجھنے کی جستجو سے مرصع ہو رہی ہے۔ اسی طرح مارکسزم، کمیونزم اور سوشلزم کے نام پر برپا ہونے والے انقلابات کو سمجھنے کی دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے۔ اسی حوالے سے چین نہ صرف وہاں کے انقلاب کی وجہ سے دلچسپی کا باعث ہے بلکہ موجودہ عہد میں عالمی معیشت، سیاست، سفارتکاری اور دوسرے شعبوں میں اپنے کلیدی کردار کی وجہ سے نہایت ہی فیصلہ کن اہمیت کا حامل بھی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپی اس تناظر میں ہے کہ چین میں ہوگا کیا؟ چین اب یہاں سے کدھر جائے گا؟؟؟

گزشتہ صدی میں چین کی سرزمین پر کئی انقلابات اور ردِ انقلابات ہوئے ہیں۔ چین کی تاریخ کسانوں کی بغاوتوں سے بھری پڑی ہے۔ آج کا چین ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ تمام تر ذرائع ابلاغ کے پراپیگنڈے کے باوجود نوجوان اور عام لوگ تھوڑا بہت بھی چین کو کریدنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کرشمے پر نہ تو کوئی یقین کرتا ہے اور نہ ہی یہ کشش کا باعث رہتا ہے۔

پاکستان میں چین کا 1960ء کے بعد سے ایک اہم کردار رہا ہے اور اب یہ زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ کیونکہ اب نہ صرف پاکستان کی معیشت بلکہ پاکستان کی سیاست، ثقافت اور خصوصاً ریاست میں چین کی مداخلت آج پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس تمام حقیقت کے باوجود چین پر کوئی جامع اور وسیع تجزیہ و تناظر اردو زبان میں موجود نہیں۔ ہم نے 1996ء میں چین پر ایک کتاب ''چین: انقلاب کی تلاش میں'' شائع کی تھی۔ 19 سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کے بارے میں جب غور و خوص کیا گیا تو جس حد تک اضافے کرنے کی ضرورت تھی وہ نئے ایڈیشن کی حدود سے کہیں زیادہ تجاوز کر جاتی تھیں۔ اس لیے ہم نے اس اہم موضوع پر اس نئی کتاب پر کام شروع کیا۔ اس میں وہ مواد بھی موجود ہے کہ پرانی کتاب پڑھنے کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن چین کی تاریخ انقلابات کے کردار اور ان کے اثرات، آج کے عہد میں چین کا کردار اور سب سے اہم آنے والے وقت میں چین میں ہونے والے واقعات نہ صرف پاکستان بلکہ اس سارے خطے اور دنیا بھر میں بہت بڑے اور دھماکہ خیز اثرات اور مضمرات کے حامل ہونگے۔ چین میں محنت کش طبقہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا پرولتاریہ بن چکا ہے۔ اس کے کردار کو یا تو سرے سے غائب کر دیا جاتا ہے یا پھر اسکے چیدہ چیدہ واقعات ایک مخصوص مفادات کے مطابق توڑ مروڑ

کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اصل چین، چین کے یہ محنت کش عوام ہی ہیں۔ اور نپولین نے کہا تھا کہ ''جب چین جاگے گا تو سارا جہاں لرز اٹھے گا''۔ اس لئے دنیا کے سٹیج پر آنے والے دور میں اسی چینی نوجوان پرولتاریہ کا کردار انسانیت کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن ہوگا۔

چین کی تاریخ اور انقلابات میں سیکھنے کے لیے بے پناہ اسباق موجود ہیں۔ خصوصاً وہ نوجوان اور محنت کش جو پاکستان اور برصغیر میں ایک سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد کا حصہ ہیں یا کسی بڑی تبدیلی کی جستجو رکھتے ہیں ان کے لیے چین کے انقلابات میں بہت سی مماثلتیں اور مشابہتیں موجود ہیں اور اس میں گہرے اسباق بھی ہیں۔ چین کو ایک مارکسٹ نقطہ نظر سے ہی سمجھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ ایک جدلیاتی طریقہ کار سے ہی اس کے ماضی، حال اور مستقبل کو جوڑ کر انکے ارتقا اور تغیر کے عمل میں ہی وہ تناظر تخلیق کیا جاسکتا ہے جو تاریخ کی کسوٹی پر پورا اتر سکے۔

''چین کدھر؟'' کو شائع کرنے کا مقصد نہ صرف یہ ہے کہ آج کے دور میں مارکس کی بین الاقوامیت ایک ٹھوس حقیقت اور مادی سچائی بن کر ہمارے سامنے ہے، دنیا ایک معاشی اکائی بن چکی ہے جس میں مختلف سیاسی یونٹ ہیں اس کو بعض لوگ ''گلوبل ولیج'' بھی کہتے ہیں بلکہ اس کتاب کی اشاعت کا ایک اور مقصد اس عہد کے اس اہم ترین ملک کی تاریخ اور تناظر کو بھی واضح کرنا ہے اور یہ ایک نئی نسل جو اس نظام کے خلاف ایک سوشلسٹ انقلاب کی جستجو اور جدوجہد میں شامل ہو رہی ہے اس کو ان تجربات اور اسباق سے لیس اور نظریاتی طور پر مسلح کرنے کی ایک کاوش بھی ہے۔ اسی طرح اس کی اشاعت کا مقصد ان نوجوانوں اور محنت کشوں کو اس طبقاتی جنگ میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لیے تیار کرنا ہے۔ چین کے اس معمے کی غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں دور کرنے کی اس کاوش کا مقصد یہ بھی ہے کہ آج کے عہد کے ایک بین الاقوامی تناظر کے اس فیصلہ کن عنصر چین میں ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات اور ان سے پاکستان اور برصغیر میں انقلاب کی اس طبقاتی جدوجہد کو جوڑنے کا ذریعہ اور لائحہ عمل استوار ہو سکے۔ ہمیں امید ہے کہ اس نئی نسل کی انقلابی تعلیم و تربیت میں یہ کتاب ایک اہم اور مؤثر کردار ادا کرے گی۔

آج دنیا کے کسی بھی ایک ملک میں برپا ہونے والا سوشلسٹ انقلاب ماضی کی نسبت کہیں زیادہ تیز رفتاری، سرعت اور کامیابی کے ساتھ دنیا کے دوسرے ممالک میں پھیلے گا۔ اسکی 1917ء کی نسبت کہیں زیادہ ٹھوس، جامع اور واضح سماجی، معاشی، تیکنیکی اور ثقافتی بنیادیں موجود ہیں۔ آج کی اس انٹرنیشنلائز دنیا میں اس کرۂ ارض کے پیداواری انجن چین میں ایک انقلابی تحریک پورے

سیارے کے سماجوں میں انقلابی مارکسزم کو ایک ٹھوس تاریخی وسائنسی سچائی کے طور پر اجاگر کرنے کا سبب بنے گی۔ اس گلے سڑے سرمایہ دارانہ نظام نے غربت، بھوک، مفلسی، ذلت، بیروزگاری، بیماری، ناخواندگی، دہشت گردی، جنگوں، خونریزیوں اور بربریت کے اجزا کو پھیلا کر نسلِ انسانی کو ان عذابوں کی اذیت میں جس شدت سے مبتلا کر رکھا ہے ان کو اکھاڑنے کا عمل بھی اسی برق رفتاری سے ہر طرف پھیلے گا۔ کیونکہ اب صرف مسئلہ ان ذلتوں اور اذیتوں کا نہیں ہے بلکہ سوال آج کے عہد میں اینگلز کے مطابق بربریت اور سوشلزم کے راستوں میں سے کسی ایک کو اپنانے کا ہے۔ ایک طرف بربریت ہے جو تہذیب وتمدن اور نسلِ انسانی کی سماجی حیثیت کے خاتمے کا نام ہے اور سرمایہ داری کے تحت انسانی معاشرے کا یہی ہولناک تناظر ہے۔ لیکن پھر دوسری طرف سوشلزم ہے جو نہ صرف تہذیب وتمدن کو نئی معراج دے کر خوشحالی کو اجتماعی شکل دے گا بلکہ ایک عالمی سوشلسٹ انقلاب کے شروع ہونے سے کمیونزم تک کا فاصلہ سمٹ کر ایک ایسی سائنسی اور تیکنیکی ترقی پر منتج ہوگا جس میں نسلِ انسان کو کبھی نہ دیکھی گئی رعنائی اور تابندگی نصیب ہوگی۔

لال خان

لاہور۔ دسمبر 2014ء

باب 1

قدیم چین

بحرالکاہل کے ساحلوں سے لے کر کوہ ہمالیہ اور قراقرم کی بلند و بالا چوٹیوں تک پھیلا ہوا کرہ ارض کا وسیع و عریض خطہ چین کہلاتا ہے۔ صحراؤں، دریاؤں، پہاڑوں اور سمندر کے ساحلوں تک پھیلی یہ گنجان آباد تہذیب انسان کے ہزاروں سال کے شعور اور آگہی کے سفر کی گواہ ہے۔ گھنے جنگلات سے لے کر صحرائے گوبی کی وسعتوں تک اور یانگزے اور زرد دریا کے میدانوں سے لے کر تبت کے سطح مرتفع تک چین میں قدرت کے تمام مظاہر پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ بحرالکاہل کے ساتھ نو ہزار میل لمبا ساحل خود سمندر کی وسعتوں کو انسانی تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کا وسیلہ ہے۔

انسانی تہذیب کی تاریخ میں چین کی تاریخ کا ایک اہم حصہ رہا ہے لیکن مشرق کی دیگر تہذیبوں کی طرح چین کی تہذیب بھی مغربی تہذیبوں کے برعکس غلام داری اور جاگیرداری کے مراحل سے صنعتی انقلاب میں داخل ہونے کی بجائے ہزاروں سال ایشیائی طرز پیداوار کے تحت آگے بڑھتی رہی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کہیں جا کر 1911ء کے بورژوا انقلاب کے ذریعے اس طرز پیداوار کا خاتمہ ہوا اور چین عالمگیر سرمایہ داری کے شکنجے میں داخل ہوا۔ اس بورژوا انقلاب کی بنیادیں انیسویں صدی میں ہی استوار ہونا شروع ہو گئیں تھیں جب سامراجی ممالک سے تجارت میں شدت آنے لگی لیکن حتمی طور پر ایک انقلاب کے ذریعے چین میں بادشاہت کا

خاتمہ کیا گیا اور ایک جمہوری چین کا آغاز ہوا۔اسی انقلاب نے 1925-27ء کے سوشلسٹ انقلاب کی بنیاد رکھی جو اپنی منزل تو حاصل نہ کر سکا لیکن ایک اور عظیم انقلابی روایات کی بنیاد رکھ گیا اور حتمی طور پر 1949ء کے انقلاب میں سرمایہ دارانہ نظام کا مکمل خاتمہ کیا گیا۔

ان تمام عظیم واقعات سے قبل کا چین ایک سوئے ہوئے دیو کی مانند تھا جس میں اس کرۂ ارض پر آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ قدیم طرز پیداوار کے باعث انسانی ترقی کی منازل طے کرنے میں انتہائی سست روی کا شکار تھا۔روایتی مؤرخین کی تصانیف کے اوراق پلٹیں تو چین کی تاریخ بادشاہوں اور ان کے خاندانوں کے طویل سلسلے کی تاریخ نظر آتی ہے جس میں سوائے جنگوں اور محلاتی سازشوں کے کوئی بڑا واقعہ ہوتا نظر نہیں آتا۔گو کہ ہندوستان کی تاریخ کے برعکس چین کی روایتی تاریخ میں کسانوں کی بغاوتوں کا بھی ذکر ملتا ہے لیکن سماجی تبدیلی یا ذرائع پیداوار میں اتار چڑھاؤ سے ان کا تعلق نہیں ملتا۔تاریخ میں سیلابوں اور قحط سالیوں کا ذکر بھی بڑی تعداد میں موجود ہے جن میں کروڑوں لوگ لقمۂ اجل بنے اور یہ چین کی سیاسی اور سماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتے رہے۔لیکن ان تمام قدرتی آفات، جنگوں اور کسانوں کی بغاوتوں کے باوجود چین کی روایتی قدیم تاریخ میں سماجی پیداوار یا بنتر میں قابل ذکر تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ہیگل 'تاریخ کا فلسفہ' میں رقم طراز ہے:

''تاریخ یہاں واقعی بہت ہی 'غیر تاریخی' (Unhistorical) ہے کیونکہ یہ زیادہ تر بہت عظیم تباہی کی تکرار ہے۔نیا عنصر جو شجاعت، دلیری اور عظمت کی شکل میں پچھلے مطلق العنان حکمران کی جگہ پر قبضہ کرتا ہے، زوال اور پستی میں دھنسنے کے اسی چکر سے دوبارہ گزرتا ہے۔یہ پستی اس طرح حقیقی بھی نہیں کیونکہ اس تمام مسلسل حرکت پذیری کے باوجود آگے کی جانب کوئی مرحلہ طے نہیں ہوتا۔'' (ہیگل، تاریخ کا فلسفہ، صفحہ 51)

تاریخ نویسی

مارکسی فلسفہ تاریخ کو ساکت اور جامد نہیں دیکھتا اور نہ ہی مختلف بڑے واقعات کو ایک دوسرے سے کاٹ کر دیکھتا ہے۔تاریخی مادیت کسی بھی خطے کی تاریخ کو ایک مسلسل عمل کے طور پر دیکھتی ہے اور بڑے یا چھوٹے واقعات کو ان کی مسلسل تبدیلی کے اندر جاننے کی کوشش کرتی

ہے۔تاریخی مادیت کے تحت تاریخ مرتب کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مختلف بادشاہوں کی سوانح حیات کیلنڈر کے مطابق ترتیب سے لکھ دی جائیں اور اسے آنے والی نسلوں کے لیے اپنے ماضی سے واقفیت کے لیے دہرایا جاتا رہے۔مارکسی نقطہ نگاہ سے تاریخ کی وضاحت کرنے کا مطلب ''انسانوں کی آرزوؤں،شوق،جوش اور جذبے کو اجاگر کرنا،ان کی اہلیت اور ان کی زندہ طاقتوں کو سامنے لانا ہے''۔اس نقطہ نظر سے چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی اہم اثرات مرتب کرسکتا ہے اور سماجی تبدیلی میں اپنا کردار ادا کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک لمبے عرصے پر محیط مقداری تبدیلی کسی مخصوص نکتے پر معیاری تبدیلی کا باعث بنتی ہے اور بڑے واقعات رونما ہوتے ہیں۔مارکسی نقطہ نگاہ سے تاریخ میں کوئی بھی حادثہ یا عظیم سانحہ اچانک رونما نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے مسلسل تبدیلی کا ایک طویل عرصہ موجود ہوتا ہے،جو بظاہر تو سطح پر اپنا اظہار نہیں کررہا ہوتا لیکن سطح سے نیچے مسلسل پنپتا رہتا ہے۔تاریخ کے میدان میں مقداری تبدیلی کا یہ عمل چند دہائیوں سے لے کر ہزاروں سال تک بھی محیط ہوسکتا ہے۔اس طریقہ کار کے تحت صرف بادشاہ اور اشرافیہ طبقات کی زندگی سماج کو رواں دواں نہیں رکھتی بلکہ وہ محنت کشوں کی پیداوار کی مرہون منت ہوتی ہے۔بادشاہ سماج کو نہیں چلا رہا ہوتا بلکہ حالات اور معروض اسے مخصوص فیصلے کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔کسی بھی عہد میں سماج پر براجمان حکمران اس عہد کے سماجی تعلقات اور ذرائع پیداوار کی مخصوص کیفیت کا پابند ہوتا ہے اور اپنی تمام تر رعونت کے باوجود ان کو اپنے کسی شاہی فرمان کے ذریعے تبدیل نہیں کر سکتا۔لیکن دوسری جانب اس عہد میں رہنے والے تمام افراد کو تقدیر کے مہرے قرار دینا بھی بہت بڑی غلطی ہوگی۔کارل مارکس نے کہا تھا کہ ''انسان اپنی تاریخ خود بناتے ہیں،لیکن جن حالات میں وہ ایسا کرتے ہیں ان کا انتخاب وہ خود نہیں کرتے''۔(مارکس،لوئی بونا پارٹ کی اٹھارویں برومیئر) کسی بھی عہد میں رہنے والے افراد اس مخصوص عہد کی حدود میں رہتے ہوئے اپنی شعوری کوششوں سے بڑی تبدیلیاں لاتے ہیں اور سماج کے آگے بڑھنے یا پیچھے جانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔

ایک اور اہم غلطی تاریخ مرتب کرنے کے عمل میں اکثر نظر آتی ہے جب تاریخ پر اپنی خواہشات کو مسلط کرتے ہوئے اسے موجودہ عہد میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے مسخ کردیا جاتا ہے۔قدیم تاریخ کی دستاویزات کی تشریح یا ترجمہ کرتے ہوئے موجودہ عہد کے تعصّبات، تضادات اور معانی حاوی ہو جاتے ہیں۔قدیم عہد کے بادشاہ کو موجودہ عہد یا کسی اور عہد کے

بادشاہ کے مقابل قرار دے دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عہد کے سماجی سیاسی رشتے اور تعلقات مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں اور یہاں تک کہ الفاظ اور نجی ملکیت کے رشتوں کی تبدیلی کے ساتھ خاندان کے مختلف رشتوں کے لیے مخصوص الفاظ کے معانی بدلتے ہیں، جانوروں اور روزمرہ کے استعمال کی دیگر اشیا کی مشترکہ ملکیت کی نجی ملکیت میں تبدیلی سے 'میرا' اور 'تیرا' جیسے بنیادی الفاظ کے استعمال بدل جاتے ہیں۔ سماجی رشتوں کی تبدیلی محبت، نفرت، بہادری، بزدلی اور دیگر ایسے عام الفاظ کے معانی بھی بدل دیتی ہے۔ نجی ملکیت کے رشتوں میں تبدیلی خاندان جیسے سماج کے مرکزی ادارے کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے اور انسانوں کو نئے سماجی تعلقات استوار کرنے پر مجبور کرتی ہے جن میں الفاظ خواہ وہی رہیں لیکن ان کے معانی بدل جاتے ہیں۔

اسی لیے کسی قدیم عہد کی تحریر میں موجودہ عہد کے الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ مل تو جاتے ہیں لیکن ان کے معانی سمجھنے کے لیے اس عہد کے سماج اور اس میں موجود ذرائع پیداوار کے باہمی تعلقات کے جوہر کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر سائنسی بنیاد پر کام کیا جائے تو تاریخ پر اپنے خیالات مسلط کرنے کی بجائے ہمارا شعور ہمیشہ تاریخ میں ہونے والے واقعات اور حالات کا تابع ہوتا ہے۔ تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے حالات ہی ہمارے بیانیے کی بنیاد بنتے ہیں اور یہی حالات و واقعات تاریخ میں ہمارے شعور کے سفر کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اینگلز کو ایک خط میں مارکس نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

''گریم جیسے ماہر لسانیات نے سادہ ترین لاطینی جملوں کا غلط ترجمہ کیا کیونکہ وہ موزر وغیرہ (کے نظریات) کے اثر میں تھا۔ مثال کے طور پر ٹیکی ٹس (سلطنت روم کا ایک سینیٹر) کا مشہور جملہ ''arva per annos mutant et superest ager'' جس کا مطلب ہے کہ 'وہ کھیتوں کا تبادلہ کرتے ہیں اور مشترکہ زمین باقی رہتی ہے'۔ گریم نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ 'وہ ہر سال تازہ کھیتوں کو کاشت کرتے ہیں اور اس کے باوجود ہمیشہ (غیر کاشت زدہ) زمین موجود رہتی ہے۔'' (25 مارچ 1868ء)

اکثر اوقات حکمران طبقات کی جانب سے شعوری طور پر بھی تاریخ کو مسخ کرنے کی کاوشیں کی جاتی ہیں تاکہ انسانی سماج کو جامد اور ساکت بنا کر پیش کیا جائے اور عوام کو باور کرایا جائے کہ حکمران اور عوام کی طبقاتی تفریق اور نجی ملکیت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ انسانی تاریخ کے ایک

مخصوص مرحلے پر ریاستوں اور حکمران طبقات کے ابھرنے کو ایک سماجی عمل کے طور پر دیکھنے کی بجائے اسے آفاقی بنا کر پیش کرنا خود تاریخ کی سائنس کے ساتھ ساتھ ارتقا کے عمل کا انکار ہے۔ سامراجی قوتوں کے تنخواہ دار مؤرخین نے بادشاہوں کی عیش وعشرت اور شجاعت کے قصوں کو تاریخ کا نام دیا۔ انہی میں سے کچھ نے سامراجی مقاصد کے لیے عوام کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے لیے قدیم تاریخ میں سے مذاہب کو جوں کا توں تلاش کر لیا اور انہیں آج کے عہد پر مسلط کر دیا۔ حقیقت میں انہوں نے موجود عہد کے مذہبی فلسفوں اور تعصبات کو قدیم تاریخ پر مسلط کیا اور تاریخ میں ایسے کردار ڈھونڈے جن پر ان مخصوص سوچوں کا نفاذ کیا جا سکتا تھا۔ تبدیلی کے ازلی اور ابدی قوانین کے تحت کوئی سوچ، کوئی فلسفہ، کوئی نظریہ ایک مخصوص عہد میں پنپنے والے تضادات کی پیداوار ہوتا ہے اور اسے صرف اسی عہد کے سماجی تعلقات اور ذرائع پیداوار کے باہمی تعلقات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ ماضی سے ان سوچوں اور الفاظ کو موجود عہد میں استعمال کرنے سے ان کے نہ صرف معانی بدل جاتے ہیں بلکہ اس کے اثرات بھی الٹ ہو جاتے ہیں۔ چین میں کنفیوشس، مینی کس، تاؤ اور دیگر کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا اور ابھی تک کیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ نیچرل سائنس اور فلسفے کی ترقی کے باعث تاریخ کو جتنا سائنسی مواد فراہم کیا جاتا ہے اس میں اتنی ہی وسعت اور گہرائی آتی جاتی ہے۔ نئے آثار قدیمہ کی دریافت، کسی بھی شے کی عمر جاننے کی تکنیک اور اوزاروں میں بہتری اور مختلف اداروں میں ہونے والی تحقیق تک باہمی رسائی تاریخ کے متعلق علم میں اضافہ کرتی ہے۔ اسی طرح تاریخی مادیت کے طریقہ کار کی دریافت اور اس میں پیش رفت کے باعث قدیم تاریخ کے بارے میں جاننے میں مدد ملتی ہے۔

المیہ ہے کہ چین میں 1949ء میں سوشلسٹ انقلاب کی کامیابی اور منصوبہ بند معیشت کے قیام کے باوجود اس اہم شعبے میں تحقیق کو مؤثر انداز میں آگے نہیں بڑھایا گیا اور چین سمیت ایشیائی طرز پیداوار کی تاریخ کے عمومی موضوع پر مارکسی نقطہ نگاہ سے قابل ذکر تحقیق سامنے نہیں آ سکی۔ غیر مارکسی سٹالنسٹ نظریات کے جراثیم کو اپناتے ہوئے چین کی تاریخ میں غلام داری اور جاگیرداری کے مراحل کو تلاش کرنے کی سر توڑ کوشش کی گئی اور بالآخر کسی کونے کھدرے سے غلام داری نکال کر چین کی تاریخ کے اہم مرحلے کے طور پر مسلط کر دی گئی۔ مارکسزم ایک سائنس ہے جبکہ سٹالنزم کے تحت اسے ایک قنوطی نظریہ بنا کر مسخ کر دیا گیا۔ جدلیاتی مادیت کا فلسفہ مارکس اور اینگلز نے خلا میں ایجاد نہیں کیا تھا بلکہ اسے قدرتی اور سماجی عوامل میں سے اخذ کیا تھا۔ اس لیے تاریخ پر اس فلسفے کو میکانکی

انداز میں مسلط کر دینے سے ہم نہ صرف یہ کہ اپنے علم کو آگے نہیں بڑھا سکتے بلکہ درست سمت میں تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی مشکلات پیدا کر دی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کے متعلق بھی بہت سے مؤرخین نے اسی جرم کو دہرایا اور یہاں بھی غلام داری اور جاگیرداری کے مراحل کو مصنوعی طور پر مسلط کرتے ہوئے اسے بھونڈے انداز میں مارکسی نقطہ نظر قرار دیا گیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان، چین اور ایشیائی طرز پیداوار پر مشتمل سماجوں کی مخصوص کیفیتوں اور ذرائع پیداوار کی حالت کا گہرائی میں مطالعہ کرتے ہوئے اس سماج کی حرکت کو سمجھا جائے اور اسے عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے موازنہ کرتے ہوئے مارکسی بنیادوں پر وضاحت کی جائے۔ ایشیائی طرز پیداوار کی اصطلاح بھی مارکس اور اینگلز نے ہی رائج کی تھی اور یہاں کی مخصوص کیفیت پر تبادلہ خیال بھی کیا تھا۔ گو کہ وہ اس موضوع پر کوئی علیحدہ سے تصنیف سامنے نہیں لا سکے لیکن مارکسزم کے یہ بانی مشرق کی تاریخ کے مغربی سماج کی تاریخ سے مختلف ارتقا پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی سماج کی عالمگیریت اور مشترکہ اور غیر ہموار ترقی کے قوانین کو بھی سمجھتے تھے۔ اپنی جدلیاتی سوچ کے طریقہ کار کے تحت ہی انہوں نے انسانی تاریخ کے عمل کو سمجھا تھا اور ہیگل کے نظریات سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے انہوں نے انسانی سماج کے ہزاروں سال کے سفر کی ایک مربوط بنیاد کو دریافت کیا تھا۔ مارکسی نقطہ نظر کے مطابق انسانی سماج عالمی طور پر اور پھر ہر خطے میں ایک مربوط تسلسل کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف فلسفوں اور نظریات کا ابھرنا اور انسانی شعور کا آگہی حاصل کرنا مسلسل آگے کی جانب ایک سفر ہے جس کے نتیجے میں انسانی سماج موجودہ حالت تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہیگل نے کہا تھا کہ ''انسان نے غلامی 'سے' آزادی حاصل نہیں کی بلکہ غلامی 'کے ذریعے' آزادی حاصل کی''۔ اس تمام عمل میں مختلف ادوار میں سماج کی مخصوص کیفیات اور شکلوں کا ابھرنا اور مختلف فلسفوں کا آنا ناگزیر تھا گو کہ اس میں انسانوں کی عظیم شعوری کاوشوں کا بھی فیصلہ کن حصہ ہے۔ لیکن مارکسزم ہیگل کے نظریات کی حدود کو توڑتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ یہ سب کسی آفاقی یا مطلق شعور کے باعث نہیں ہو رہا اور نہ ہی کوئی مطلق شعور اپنے آپ کو انسانی تاریخ میں اجاگر کر رہا ہے بلکہ تاریخی مادیت کے مطابق یہ سب انسان اپنی حقیقی آزادی کے حصول کے لیے کر رہا ہے اور اسی کے لیے اسے اتنے کٹھن رستے سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ عینیت پرستی کی غلط بنیادوں کے باعث ہیگل اس کا درست جواب نہیں دے سکا لیکن مارکس جدلیاتی مادیت کی بنیاد پر اس تاریخی ارتقائی عمل کا جواب دیتا ہے۔

''کمیونزم تاریخ کی پہیلی کا جواب ہے۔''(مارکس، 1844ء کے معاشی اور فلسفیانہ مسودات)

پتھر کا دور

فریڈرک اینگلز نے اپنی عظیم تصنیف ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز'' میں انسانی تہذیب کے آغاز تک کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ عہد وحشت، عہد بربریت اور تہذیب کا عہد ہیں۔

''عہد وحشت جس میں انسان قدرت کے خزانے سے زیادہ تر وہی چیزیں لیتا تھا جو کھانے پینے کے لئے تیار ملتی تھیں۔ انسان زیادہ تر ایسے اوزار تیار کرتا تھا جن سے ان چیزوں کو لینے میں آسانی ہو۔ عہد بربریت جس میں انسان نے مویشی پالنا اور کھیتی کرنا یعنی اپنی محنت سے قدرت کی زرخیزی کو بڑھانے کا طریقہ سیکھا۔ تہذیب کا عہد جس میں انسان نے قدرت کی نعمتوں سے مزید کام لینا سیکھا اور صنعت وحرفت اور فنون کی واقفیت حاصل کی۔'' (اینگلز، خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز)

اینگلز نے یہ نتائج مارگن کی تصنیف ''قدیم خاندان'' سے اخذ کیے تھے۔ اس وقت تک آثار قدیمہ کی سائنس کے پاس اس کے ثبوت نہیں تھے لیکن اینگلز نے اپنے فلسفے کی بنیاد پر ان کو یہ ترتیب دی تھی۔ اینگلز نے لکھا تھا:

''مارگن پہلا شخص ہے جس نے ماہر گن کی گہری واقفیت کے ساتھ انسان کے ماقبل تاریخی دور میں ایک مخصوص نظم وترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سوائے اس صورت کے جبکہ مزید اہم مواد ملنے کی وجہ سے تبدیلیاں کرنا ضروری ہو جائے، امید کی جاسکتی ہے کہ اس نے جو درجہ بندی کی ہے وہ قائم رہے گی''۔ (اینگلز، خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز)

بیسویں صدی میں آثار قدیمہ میں اہم پیش رفت ہوئی لیکن اس کے باوجود اس ترتیب کو ابھی تک بدلا نہیں جا سکا۔ جدید دور کے آثار قدیمہ کے ماہرین انسانی تاریخ کی درجہ بندی کو 'Paleolitihic' یا پتھر کا قدیم دور، 'Neolithic' یا پتھر کا جدید دور اور انسانی تہذیب کے آغاز پر کانسی اور لوہے کے دور میں ترتیب دیتے ہیں۔ یہ ادوار اینگلز کے ترتیب دیے گئے ادوار کے عین مطابق ہیں۔ بیسویں صدی میں آثار قدیمہ کے عظیم ماہر اور آسٹریلوی مارکسسٹ گورڈن

چلڈے نے آخری دو ادوار کو Neolithic Revolution یا پتھر کے جدید دور کا انقلاب اور Urban Revolution یا شہری انقلاب کہا۔

چین میں پتھر کے قدیم دور کے جو آثار ملے ہیں ان کے مطابق یہاں دس سے بارہ لاکھ سال قبل انسان موجود تھے لیکن پتھر کے جدید دور کا انقلاب یا Paleolithic Revolution کا آغاز دس ہزار سال قبل مسیح میں ہوتا نظر آتا ہے۔ چین میں باجرے اور جوار کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ 7 ہزار قبل مسیح میں استعمال ہونا شروع ہوئے۔ Ningxia میں دامیدی کے مقام پر غاروں کے اندر ملنے والی لکھائی پانچ سے چھ ہزار سال قبل مسیح کی ہے۔ سوویت ماہر نباتیات نکولائی ویوی لوف نے پودوں کی کاشت کے آغاز کے متعلق اہم تحقیق کی تھی۔ ان کی تحقیق کے مطابق پودے بے ترتیب انداز میں دنیا میں کہیں بھی کبھی بھی انسانوں کے استعمال میں نہیں آتے بلکہ مخصوص خطے ہیں جہاں مخصوص پودے انسان کے استعمال میں آنا شروع ہوئے۔ اس تحقیق کے مطابق دنیا میں کاشت کیے جانے والے پودوں کے آغاز کے آٹھ مراکز ہیں۔ چین ان میں سے سب سے بڑا مرکز ہے جہاں کاشتکاری کے لیے 136 مختلف مقامی نباتات کا آغاز ہوا۔ ان میں باجرے کی مختلف اقسام سے لے کر آڑو، لیچی، چیری، پیاز، گوبھی، گنا، افیون اور دیگر بہت سی نباتات شامل ہیں۔

نیولتھک انقلاب یا زرعی انقلاب کے لیے کاشتکاری بنیادی شرط تھی۔ اس سے پہلے انسان لاکھوں سال تک جنگلوں میں بھٹکتا رہا اور مچھلی یا جانوروں کے شکار یا درختوں کے پھل پر زندگی گزارتا رہا۔ زراعت سے آشنائی حاصل کرنے کے بعد ہی انسان خانہ بدوشی کی بجائے کسی ایک جگہ پر مستقل سکونت اختیار کر سکتا تھا۔ زراعت کے باعث ہی آبادی میں اضافہ بھی ممکن تھا کیونکہ جنگلوں میں شکار کے دوران بچے اضافی بوجھ محسوس ہوتے ہیں جبکہ زراعت کے لیے زیادہ بچے زیادہ پیداوار کے حصول کے لیے مددگار بنتے ہیں۔ گورڈن چلڈے لکھتا ہے،

''پہلے انقلاب کے بعد ہی ممکن تھا کہ ہماری نسل واقعی تیزی سے پھیلنے لگی۔'' (گورڈن چلڈے، انسان خود کو بناتا ہے، صفحہ 71)

آثار قدیمہ کی مختلف تحقیقات کے مطابق جانوروں اور پودوں کو انسان کے استعمال میں لانے کا عمل بارہ ہزار سال قبل شروع ہوا۔ لیکن نیولتھک انقلاب صرف یہاں تک محدود نہیں۔ اس انقلاب کے باعث خانہ بدوش انسانوں نے مل کر گاؤں اور چھوٹے قصبے آباد کیے۔ ان سماجوں میں

انسان نے جنگل کاٹ کر اپنی رہائش کا سامان کرنا شروع کیا اور آبپاشی کا بھی آغاز ہوا۔ جب انسان جنگل میں رہتا تھا اس وقت بھی اس نے مستقل سکونت کے لیے آبادیاں بنائی ہوئی تھیں، اس لیے مستقل سکونت کا آغاز نیولتھک انقلاب سے نہیں جڑا لیکن اس انقلاب کے بعد انسانی سماج میں ایک معیاری جست لگی اور انسانی تہذیب کے آغاز کی جانب ایک فیصلہ کن سفر کا آغاز ہوا۔

چین میں پتھر کے جدید دور کے انقلاب یا نیولتھک انقلاب کے بعد ہوانگ ہو یا زرد دریا کی وادی میں 3 ہزار سے 5 ہزار قبل مسیح کے دوران یانگ شاؤ (Yangshao) تہذیب پروان چڑھنا شروع ہوئی اور دیہات آباد ہونا شروع ہوئے۔ بعد ازاں یانگ شاؤ تہذیب کی جگہ لانگ شن (Longshan) تہذیب نے لے لی جو زرد دریا کی وادی میں 2 ہزار قبل مسیح تک رہی۔ لانگ شن عہد میں برتن بنانے کے فن میں خاص طور پر مہارت حاصل کی گئی اور اس کے لیے پہیہ استعمال کیا گیا۔ اس دور کی اہم نشانی پالش والے کالے برتن ہیں۔ یہ برتن یانگزے دریا کی وادی میں بھی ملے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہ تہذیب چین کے دور دراز کونوں تک پھیل چکی تھی۔ اس دور میں چاول کی کاشت کا آغاز ہو چکا تھا اور چھوٹے پیمانے پر ریشم بھی تیار ہو رہی تھی۔ اس دور میں چین کی آبادی اپنے عروج پر تھی لیکن اس عہد کے اختتام تک آبادی تیزی سے کم ہوتی گئی۔

اس عہد کے بعد کانسی کے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ گورڈن چلڈے کانسی اور لوہے کے عہد کو مشترکہ طور پر شہری انقلاب (Urban Revolution) کا عہد کہتا ہے۔

''6 ہزار سے 3 ہزار سال قبل مسیح تک انسان نے ہوا اور بیلوں کی طاقت کو قابو میں کر لیا تھا۔ اس نے ہل ایجاد کر لیا تھا، پہیے والی ریڑھی بنالی تھی، کشتی رانی سیکھ لی تھی، اس نے تانبے کے پگھلانے کے عمل میں شامل کیمیائی عمل دریافت کر لیے تھے، دھاتوں کی مادی خصوصیات کو جان لیا تھا اور اس نے ایک درست شمسی کیلنڈر بھی بنالیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو شہری زندگی کے لیے تیار کر لیا تھا اور ایک ایسی تہذیب کی تیاری کر رہا تھا جہاں تحریر کی، حساب کتاب کی ضرورت ہوگی، وزن کے معیار چاہیے ہوں گے، علم کو پھیلانے کے اوزاروں کی ضرورت ہوگی اور درست سائنس کی بھی۔ گیلیلیو کے وقت (نشاۃِ ثانیہ) سے پہلے تک تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جہاں علم میں اتنی تیز ترقی ہوئی ہو اور اتنی بڑی دریافتیں اتنی بڑی تعداد میں ہوئی ہوں۔'' (گورڈن چلڈے،

انسان خود کو بناتا ہے، صفحہ 105)

شہری انقلاب

چین کی قدیم تاریخی کتابوں میں اس عہد کے حوالے ملتے ہیں لیکن ابھی تک اس پر ماہرین آثارِ قدیمہ اور مؤرخین کی کوئی متفقہ رائے سامنے نہیں آسکی۔ ماؤ عہد میں جب مارکسزم کو ایک قنوطی نظریے کے طور پر مسخ کیا گیا اس وقت اس عہد کو غلام داری عہد قرار دیا گیا۔ بورژوا مؤرخین اس عہد کو Xia اور Shang خاندانوں کی بادشاہت کا عہد قرار دیتے ہیں۔ گو کہ ابھی تک اس پر بھی متفق نہیں ہوا جاسکا کہ اس عہد میں کوئی بادشاہت تھی بھی یا نہیں۔ دریافت ہونے والے آثار کے مطابق اس عہد میں کانسی کا استعمال بہت زیادہ تھا اور لوہے کا استعمال اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہو رہا تھا۔

تاریخ کی کتابوں کے حوالوں کے مطابق دیومالائی ژیاء خاندان کی بادشاہت کا دور 2100ء سے 1600ء قبل مسیح تک کا ہے۔ چین کے ہینان صوبے سے ملنے والے اس دور کے آثار کو اس دیومالائی بادشاہت کے عہد سے منسلک کیا گیا ہے۔ اسی طرح Shang بادشاہتوں کا دور 1600ء سے 1046ء قبل مسیح تک بتایا جاتا ہے۔ اگر اینگلز کی بنائی ہوئی ترتیب کو بنیاد بنایا جائے تو یہ انسان کا عہد وحشت اور عہد بربریت سے تہذیب میں قدم رکھنے کا عہد ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دور میں اچانک ایک ریاست نمودار ہوگئی تھی اور ایک بادشاہ سماج پر مسلط ہو گیا تھا جیسا کہ حکمرانوں کے مؤرخین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا بیان کرنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ تاریخ کو جامد اور ساکت دیکھنے کے علاوہ مختلف ادوار کو ایک دوسرے سے کاٹ کر دیکھتے ہیں۔ مارکسزم تاریخ کو ایک تسلسل میں اور مسلسل تبدیلی کے عمل میں دیکھتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی تہذیب کے آغاز کے مراحل میں انسان نے جب مل جل کر رہنا شروع کیا تو علم اور فنون نے تیز ترین ترقی کی۔ ایسے میں اس وقت کی ریاست کو مکمل بادشاہت اور مطلق العنانیت قرار دینا بھی ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس عہد میں زمین کی نجی ملکیت کے متعلق بھی مکمل شواہد نہیں ملتے لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ زمین مشترکہ ملکیت میں ہی ہوگی۔ چین میں بہت ہی تاخیر سے تمام زمین کو بادشاہ کی ملکیت قرار دیا گیا۔

شینگ عہد میں چینی رسم الخط کی ابتدا ملتی ہے اور اس دور کی ایسی بہت سی ہڈیاں ملی ہیں جن پر مختلف اشکال تحریر کی صورت میں لکھی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ چینی رسم الخط انہی اشکال کی

ترقی یافتہ شکل ہے۔اس عہد میں کانسی کے برتنوں میں مہارت حاصل کی گئی اور کانسی کے ہتھیار بھی بنائے گئے۔اتنے بڑے پیمانے پر پیداوار کے لیے محنت کشوں کی بڑی تعداد کی ضرورت تھی جو کان کنی سے لے کر ان دھاتوں کی ٹرانسپورٹ بھی کر سکتے۔کانسی کے ہتھیاروں کے ساتھ اس عہد میں پتھر کے ہتھیار بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے اور ان کا استعمال بھی جاری تھا۔چین میں شینگ عہد کی سب سے زیادہ باقیات موجودہ ہینان میں واقع آنیانگ میں ملی ہیں جسے اس دور کا دارالحکومت بھی کہا جاتا ہے۔بورژوا مؤرخین کے مطابق شینگ عہد میں 31 بادشاہوں نے حکومت کی اور دارالحکومت کو چھ مرتبہ تبدیل کیا گیا۔

اس داستان میں شینگ کے بعد ژاؤ خاندان کی حکمرانی کا عہد آتا ہے جو 1046ء سے 256ء قبل مسیح کے عرصے پر محیط ہے۔اس عہد میں ژیان اور لیوبینگ شہر دارالحکومت تھے۔ژیان شہر آج بھی چین میں سیاحوں کا مرکز رہتا ہے اور قدیم تاریخ کے بہت سے اہم موضوعات کا آغاز یہاں سے ملتا ہے۔ایسے شواہد ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ژاؤ عہد میں کانسی کے استعمال کی مہارت میں کمی آئی تھی لیکن شینگ عہد کے لوگ کانسی کو زیادہ ماہرانہ انداز میں استعمال کرنا جانتے تھے۔ژاؤ عہد کے آنے پر شینگ عہد میں ہونے والی مظاہر پرستی کا بھی خاتمہ ملتا ہے۔

''ژاؤ کے آنے کے ساتھ ہی شینگ کی مظاہر پرستی ختم ہوگئی گو کہ آباؤ اجداد کی پوجا جاری رہی۔(رے ہوانگ، A Macro History of China، صفحہ 16)

ژاؤ عہد میں زراعت اور آبپاشی کے نظام کو fengjian (فینگ جیان) کہا جاتا ہے جس کا ترجمہ جاگیرداری کیا جاتا ہے۔بعض مؤرخین کے مطابق یہ غلط ترجمہ ہے اور fengjian جاگیرداری سے بالکل مختلف ایک زرعی طریقہ کار تھا۔

ژاؤ خاندان کے علاوہ اس عہد میں بہار اور خزاں کے عہد کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو 722ء سے 476ء قبل مسیح تک جاری رہا۔اس دوران مختلف مقامی قبائل کی باہمی لڑائیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں شمال مشرق سے کوئن قبیلے کے افراد حملہ آور ہوئے اور ژاؤ خاندان کو اپنا دارالحکومت تبدیل کرنا پڑا۔بورژوا مؤرخین ان لڑائیوں کو بھی بادشاہوں اور اقتدار کی جنگیں بنا کر پیش کرتے ہیں جبکہ اس عہد میں اگر نجی ملکیت کی کیفیت اور معاشرے میں موجود طبقات کے باہمی تعلق کو دیکھیں تو ان جنگوں کی بنیاد زیادہ تر اشیائے ضرورت کا حصول اور آبادی کا پھیلاؤ زیادہ نظر آتا ہے۔اس عہد کے بارے میں بادشاہوں کے بہت سے مشہور قصوں کی تصدیق ہونا ابھی باقی ہے۔

ژاؤ عہد کا زوال اور اختتام ایک بہت بڑی سماجی تبدیلی کے اختتام کا عہد تھا۔

''آبادی میں اضافہ ژاؤ عہد کی مقررہ مقداری ترتیب کے انتظام کی حدود کو توڑ رہا تھا جس کے باعث ہر شے کا باہمی تعلق برقرار رکھنا ممکن نہیں تھا۔ نئے حالات میں پرانا انتظام نہیں چل سکتا تھا۔۔۔ پیداواریت میں اضافہ ہوا، کانسی کے سکے گردش میں آئے۔۔۔ سیاسی فلسفے کی زرخیزی اور تنوع اتنے عروج پر پہنچ گئے کہ چین کے ذہنی اثاثے اگلے دو ہزار سال تک اس نہج تک نہیں پہنچ سکے''۔ (ایضاً، صفحہ 20)

چینی فلسفے میں دانشوری کے سوسکولوں کا عہد بھی ہے جبکہ کنفیوشس، تاؤ، لیگل ازم، مینی کس اور موہزم کے فلسفوں کا بھی یہی عہد ہے۔ اس کے بعد باہمی ریاستی جنگوں کا عہد آتا ہے جو 476ء سے 221ء قبل مسیح کے عہد تک محیط تھا۔

یہ عہد چین میں لوہے کے عہد کا بھی ہے۔ چین میں لوہے کا عہد 600ء سے 200ء قبل مسیح کا دور ہے۔ وادی یانگزی میں لوہے کی اشیا کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح میں ملتا ہے۔ گوانگ ڈونگ میں لوہے کے استعمال کا آغاز 350 قبل مسیح میں ملتا ہے۔

چین میں سلطنت کے آغاز کا عہد (چینی شہنشاہیت) کوئن خاندان سے منسوب کیا جاتا ہے جو مؤرخین کے مطابق 221ء سے 206ء قبل مسیح تک حکومت کرتا رہا۔ اس خاندان نے لیگل ازم کے فلسفے کے تحت ایک سخت گیر قانون متعارف کروایا جس میں بادشاہ مطلق العنان قرار دیا گیا اور ایک مرکزی حکومت قائم کی گئی۔ چین کی دوبارہ جڑت اسی عہد میں ممکن ہوئی۔ کوئن بادشاہوں نے انہی سخت گیر قوانین کے تحت اپنے مخالفین کو خاموش کروایا اور کتابوں اور دانشوروں کو زندہ جلایا۔ دیوار چین کی تعمیر کا آغاز بھی اسی عہد میں کیا گیا۔ اسی عہد میں چینی رسم الخط کا باقاعدہ آغاز ہوا، وزن کے معیار طے ہوئے اور کرنسی کا اجرا ہوا۔ یہاں تک کہ بیل گاڑی کے پہیوں کے مابین فاصلے کا تعین کیا گیا تاکہ وہ بنائے گئے رستوں کے مطابق ہوں۔ اسی طرح پوری سلطنت میں یکساں تجارتی نظام متعارف کرایا گیا۔

اس عہد میں ہونے والی بے پناہ ترقی ذرائع پیداوار میں نمایاں تبدیلی کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اتنے وسیع پیمانے پر ریاست کا قیام اور انتظام سماج میں ہونے والی ایک بنیادی تبدیلی کی غمازی کرتا ہے۔ ہندوستان میں موریا سلطنت اور اشوکا کا عہد بھی تقریباً اسی دوران نظر آتا ہے جو 269ء سے

232ء قبل مسیح تک حکمران رہا۔ اس کے عہد میں پہلی دفعہ پورے ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت قائم ہوئی جس نے چین کے کوئن شی ہوانگ کی طرح علم وفنون کو بڑے پیمانے پر ترقی دی۔ اسی عہد میں ہی ہندوستان میں چانکیہ کی ریاست کے انتظام سے متعلق کتاب بھی منظر عام پر آتی ہے جس میں انتہائی گہری تفصیل میں ریاست کے منتظمین کو ہدایات جاری کی گئی ہیں۔

ہندوستان اور چین میں اس عہد کے دوران اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی تبدیلیوں کو ذرائع پیداوار کی تبدیلیوں کے ساتھ جڑت میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ لیکن اگر آثار قدیمہ کی دریافتوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ عہد ایک مخصوص عہد کے اختتام اور ایک نئے کے آغاز کا عہد تھا۔ اس بات کے قوی امکانات موجود ہیں کہ پرانے عہد کے اختتام کے بعد ذرائع پیداوار میں نمایاں تبدیلی کے باعث ہی اتنی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں۔ ہندوستان میں موریا سلطنت کا آغاز جہاں اسکندر کی ہندوستان میں فتوحات کے انجام کے بعد شروع ہوا وہیں پر اس موریا سلطنت کی شروعات اس پرانے کے عہد کے زوال کے دوران ہوئی تھی۔ چین میں بھی ایسی ہی طرز نظر آتی ہے۔

مضبوط مرکزی حکومت کے قیام اور ضرورت کی ایک اور وجہ آبپاشی کا نظام بتایا جاتا ہے۔ چین میں زرد دریا میں سیلابوں کی ایک اپنی تاریخ ہے اور یہ مسلسل اپنے کناروں سے باہر نکل کر تباہی مچاتا رہتا ہے۔ صرف 1949ء کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد ایک منصوبہ بند معیشت کے ذریعے ہی ان سیلابوں پر مستقل قابو پانے کی منصوبہ بندی کا آغاز ہوا۔ لیکن قدیم چین میں ان سیلابوں کی روک تھام اور ان کے آگے بند بنانے کے لیے ایک مرکزی حکومت کی ضرورت تھی۔ بہت سے بادشاہوں نے لاکھوں افراد کو جبری طور پر معمور کر کے بڑے ڈیم اور نہریں بنوائیں۔ سیلاب کی تباہ کاریوں سے نجات کے لیے تباہ حال عوام مرکزی حکومت کی جانب ہی دیکھتے تھے اور اسے ہی ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔

''جب ژاؤ بادشاہ یہ کام نہیں کر سکے تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلا نے مضبوط مرکز کے لیے مزید دباؤ ڈالا۔ قدرتی طاقتیں چین کو ایک قومی یکجہتی کی جانب دھکیل رہی تھیں۔'' (ایضاً، صفحہ 24)

سیلابوں کے علاوہ چین کی تاریخ میں ایک اہم عنصر قحط سالی ہے۔ چین میں زیادہ تر بارشیں

مخصوص موسم میں ہوتی ہیں۔ 80 فیصد بارش گرمی کے تین ماہ میں ہوتی ہے اور انہی تین ماہ میں ہوا کا رخ بھی تبدیل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ مون سون کی بارشوں کا بھی ایک مخصوص چکر ہے۔آبپاشی کا مؤثر نظام نہ ہونے کے باعث موسموں کی تبدیلی کروڑوں لوگوں کی زندگیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔1911ء کے بورژوا انقلاب سے قبل چین کے تاریخی ریکارڈ کے مطابق یہاں 2117 سالوں میں 1621 بڑے سیلاب اور 1392 قحط آئے۔ان قدرتی آفات کے باعث ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے خوراک کے ذخیروں اور فصلوں پر حملہ آور ہوتے جس سے جنگوں کا آغاز ہوتا۔

چینی سلطنت کی بنیاد رکھنے والے اور 221ء قبل مسیح میں چین کو یکجا کرنے والے کوئن خاندان کے بادشاہ کوئن شی ہوانگ کی ایک اور خاص بات پکی مٹی کی فوج ہے۔1974ء میں ماہرین آثار قدیمہ نے اس بادشاہ کے مزار کے قریب ایک بہت بڑی دریافت کی جہاں تین ایکڑ کے رقبے پر پھیلی ایک عمارت میں مٹی کے بنے ہوئے سپاہیوں کی پوری فوج کھڑی ہے۔اندازے کے مطابق 7 ہزار فوجیوں کے مجسمے جوان کے اصل قد اور جسامت کے مطابق بنائے گئے ہیں وہاں موجود ہیں۔ان کے پاس موجود تمام ہتھیار اصلی ہیں۔سپاہیوں کے مجسمے اصل افراد کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں اور کوئی بھی دو مجسمے ایک جیسے نہیں۔ان تمام کا بالوں کا انداز ایک جیسا ہے، لیکن ہر ایک کی بالوں میں کنگھی مختلف طریقے سے ہوئی ہے۔ان کی بیلٹ میں دھات کے ہک لگے ہیں اور جوتوں کے تلوے میں پھنی لگی ہیں۔پیدل فوجی اور گھڑسوار کی وردیوں میں بھی فرق ہے۔دھات کا کام بہت گہرائی سے کیا گیا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے پر نقش ونگار بنے ہیں۔مختلف فوجیوں کے انداز بھی مختلف ہیں۔بہت سے سیدھی پوزیشن میں ہیں، کچھ گھٹنوں کے بل تیر اندازی کے لیے جھکے ہیں، کچھ رتھ چلا رہے ہیں اور اسی طرح پوری فوج حقیقی جنگ کا منظر پیش کر رہی ہے۔ایک اندازے کے مطابق اس بادشاہ کا مزار تعمیر کرنے میں 36 سال لگے اور اس میں سات لاکھ محنت کشوں نے حصہ لیا گو کہ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔مؤرخین اس بات پر حیران ضرور ہیں کہ اس بادشاہ نے مصر اور ہندوستان کے بادشاہوں کی طرح اپنے مزار کی حفاظت کے لیے دیوتاؤں کے دیوہیکل مجسمے کیوں نہیں بنوائے؟اس سے چین کی تاریخ میں مذہب کے کردار کی بھی معلومات ملتی ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ مذہبی روایات چین میں دیگر خطوں کی طرح کبھی بھی مضبوط نہیں رہیں۔

ہان خاندان

کوئن خاندان کے زوال اور خاتمے کے صرف ایک دہائی بعد ایک نئے خاندان کی حاکمیت نظر آتی ہے جس نے آئندہ چار سو سال تک چین پر حکمرانی کی۔ یہ سلطنت 200 سال قبل مسیح سے 200ء بعد از مسیح تک جاری رہی۔ اس سلطنت کو مغرب میں سلطنت روم کے مقابل قرار دیا جاتا ہے۔ گو کہ سلطنت روم کی بنیاد غلام داری نظام پر تھی، ہان خاندان زرعی پیداوار پر انحصار کرتے ہوئے چین کو غلام داری کے عہد کی جانب نہیں لے جا سکا۔ بورژوا مؤرخین اسے جاگیرداری کا عہد کہتے ہیں لیکن چین کا اس عہد کا نظام مغربی سماجوں کی طرح جاگیردارانہ سماج نہیں تھا گو کہ اس کی بنیاد زراعت پر ہی تھی۔ اس لیے اس کو ایشیائی طرز پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ بعض مؤرخین نے اسے ''Tributary Mode of Production'' یا باج گزار طرز پیداوار کہا ہے۔ مارکس اور اینگلز نے کچھ مقامات پر جہاں ایشیائی طرز پیداوار کی اصطلاح استعمال کی وہاں انہوں نے ''Oriental Despotism'' کی اصطلاح کو بھی استعمال کیا جو اس عہد کے سیاسی ڈھانچے کی وضاحت کرتی ہے۔ لیکن قدیم چین اور ہندوستان کے سماج کی ریاستوں کے تجزیے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مغرب میں جاگیرداری اور پھر سرمایہ داری کا ظہور اس لیے بھی ممکن تھا کہ وہاں زرعی بنیادوں پر ریاست اتنی وسیع اور مضبوط نہیں تھی جتنا کہ چین اور ہندوستان میں۔ اس لیے سرمایہ دارانہ انقلابات کے یورپ میں ابھرنے کی ایک وجہ وہاں کی پسماندگی بھی تھی اور ایشیائی ممالک کے مضبوط بیوروکریٹک ڈھانچوں اور ریاستوں اور ایشیائی طرز پیداوار ''Oriental Despotism'' کے ارتقا میں سست روی کی وجہ سے سماجوں کی مقداری تبدیلی کا عمل ظاہری طور پر جمود کا شکار ہو گیا تھا۔ اس سے جدیدیت کی معیاری معاشرتی تبدیلی تاخیر زدہ ہو کر رہ گئی اور یہاں سرمایہ داری پنپ نہیں سکی۔ یہاں کی مضبوط ریاستیں نئے جاگیردار، تاجر اور سرمایہ دار طبقات کے ابھرنے میں بھی رکاوٹ بنی رہیں۔

ہان خاندان کے بانی کوئن خاندان کے عہد میں معمولی سرکاری ملازم تھے یا کسان۔ کوئن خاندان کے مرکزی انتظامی ڈھانچے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس عہد میں پوری سلطنت میں بیوروکریسی کا مضبوط ڈھانچہ استوار ہوا جو آئندہ کئی صدیوں تک چین کے انتظامی امور کی نگرانی کرتا رہا۔ اتنی بڑی سلطنت کو براہ راست مرکز سے چلانا ممکن نہیں تھا اس لیے صوبوں میں وراثتی

طرز پر حکمرانی متعارف کرائی گئی اور علاقائی سطح پر حکمران خاندان وجود میں آنے لگے۔اس طریقہ کار سے بغاوتوں کے امکانات بھی بڑھنے لگے جنہیں ہان خاندان نے اپنی حکمرانی کے آغاز میں کامیابی سے کچل دیا۔اتنی بڑی ریاست کو چلانے کے لیے آمدن عوام پر ٹیکس لگا کر حاصل کی جاتی تھی۔چین دنیا کا واحد خطہ ہے جہاں قبل از مسیح کے عہد سے مرکزی حکومت کسانوں سے زرعی آمدن پر ٹیکس وصول کرتی رہی ہے۔ہان دور کے ایک اہم وزیر 'لی کیوی' کی ایک رپورٹ کے مطابق ''ایک کسان پانچ افراد کے گھرانے میں 11.4 ایکڑ کے رقبے پر کام کرتا ہے۔ہر فصل پر 1.5 سو وزنی معیار کا اناج پیدا کرتا ہے تو کل پیداوار 150 سو وزنی معیار ہوا۔زمین پر دس فیصد ٹیکس کے بعد 135 سو وزنی معیار کا اناج بچتا ہے۔''

اپنی زمینوں پر کام کے علاوہ کسان مقامی منڈی میں چھوٹا موٹا کاروبار بھی کرتے تھے اور اسی باعث وہ سود خوری اور دیگر مظالم کا بھی شکار رہتے تھے۔زمین کی پیداوار پر ٹیکس کے علاوہ گھر کے تمام افراد پر انفرادی ٹیکس بھی واجب الادا ہوتا تھا جو تانبے کے سکوں کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ اس طرح جو بھی کسان قرضوں کے بوجھ تلے دب کر یا سود کے خونی چکر میں پھنس کر برباد ہو جاتا تو اس کو اور اس کے پورے خاندان کو غلامی میں بیچا جا سکتا تھا۔لیکن اس صورت میں ان کے مالکوں کو ان کا ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا۔بیرونی جنگوں کا بہانہ بنا کر حکمران اپنی پرتعیش زندگیوں کو جاری رکھنے کے لیے ٹیکسوں میں اضافہ بھی کر دیتے تھے جس سے محنت کش عوام کی زندگیاں مزید اذیت کا شکار ہو جاتیں۔ہان دور میں کنفیوشس کے نظریات کو سرکاری سرپرستی ملی اور آنے والے سینکڑوں سالوں تک وہ چینی ثقافت پر حاوی رہا۔

چین کے شاہی خاندان

ہان کے بعد کا عہد ''وی'' اور ''جین'' کا عہد کہلاتا ہے جو 265ء سے 420ء تک جاری رہا۔اس عہد کی ابتدا میں چین تین ریاستوں میں تقسیم رہا جس کی وجہ سے مرکزی ریاست ختم ہو گئی لیکن بعد ازاں 280ء میں 'جین' خاندان نے دوبارہ اسے مرکزی طور پر منظم کیا۔اس دوران ایک اور عہد ''وو ہو'' عہد کہلاتا ہے جو 304ء سے 439ء تک جاری رہا۔اس دوران چین ایک وقت میں سولہ ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جن میں ترکوں، منگولوں اور تبت والوں کے آباؤ اجداد کی ریاستیں بھی شامل تھیں۔420ء سے 589ء تک کا عہد جنوبی اور شمالی خاندانوں کی حکمرانی کا عہد

کہلاتا ہے۔اس عہد میں چین میں بدھ مت کے پھیلاؤ کا آغاز ہوا۔ان دو ریاستوں کو بالآخر 589ء میں ''سوئی'' خاندان کی فتوحات نے ختم کیا اور چین کو دوبارہ یکجا کیا۔سوئی خاندان کو چین کی اہم نہروں کی جبری تعمیر کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔اس دوران کئی دفعہ سینکڑوں میل لمبی نہروں کو لاکھوں محنت کشوں، جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں، نے چند ماہ میں مکمل کیا۔ان میں سے کچھ نہروں نے یانگزے اور زرد دریا کو آپس میں بھی جوڑا۔

اس خاندان کی حکمرانی 618ء تک جاری رہی جب تیانگ اشرافیہ کی حکمرانی کا آغاز ہوا تو وہ تین سو سال تک جاری رہی جب 907ء میں چین پانچ خاندانوں اور دس ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ تیانگ خاندان نے گزشتہ حکومت میں مکمل ہوئے بڑے منصوبوں سے استفادہ حاصل کیا۔اسی عہد میں گوانگ زو (کینٹون) اور قوان زو اہم بندرگاہوں کے طور پر ابھرے۔اسی دور میں چین کے تعلقات ہندوستان کے بادشاہوں سے بھی استوار ہوئے۔ایک واقعے کے مطابق ایک باغی کو آسام سے گرفتار کر کے سزا کے لیے ژیان پہنچایا گیا۔چینی بادشاہ کے دربار میں شامی، عربی، ایرانی اور دیگر علاقوں کے سفیر پیش ہوتے تھے۔جبکہ کوریا اور جاپان سے بھی ثقافتی تبادلہ زوروں پر تھا۔تاریخ میں اس خاندان کے زوال کے اسباب بھی یہی بتائے جاتے ہیں کہ جنگجو قبائل اقتدار میں آ کر عیش و عشرت کا شکار ہو گئے۔اس دور میں تھیٹر کو بھی عروج حاصل ہوا۔اسی عہد میں چین میں بدھ مت تیزی سے پھیلا اور ان کی رفتار اور دولت کے ارتکاز کے باعث حکمران خوفزدہ ہو گئے۔ 840ء میں ان کے خلاف اقدامات کیے گئے جس میں 4600 خانقاہوں کو تباہ کیا گیا جبکہ 260,500 بھگتوں کو جبری سیکولر بنایا گیا۔

960ء میں ''سونگ'' خاندان نے چین پر قبضہ کرتے ہوئے اپنی حکمرانی کا آغاز کیا جو 1234ء تک جاری رہا۔اسی دوران چین میں 'جین'، 'لیاؤ' اور مغربی ژیاء خاندانوں کی حکمرانی کا بھی عروج و زوال دیکھنے میں آیا۔سونگ کے بعد یوان خاندان 1271ء سے 1368ء تک برسر اقتدار رہا۔اس خاندان کی بنیاد چنگیز خان کے پوتے قبلائی خان نے رکھی۔اس نے بیجنگ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔منگولوں کی آمد سے قبل چین کی آبادی 12 کروڑ کے لگ بھگ تھی۔لیکن 1300ء کی مردم شماری کے مطابق چین کی آبادی چھ کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔آبادی کی کمی میں ایک وجہ منگولوں کا قتل عام بتائی جاتی ہے جبکہ بعض مؤرخین کے مطابق طاعون اور دیگر وبائیں آبادی میں کمی کا باعث بنیں۔کچھ دیگر مؤرخین کے مطابق منگولوں کا مردم شماری کا طریقہ کار ناقص

تھا جس کی وجہ سے آبادی کے حقیقی اعداد و شمار سامنے نہیں آسکے۔ ایک اندازے کے مطابق چین میں چودھویں صدی کے دوران طاعون سے ڈھائی کروڑ افراد ہلاک ہوئے جو چین کی آبادی کا 30 فیصد تھا۔ قبلائی خان نے جاپان پر بھی ایک ناکام جارحیت کی اور اسی جارحیت کے نتیجے میں جاپان میں کامی کازی (خودکش حملہ آوروں) کا تصور ابھرا۔

منگولوں کے خلاف عوامی نفرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ''مِنگ'' خاندان نے اس کو اکھاڑ کر 1368ء میں اپنی حاکمیت قائم کی جو 1644ء تک جاری رہی۔ مِنگ خاندان کی بنیاد رکھنے والا 'یوء یویان ژینگ' چین کی پوری تاریخ میں حکمران بننے والا سب سے نچلے درجے کا فرد تھا۔ 1344ء میں جب اس کے علاقے میں قحط آیا تو اس کا باپ اور بڑا بھائی چند ہفتوں میں ہی ہلاک ہوگئے۔ کفن کے پیسے نہ ہونے کے باعث یوء اور اس کے ایک بھائی نے انہیں اپنے ہاتھوں سے ہی دفنا دیا۔ اس کے بعد مستقبل کا یہ بادشاہ سولہ سال سے بھی کم عمر میں ایک بدھ خانقاہ میں مزدوری کرنے لگا۔ وہاں سے دربدر ہوکر وہ ہوائے دریا کے علاقے میں بھیک مانگتا رہا جہاں اس کی ملاقات کسان باغیوں سے ہوئی جو خفیہ تنظیمیں بنا کر بغاوت کی تیاری کررہے تھے۔ عسکری مہارت اور سیاسی ذہانت سے وہ بتدریج علاقے فتح کرتا رہا جس میں منگولوں کے زوال کے عہد کے معروضی حالات اس کی مدد کررہے تھے۔ 1368ء میں اس نے یانگزے دریا کے علاقے میں اتنی بڑی سلطنت بنالی تھی کہ اس نے مِنگ خاندان کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد منگول سلطنت حیران کن آسانی سے اختتام پذیر ہوگئی۔ اقتدار میں آنے کے بعد یوء نے 'نانجنگ' کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ بعدازاں اس خاندان کے تیسرے بادشاہ نے بیجنگ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس عہد میں تعمیر کیا گیا The Forbidden City ''شہرِ ممنوعہ'' آج بھی بیجنگ میں موجود ہے جسے بعد میں آنے والے بادشاہوں نے بھی بڑھایا۔ اس شاہی محل میں نو ہزار کمرے ہیں۔

اس خاندان کا خاتمہ 'مانچو' قوم نے کیا جنہوں نے 1644ء سے 1911ء تک چین پر حکومت کی۔ 'کوئنگ' خاندان کے نام سے چین پر حکومت کرنے والا یہ آخری 'کوئنگ' شاہی خاندان تھا۔ دس لاکھ آبادی کے اس مختلف قبیلوں کے اکٹھ نے چین پر ایک لمبا عرصہ حکومت کی۔ 1644ء میں اقتدار میں آنے سے صرف چند سال پہلے ہی 1635ء میں انہوں نے خود کو 'مانچو' کہلانا شروع کیا تھا۔ انہوں نے 'ہان' چینیوں پر مانچو قوانین لاگو کیے اور سرکاری اہلکاروں کو پابند کیا کہ وہ مانچو لباس پہنیں۔ نصف صدی میں انہوں نے مِنگ دور کا سارا چین اپنے قبضے میں کرلیا۔

اس کے علاوہ سنکیانگ، تبت اور منگولیا کو بھی چین میں شامل کر لیا۔ اپنے عروج پر کوئنگ بادشاہ دنیا کی ایک تہائی آبادی پر حکمرانی کر رہا تھا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی معیشت اور رقبے کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ 1840ء میں اسے برطانوی سامراج کے ہاتھوں پہلی افیون جنگ میں شکست ہوئی جس کے بعد معاہدے میں ہانگ کانگ برطانیہ کو دے دیا گیا اور برطانوی مقبوضہ علاقوں میں پیدا ہونے والی افیون کی چین میں درآمد کا آغاز ہوا۔ آخر کار اس خاندانی بادشاہت کو ایک انقلاب کے ذریعے اکھاڑ پھینکا گیا۔

قدیم چینی سماج

شہنشاہیت کے خاتمے سے پہلے تک کے ہزاروں سال سے قائم چینی سماج میں بظاہر تو شاہی خاندان بدلتے رہے لیکن عمومی خدوخال اور اقدار میں زیادہ بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ سرکاری سطح پر موجود انتظامی ڈھانچہ بھی کم و بیش اسی انداز میں کام کرتا رہا اور سماجی اقدار بھی بڑے پیمانے پر تبدیل نہیں ہوئیں۔ اس تمام کی بنیاد چین کی تہذیب کے آغاز میں ہی رکھی گئی تھی۔

چینیوں کے پاس کچھ قدیم قانونی دستاویزات ہیں جہاں سے ان کی تاریخ، آئین اور مذہب سے متعلق معلومات لی جا سکتی ہیں۔ ان کتابوں کو کنگ (King) کہا جاتا ہے اور یہ تمام علم کی بنیاد ہیں۔ ''شو کنگ'' میں ان کی تاریخ، قدیم بادشاہوں کی حکومتوں کے معاہدے اور وہ احکامات ہیں جو کسی مطلق العنان بادشاہ نے صادر کیے تھے۔ ''وائے کنگ'' میں اشکال ہیں جنہیں چینی تحریر کی بنیاد کہا جاتا ہے۔ اس کتاب سے چین میں مراقبے کا آغاز منسوب کیا جاتا ہے۔ اس فلسفے کا آغاز دوئی اور وحدت کی تجرید سے ہوتا ہے اور پھر اس میں مادی حقیقت کو مجرد (abstract) خیال سے سمجھا جاتا ہے۔ آخر میں ''شی کنگ'' آتی ہے جو قدیم نظموں کے تنوع کو پیش کرتی ہے۔ قدیم عہد میں ریاست کے اعلیٰ افسران کی ذمہ داری تھی کہ وہ سالانہ میلے پر اپنے صوبے میں پورے سال کے دوران ہونے والی شاعری ساتھ لے کر آئیں۔ بادشاہ اپنے دربار میں بیٹھ کر ان پر فیصلہ دیتا تھا اور اچھی سمجھی جانے والی شاعری کو عوامی قبولیت ملتی تھی۔

ان تین اہم کتابوں، جنہیں خاص طور پر عزت ملتی تھی اور پڑھا جاتا تھا، کے علاوہ دو اور قدرے غیر اہم کتابیں بھی تھیں۔ پہلی ''لی کنگ'' جو ایسے رواجوں اور رسموں کا مشاہدہ کرتی ہے جو بادشاہ اور ریاستی اہلکاروں کے رعب اور دبدبے کا باعث بنیں۔ اس کے ساتھ ضمنی طور پر ''یو کنگ'' ہے

جو موسیقی کے بارے میں ہے۔ دوسری ''شُن سَن'' جو ریاست لیو کا روزنامچہ ہے، جس ریاست سے کنفیوشس تعلق رکھتا تھا۔ یہ کتابیں چین کی تاریخ کی بنیاد ہیں اور قدیم عہد کا قانون اور روِش بھی۔

چین کی تہذیب دو دریاؤں ہوانگ ہو اور یانگزے کیانگ کے ساحلوں پر آباد ہے جہاں قدیم عہد میں بھی کروڑوں لوگ رہتے تھے۔ یہ لکڑی کے گھروں میں رہتے تھے جو ان کی زندگی کی ضرورت کے مطابق بنے ہوتے تھے۔ چینی تاریخ کا پہلا خطہ وہ شمال مغربی کونا ہے۔۔۔(اصل اور مرکزی چین Mainland China)۔۔۔ جہاں سے ہوانگ ہو دریا پہاڑوں سے اترتا ہے۔ بعد کے ادوار میں چینی بادشاہت جنوب میں دریائے یانگزے کیانگ کی جانب آئی۔ آبادی کے حجم اور ریاست کے منظم انتظامات، جو بہت گہری تفصیل تک جاتے ہیں، نے بہت سے یورپیوں کو حیران کیا۔ ایک اور حیرانگی کی بات ان کے تاریخی ریکارڈ کو درست انداز میں منظم کرنے کا ہنر ہے۔ چین میں مؤرخ ریاست کے اعلیٰ ترین اہلکار ہوتے تھے۔ دو وزیر بادشاہ کے پاس مسلسل حاضر رہتے تاکہ جو کچھ بادشاہ کرے یا کہے اس کا ریکارڈ رکھ سکیں۔ اس ریکارڈ کو پھر مؤرخ استعمال کرتے تھے۔

چین کی دیومالائی تاریخ جسے قدیم چینی مؤرخ تاریخ کا حصہ مانتے تھے، کے مطابق ''فوہی'' کو چین کی تہذیب کا بانی کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 29 ویں صدی قبل مسیح میں تھا یعنی شوکنگ کے آغاز سے بھی پہلے۔ دیومالا کے مطابق فوہی نے انسانوں کو گھر بنانے اور ان میں رہنے کی ہدایت کی۔ اسی نے ہدایت کی کہ وہ موسموں کی تبدیلی اور واپسی، تجارت، اشیا کے لین دین اور شادی پر توجہ دیں۔ اس نے بتایا کہ تعقل آسمان سے آیا ہے۔ اسی نے ہدایات کیں کہ ریشم کے کیڑے کو کیسے پالنا ہے، پل کیسے بنانے ہیں اور جانوروں کو کیسے اپنے استعمال میں لانا ہے۔

تاریخ شمال سے شروع ہو کر جنوب کی جانب آتی ہے جہاں چینی سلطنت کا آغاز ہوا۔ بتدریج عمل کے نتیجے میں بننے والی عظیم سلطنت جلد ہی کئی صوبوں میں ٹوٹ گئی جو ایک دوسرے سے لمبی جنگیں لڑنے لگے اور پھر دوبارہ ایک کُل میں جڑ گئے۔ چین میں حکمران خاندان اکثر تبدیل ہوتے رہے اور آخری شاہی خاندان بائیسواں تھا۔ ان خاندانوں کے عروج و زوال کے ساتھ ہی سلطنت میں پائے جانے والے مختلف دارالحکومت بھی ابھرتے اور گرتے رہے۔ ایک لمبے عرصے تک نانکنگ دارالحکومت رہا، پھر پیکنگ بنا، اس سے پہلے کے ادوار میں دوسرے

شہر بھی رہے ہیں۔چین تاتاریوں کے ساتھ بہت سی جنگیں لڑنے پر مجبور رہا، جو اس ملک کے اندر تک آ گئے تھے۔شی ہوانگ تی کے دور میں بننے والی لمبی دیوار چین شمالی خانہ بدوشوں کے حملوں کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی اور اسے ہمیشہ سب سے بڑے کارنامے کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔اس بادشاہ نے چین کو چھتیس صوبوں میں تقسیم کیا۔اس کی شہرت قدیم تصنیفات کو جلانے کے لیے ہے، خاص طور پر تاریخی کتابوں اور تاریخ کے علم پر۔اس نے یہ ظلم اپنے خاندان کی حاکمیت کو مضبوط کرنے کے لیے کیا تا کہ ماضی کی یادوں کو محو کر دیا جائے۔جب تاریخی کتب کو اکٹھا کر کے جلا دیا گیا تو سینکڑوں پڑھے لکھے لوگ پہاڑوں پر بھاگ گئے تا کہ جو کچھ بچ گیا ہے اس کو محفوظ کر لیا جائے۔ان میں سے جو کوئی بھی بادشاہ کے ہاتھ لگا اس کا حال بھی کتابوں جیسا ہی ہوا۔کتابوں کا جلانا اہم واقعہ ہے لیکن اس کے باوجود کچھ جید انسانوں نے انتہائی اہم کتابوں کو بچا لیا۔

قدیم چینی سماج کے طرز حکومت میں ملک کے عوام کو ایک خاندان کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔''شو کنگ'' میں پانچ ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا ہے جنہیں بنیادی اور کبھی نہ تبدیل ہونے والے تعلقات کہا گیا ہے۔

1۔شہنشاہ اور عوام کا باہمی تعلق
2۔باپ اور بچوں کا تعلق
3۔بڑے اور چھوٹے بھائی کا تعلق
4۔شوہر اور بیوی کا تعلق
5۔دوست اور دوست کا تعلق

اس فہرست میں چینی پانچوں کو بنیادی مانتے تھے۔ان کے ہاں فطرت کے پانچ عناصر تھے ہوا، پانی، مٹی، دھات اور لکڑی۔ان کے مطابق آسمان کے چار حصے اور ایک مرکز تھے۔مذہبی مقامات، جہاں قربان گاہ بنائی جاتی ہے، اس میں چار اونچائیاں اور ایک مرکز ہوتا تھا۔خاندانی ذمہ داریاں ادا کرنا لازمی تھا اور انہیں قانون کے ذریعے قائم کیا گیا تھا اور اسی کے ذریعے ہی منظم کیا جاتا تھا۔بیٹا باپ کو مخاطب نہیں کر سکتا تھا اور باپ کے کمرے میں آنے پر چپ چاپ ایک کونے میں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہنا ضروری تھا۔باپ کی مرضی کے بنا وہ کمرے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔جب باپ مر جائے تو بیٹے کے لیے لازمی تھا کہ وہ تین سال تک غم کی حالت میں رہے

جس میں وہ شراب اور گوشت نہیں استعمال کرسکتا تھا۔اس دوران لازمی تھا کہ جو بھی کاروبار وہ کر رہا تھا اس کو چھوڑ دے خواہ وہ ریاست کا ہی کام کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ بادشاہ بھی اگر اقتدار میں آجائے تو اس عرصے کے دوران اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کرسکتا تھا۔غم کے عرصے میں خاندان میں کوئی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔لیکن اگر مرنے والا پچاس یا اس سے زیادہ کی عمر کا ہو تو غم کی شدت میں کمی کی جاسکتی تھی اور ساٹھ سال یا اس سے تجاوز کرنے پر مزید نرمی ہوتی تھی۔ماں کو باپ کے برابر عزت ملتی ہے۔کسی کو کوئی اعزاز دینا ہوتا تھا تو اس کے باپ کا نام لے کر اعزاز دیا جاتا تھا نہ کہ اس کا۔اس شخص کے کارناموں کو بھی اس کے باپ کے کارنامے ٹھہرایا جاتا تھا۔

آئین کی بنیاد بھی خاندان ہی تھا۔گو کہ بادشاہ مطلق العنان تھا اور سیاسی نظام کی چوٹی پر بیٹھا تھا لیکن وہ اپنے اختیارات کو پدرانہ انداز میں استعمال کرتا تھا۔رسمی طور پر وہ خاندان کا بڑا تھا اور ریاست میں تعظیم کے لائق اگر کچھ بھی تھا تو وہ بادشاہ کے ساتھ جڑا تھا۔بادشاہ مذہبی معاملات اور سائنس دونوں کا سربراہ تھا۔

قدیم چین میں افراد اور گروہوں کے آزادانہ حقوق نہیں تھے،صرف سلطنت کے انتظامی امور کے متعلق زیادہ معلومات ملتی ہیں۔چین میں قانونی طور پر کوئی بھی شخص کسی اعلیٰ ترین سرکاری عہدے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا تھا۔سرکاری اہلکاروں کو چین میں ''مینڈرین'' (Mandarin) کہا جاتا تھا۔یہ دو قسم کے ہوتے تھے ایک فوجی اور دوسرے سویلین۔قدیم چین میں سویلین اہلکاروں کو فوجی اہلکاروں پر برتری حاصل تھی۔سرکاری اہلکاروں کو سکولوں میں تربیت دی جاتی تھی۔ بنیادی علم حاصل کرنے کے لیے ابتدائی تعلیمی سکول موجود تھے لیکن اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ادارے یا یونیورسٹیاں موجود نہیں تھیں۔جو اعلیٰ سرکاری عہدہ حاصل کرنا چاہتے تھے ان کو مختلف امتحانوں سے گزرنا پڑتا جو عام طور پر تین ہوتے تھے۔تیسرے اور آخری امتحان میں، جہاں خود بادشاہ موجود ہوتا،صرف وہی لوگ حصہ لے سکتے تھے جنہوں نے پہلے دو امتحان اعلیٰ درجے میں پاس کیے ہوں۔اس امتحان میں کامیابی کے بعد انعام کے طور پر سلطنت کی اعلیٰ ترین کونسل کا حصہ بننے کا موقع ملتا تھا۔امتحان پاس کرنے کے لیے جن مضامین میں علم ضروری تھا ان میں سلطنت کی تاریخ،قانون،رواج اور استعمال کی اشیا کی سائنس اور سرکاری انتظام اور تنظیم کا علم شامل تھے۔اس کے ساتھ ساتھ مینڈرین کے لیے اعلیٰ قسم کی شاعری کا ذوق رکھنا بھی ضروری

تھا۔ایک رومانوی ناول Ju-kiao-li (دوکزن) میں اس کا ذکر ملتا ہے۔
اس ناول میں ایک نوجوان کا کردار ہے جو اپنی تعلیم مکمل کر کے اعلیٰ سرکاری عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فوج کے افسران کے لیے بھی ذہنی معیارات مقرر تھے اور ان کے بھی امتحان ہوتے تھے لیکن سویلین اہلکار زیادہ عزت کے حقدار تھے۔انیسویں صدی میں جب چین کی آبادی پندرہ سے بیس کروڑ افراد پر مشتمل تھی پوری چینی ریاست میں اس وقت 15 ہزار سول اور 20 ہزار فوجی مینڈرین تھے۔ان اہلکاروں کو آٹھ درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔سب سے پہلے درجے پر وہ تھے جو بادشاہ کی خدمت میں ہوتے تھے، ان کے بعد ان کے نائب وغیرہ۔بادشاہ انتظامی اداروں کے ذریعے حکومت کرتا تھا جو زیادہ تر مینڈرین پر مشتمل ہوتی ہیں۔سلطنت کی کونسل سب سے بڑا ادارہ ہوتا تھا جو بظاہر سب سے ذہین اور قابل افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔اس میں سے ہی دیگر شعبوں کے سربراہ چنے جاتے تھے۔

ہر وزارت میں ایک محتسب (Ko-tao) ہوتا تھا جو بادشاہ کو ہر چیز کا حساب دیتا تھا۔یہ محتسب عہدے پر مستقل فائز رہتے اور ہر کسی کو ان کا خوف موجود رہتا تھا۔یہ حکومت سے متعلق ہر شے پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور مینڈرین کے نجی اور عوامی برتاؤ کا مشاہدہ کرتے اور اپنی رپورٹ فوری طور پر بادشاہ کو پیش کرتے۔چین کی تاریخ ان محتسبوں کے کارناموں اور جرات کی کئی مثالیں پیش کرتی ہے۔

سیلابوں، قحط سالیوں، وباؤں، سازش یا مذہبی خلفشار کی صورت میں مینڈرین حقائق کو بالائی ادارے تک فوری طور پر پہنچانے کے پابند ہوتے تھے اور ایسی صورت میں بغیر کسی حکم نامے کے خود سے عمل کرنے کے پابند ہوتے تھے۔پوری انتظامی مشینری ایک معین روٹین میں کام کرتی تھی۔امن کے حالات میں ان کی یہ خاصیت ایک پرآسائش عادت بن جاتی تھی۔

اگر انتظامیہ کے بعد قانون کا جائزہ لیں تو لگتا ہے کہ عوام سے نابالغ کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا، جو پدرسری طرز حکومت کے مطابق ہے۔ہندوستان کی طرح یہاں ذات پات کا نظام نہیں تھا اس لیے کوئی ایسی ذات نہیں تھی جس کے تحفظ کے لیے مخصوص قانون سازی کی جاتی۔تمام قانونی تعلقات کو مروجہ قوانین کے مطابق طے کیا جاتا تھا اور فیصلہ کرنے والا کسی بھی صورت اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ نہیں دے سکتا تھا۔

چین میں مذہبی سربراہ بھی بادشاہ ہی تھا اس لیے چین کا مذہب بھی سرکاری مذہب تھا۔قدیم چین کا مذہب دیگر تمام دنیا سے مختلف تھا۔صرف بادشاہ ہی آسمانوں تک رسائی حاصل کرسکتا تھا اور کسی بھی دوسرے فرد کو یہ مراعات حاصل نہیں تھی۔بادشاہ ہی تمام اہم مذہبی رسوم ورواج ادا کرتا تھا خواہ وہ فصل کی کٹائی سے متعلق ہوں یا پھر بوائی کے متعلق۔چین میں خدا کا تصور بھی دیگر دنیا سے بہت مختلف تھا۔آسمان (Heaven) کا لفظ جس چینی لفظ (Tien) کے ترجمے کے طور پر استعمال ہوتا ہے وہ کافی مجرد ہے اور اس کا معنی فطرت کے لفظ سے بہت قریب ہے۔مسیحی مشنریوں نے اس مخصوص چینی لفظ کے لیے 'Heaven' کی اصطلاح استعمال کی اور اسے عیسائی مذہب میں Heaven کی اصطلاح سے جوڑنے کی کوشش کی جو ایک بہت بڑی غلطی تھی۔'Tien' کے تصور کے مطابق افراد اور حکمران کے اچھے کام نعمتوں کا باعث بنتے ہیں اور برے کام بھوک اور عذاب لاتے ہیں۔قدیم چین کے مذہب کے مطابق انسانوں کا برتاؤ واقعات کا تعین کرتا تھا۔اگر حکمران ٹھیک کام کررہا تھا تو 'آسمانوں' کو خوشحالی کا حکم دینا ہوتا۔لیکن اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ 'آسمانوں' سے تعلق صرف بادشاہ کے ذریعے ہی بن سکتا تھا اور اسی لیے وہی تمام افراد کی خوشحالی کا ضامن بھی تھا۔

چین میں قدیم عہد کی ہڈیاں دریافت ہوئی ہیں جن پر مختلف اشکال ایک تحریر کی صورت میں موجود ہیں۔ہڈیوں کے اوپر تحریر کردہ ہر شکل کے ساتھ ایک خیال بھی جڑا ہے جسے ماہرین نے ڈی کوڈ کرلیا ہے۔ان اشکال کو تین اقسام میں ترتیب دیا گیا ہے۔پہلی قسم Pictogram کی ہے جس میں سورج یا چاند بنائے گئے ہیں۔دوسری قسم Ideogram کی ہے جس میں مختلف اشکال کو جوڑ کر ایک خیال بنایا گیا ہے۔مثال کے طور پر ایک شکل میں درخت کے پیچھے سے سورج ابھر رہا ہے، اس کا مطلب ہے مشرق۔تیسری قسم Homophone کی ہے جس میں ایسے خیالات شامل ہیں جنہیں اشکال سے واضح نہیں کیا جاسکتا۔مثال کے طور پر چینی بول چال میں انگریزی لفظ also کے لیے yi استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن اس کو شکل بنا کر لکھنا آسان نہیں۔لیکن چینی بول چال کا لفظ yi چینی میں 'بغل' کے لیے موجود لفظ کے قریب ہے۔اس لیے ملتی جلتی شکل سے اسے واضح کیا جاتا ہے۔انگریزی ترکیب 'To come' کو کسی شکل میں ڈھالنا بھی مشکل ہے لیکن چینی بول چال میں اس کے لیے lai بولا جاتا ہے جو ایک کھانے والا پودا بھی ہے تو اس کی شکل بنا دی جاتی ہے۔یہ اشکال جو کانسی کے عہد کے آغاز میں موجود تھیں آج بھی چینی رسم الخط کی بنیاد

ہیں۔ان تین اقسام کے علاوہ رسم الخط میں موجود اشکال انہی کی ترمیم شدہ، تبدیل شدہ یا اصلاح شدہ شکلیں ہیں۔چینی زبان آج بھی دنیا میں بولی جانے والی سب سے بڑی زبان ہے۔اس میں موجود ایک شاعرانہ حظ لکھنے والے اور پڑھنے والے کو خیال کی سطح پر انتہائی مضبوطی سے جوڑے رکھتا ہے کیونکہ رسم الخط الفاظ کے معنی واضح نہیں کرتا بلکہ قاری خود اپنے تخیل سے الفاظ کو جوڑتے ہوئے معنی پاتا ہے۔لیکن اس رسم الخط کی خامیاں بھی بہت ہیں۔دو الفاظ کو جوڑنے کے لیے حروف عطف (Conjuction) اور حروف ربط (Preposition) بہت کم ہیں۔اس لیے تجریدی خیالات کو تحریری صورت میں لانا انتہائی کٹھن ہے۔اس کے لیے ٹھوس عناصر کے معنی کو حد سے زیادہ کھینچنا پڑتا ہے۔اسی طرح Monosyllabic زبان کے باعث ہر لفظ کو ادا کرنے کے لیے مختلف آواز نکالنا ضروری ہے تاکہ دو مختلف الفاظ کا فرق سننے والا سمجھ سکے۔بہت سے دانشور اس میں آسانی پیدا کرنے کے لیے بولے جانے والے بہت سے الفاظ تحریر سے غائب کر دیتے ہیں۔اس سے تحریر تو جامع اور خوبصورت ہو جاتی ہے لیکن اس کو بول کر بتانا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔چینی رسم الخط قدیم چین میں علم کی ترقی میں ایک رکاوٹ رہا ہے کیونکہ یہاں خیال کو تحریر میں بیان کرنے کا موزوں طریقہ حاصل نہیں کیا جا سکا۔تحریری زبان اور بول چال کی زبان میں فرق ہے۔کیونکہ خیال کو انفرادی آوازوں کی علامتوں کو ملا کر نہیں لکھا جاتا بلکہ خیالات کو علامتوں کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔بظاہر دیکھنے میں اس کا بہت فائدہ نظر آتا ہے لیکن اس کے نقصانات زیادہ ہیں۔دیگر زبانوں میں انفرادی آوازوں کی علامتیں بنا کر حروف تہجی بنا دیے جاتے ہیں جنہیں جوڑ کر لکھا جا سکتا ہے اور انہیں پڑھا جائے تو ہر لفظ علیحدہ علیحدہ ادا ہوتا ہے جس سے خیال واضح ہو جاتا ہے۔لیکن چینی زبان میں حروف تہجی نہیں ہیں۔ہزاروں کے قریب علامات ہیں جنہیں ملا کر پڑھنے سے خیال واضح ہوتا ہے۔ایک دانشور اپنی پوری زندگی میں دس ہزار علامات سے کام چلا لیتا ہے جن کی کل تعداد اسی سے نوے ہزار تک ہو سکتی ہے۔ایک عام شخص اپنی زندگی میں تین ہزار الفاظ جان کر کام چلا سکتا ہے۔بول چال کی زبان میں ان علامات کی آوازوں میں انتہائی معمولی سی تبدیلی اس کا معنی تبدیل کر دیتی ہے۔ایک ہی علامت کو تیز یا آہستہ، اونچا یا نیچا ادا کرنے سے معنی بدل جاتا ہے۔چینیوں کے کان اس کے عادی ہو چکے ہیں اور وہ اس فرق کو سمجھ لیتے ہیں۔

قدیم چین میں فلسفے کا علم بھی موجود تھا جو وائے کنگ، جسے تقدیر کی کتاب بھی کہا جاتا ہے،

میں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں فلسفے کا بنیادی اصول تعقل (تاؤ) بتایا گیا ہے۔ لاؤ سے کی تصنیفات خاص طور پر اس کی کتاب Tao-te-king قدیم چین میں مشہور تھی۔ کنفیوشس اس فلسفی سے چھٹی صدی قبل مسیح میں ملا تھا تاکہ اس کی تعظیم کے متعلق اسے بتا سکے۔ تاؤ فرقے کے لوگ اس فلسفی کے پیروکار سمجھے جاتے ہیں۔ کنفیوشس چین کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے اور اسی نے کنگ کی اہم تصنیفات مرتب کیں۔ وہ یونانی فلسفی تھیلیز کا ہم عصر تھا۔ پہلے وہ وزیر تھا لیکن کسی وجہ سے وہ زیر عتاب آیا اور دربار سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے دوستوں کے درمیان رہا جو اس سے مشورہ طلب کرتے رہتے تھے۔ اس کی اپنے مقلدین سے گفتگو میں عام اخلاقی موضوعات ہی زیر بحث آتے تھے جو اس عہد میں کسی بھی جگہ پر ایسے ہی یا بہتر ہو سکتے تھے۔ ہیگل اس کے متعلق لکھتا ہے:

''وہ ایک ایسا شخص ہے جس کے پاس ایک خاص قسم کی عملی دانش اور دنیا کا تجربہ ہے، لیکن اس کے پاس کوئی فلسفہ نہیں۔ اس کی اپنی تصنیفات کے مطالعے سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کی شہرت کو دیکھتے ہوئے بہتر تھا کہ اس کی کتابوں کے (یورپی زبانوں میں) تراجم نہ کیے جاتے''۔ (ہیگل، فلسفے کی تاریخ)

چینیوں نے مقناطیس کی سائنس اور پرنٹنگ کا فن یورپ سے بہت پہلے حاصل کر لیا تھا لیکن اسے مخصوص مرحلے سے آگے ترقی نہیں دے سکے۔ قدیم چین میں طب، ریاضی، فلکیات اور دیگر بنیادی علوم سطحی درجے تک رہے اور وہ بنیادی نوعیت کے استعمال سے آگے ان علوم کو ترقی نہیں دے سکے۔ چینی برتنوں اور دھاتوں کا استعمال انتہائی نفیس انداز میں کرتے تھے جو مہارت بیسویں صدی تک بھی یورپ حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن قدیم چین میں مصوری کا فن بھی زیادہ ترقی نہیں پا سکا اور انیسویں صدی تک چینی مصور یورپی فن پاروں کی نقل تک ہی محدود رہے۔ ہیگل لکھتا ہے،

''چینیوں میں ایک عمومی خصوصیت ہے، نقل کرنے کی شاندار مہارت، جو روز مرہ زندگی میں ہی نہیں بلکہ فن میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ ابھی تک خوبصورت کو خوبصورت کے طور پر پیش کرنے کے قابل نہیں ہوئے کیونکہ ان کی مصوری میں سایہ اور تناظر ابھی نامکمل ہے۔'' (تاریخ کا فلسفہ)

ادب، فنون اور ثقافت

چین میں شاعری کی روایت بہت پرانی ہے۔ کلاسیکی کتابوں میں 'شی کنگ' کا نام بھی آتا ہے جسے کنفیوشس نے مرتب کیا اور اس میں ہزار سال قبل مسیح تک پرانی تین سو نظمیں ہیں۔ اس

کے بعد بھی چین میں شاعری کی روایت قائم رہی اور مختلف ادوار میں کی جانے والی لاکھوں نظمیں محفوظ ہیں۔ مشاعرے سماج کا ایک معمول تھے اور عمومی طور پر رات کے کھانے کے بعد مقامی گانوں اور شاعری کی محفلیں ہوتی تھیں۔ نثری ادب ایک لمبا عرصہ تک قدیم عہد کی فلسفیانہ بحثوں کے اثر میں دبا رہا۔ یورپ میں ناول کی آمد سے قبل ہی چین میں اس میدان میں کام شروع ہو چکا تھا۔ گو کہ یہ یورپ میں لکھے جانے والے ناولوں کے معیار تک نہیں پہنچ پائے لیکن اس کے باوجود چودھویں صدی کے بعد چین میں نثری ادب کے حوالے سے اہم پیش رفت ہوئی۔

چین میں تھیٹر کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے اور تھیٹر پر اداکاری قبل از مسیح سے ہی جاری تھی۔ تیانگ خاندان کے عہد میں تفریح کے لیے تھیٹر کو فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد میں مِنگ ہوانگ نامی ایک شخص نے اداکاری سکھانے کے لیے ایک سکول بنایا جس کا نام 'ناشپاتی کا باغ' رکھا۔ یہ ڈرامے زیادہ تر میوزیکل تھے۔ قدیم چین میں پتلی تماشوں کو بھی بہت مقبولیت ملی۔ مقبول زمانہ چینی اوپرا (Opera) کا آغاز سونگ بادشاہت میں ہوا لیکن اس کو عروج منگولوں کی حکومت کے عہد میں ملا جب یہ زیادہ منظم انداز میں دکھایا جانے لگا۔ اس دور کے اوپرا کو 'ژایو' کہا جاتا ہے۔ بعد ازاں یہ پورے ملک میں پھیل گیا اور اس کے مختلف علاقائی انداز ابھرنے لگے جن میں سب سے مشہور بیجنگ اوپرا ہے، جو آج بھی مقبول ہے۔

چین کی تاریخی ثقافت کا ایک اور انداز ژیانگ شینگ ہے جو یہاں کے بھانڈوں کے انداز سے ملتا ہے۔ طنز و مزاح کے لیے اس میں دو افراد مکالمے کی شکل میں گفتگو کرتے ہیں جس میں طنزیہ اور ذو معنی فقرے کسے جاتے ہیں۔ یہ انداز چین میں آج بھی بہت مقبول ہے اور اس میں بعض اوقات گائیکی اور موسیقی کے آلات بھی شامل کر لیے جاتے ہیں۔ اس کی شروعات مِنگ دور میں ملتی ہیں لیکن انیسویں صدی میں یہ زیادہ مشہور ہوا۔ آج بھی استعمال ہونے والے بہت سے روایتی لطیفے سو سال سے زیادہ پرانے ہیں۔ 1990ء کی دہائی میں سرکاری پابندیوں کے باعث یہ زوال کا شکار ہو گیا۔ اس دور میں حکومت تیانامن اسکوائر کے واقعات کے باعث سماجی اور سیاسی طنز پر محتاط ہو گئی تھی۔

قدیم چین کے ادب کے حوالے سے چار عظیم ناولوں کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔ ان میں ''Water Margin'' چودھویں صدی میں لکھا گیا اور اس کا مصنف شی نائیان تھا۔ مشہور

زمانہ ''Romance of the Three Kingdoms'' کا مصنف لوؤ گوانژونگ تھا جس نے اسے چودھویں صدی میں لکھا۔'' Journey to the West''اور''Dream of the Red Chamber'' بالترتیب سولھویں اور اٹھارویں صدی میں لکھے گئے۔''Water Margin''ایک تاریخی ناول ہے جو سونگ خاندان کی بادشاہت میں چند باغیوں کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔اس میں ہیرو کے کارناموں اور ان میں موجود خود غرضی اور جبر کے تضاد کو بیان کیا گیا ہے۔'' Dream of Red Chamber''نیم سوانحی ناول ہے جو 18ویں صدی کے چین میں اشرافیہ کی زندگیوں کے بند دریچے کھولتا ہے۔''Journey to the West''سولھویں صدی میں بدھ مت کے ایک بھگت کے مغرب یعنی ہندوستان کی جانب سفر کی داستان ہے جہاں وہ مقدس تصانیف کے حصول کے مقصد کے تحت جاتا ہے۔اسی طرح'' Romance of the Three Kingdoms'' بھی تاریخی ناول ہے جو 169ء میں چین کی تین ریاستوں کی تقسیم اور 280ء میں دوبارہ یکجہتی کے بارے میں ہے۔اس میں ایک بڑے مقصد کے خواب یعنی خاندانی بادشاہت کے قیام اور ٹوٹتی بکھرتی ریاست کی حقیقت کے تضاد کو دکھایا گیا ہے۔چین میں سرمایہ دارانہ انقلاب کی یورپ کی نسبت تاخیر کے باعث اس عہد میں ادب بھی وہ معراج حاصل نہیں کر سکا جو یورپی زبانوں کے ادب نے حاصل کی۔لیکن اس کے باوجود چین کا قدیم ادب آج تک چین کی ثقافت اور سماج پر گہرے اثرات مرتب کر رہا ہے۔

کسان بغاوتیں

چین میں کسان بغاوتوں کی ایک لمبی تاریخ ہے جن میں چند بغاوتیں کامیاب بھی ہوئیں جنہوں نے حکمران خاندانوں کو اکھاڑ کر نئے حکمرانوں کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان کے حکمران اشوکا کے ہم عصر کوئن شی ہوانگ کے بعد 209 قبل مسیح میں ایک بہت بڑی بغاوت منظم ہوئی جس کی قیادت چین شینگ اور وو گوانگ نے کی۔علم بغاوت بلند کرنے کے چند ہی ماہ میں ان کی تعداد دس ہزار افراد تک پہنچ گئی۔ یہ تمام افراد حکمرانوں کے مظالم کے خلاف اور اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے لیکن شاہی فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور ایک سال کے اندر ہی یہ بغاوت مشکلات کا شکار ہو گئی۔

'لُو لِن' ایک اور عظیم کسان بغاوت تھی جس نے برسر اقتدار 'ژِن' خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ

کر کے وقتی طور پر ہان خاندان کو دوبارہ اقتدار دلایا۔اس بغاوت کا مرکز موجودہ جنوبی ہینان اور شمالی ہوبائی کا علاقہ تھا۔ 17ء میں جینگ صوبے میں قحط سالی تھی۔سرکاری ملازمین کی بدعنوانی کے باعث صورتحال مزید بگڑ چکی تھی اور آبادی کا ایک بڑا حصہ جڑی بوٹیاں کھانے پر مجبور تھا۔اس دوران 'وینگ کوانگ' اور 'وینگ فینگ' نامی دو افراد ابھرے اور قحط زدہ عوام کے لیڈر بن گئے۔ان کے ساتھ دیگر افراد بھی جڑتے گئے اور چند ماہ میں ان کی تعداد سات سے آٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ دور دراز کے دیہاتوں پر خوراک کے حصول کے لیے حملے کرتے تھے۔ایسا کئی سالوں تک چلتا رہا اس دوران ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔یہ لوگ کبھی شہروں پر حملہ آور نہیں ہوتے تھے کیوں کہ وہ صرف ضرورت کے تحت ایسا کر رہے تھے اور جب قحط ختم ہوتا تو وہ حکمرانوں سے معافی مانگ کر واپس گھروں میں چلے جاتے۔ 21ء میں 'جینگ' صوبے کے گورنر نے بیس ہزار فوجی بھیجے تا کہ اس بغاوت کو کچلا جا سکے۔اس لڑائی میں باغی کامیاب ہو گئے اور گورنر شکست سے دوچار ہوا۔کچھ باغیوں نے گورنر کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن باغیوں کے کچھ قائدین نے اس کی مخالفت کی کیونکہ وہ حکومت کو مزید ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔اسی عہد میں ایک دوسری بغاوت 'کی میائی' کے نام سے جانی جاتی ہے جو 'شینگ ڈونگ' اور شمالی 'جیانگ سو' خطے میں ابھری۔اس بغاوت نے علاقے میں پرانے حکمرانوں کی جگہ نئے حکمرانوں کو دی لیکن زرد دریا میں سیلابوں اور دیگر وجوہات کے باعث ان کو بھی دستبردار ہونا پڑا۔

184ء کی ایک مشہور کسان بغاوت ''زرد پگڑیوں کی بغاوت'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ بادشاہ 'لنگ ڈی' کے خلاف کسانوں کی بغاوت تھی۔اس کا نام اس بغاوت میں حصہ لینے والوں کی پگڑیوں کی وجہ سے ہے۔اس بغاوت میں تاؤ مذہب کے افراد بھی شامل تھے اور تاؤ مذہب کی تاریخ میں اسے ایک اہم سنگ میل مانا جاتا ہے۔اس بغاوت کی ایک بڑی وجہ زرعی بحران تھا جس کے باعث قحط سالی پھیل گئی تھی۔اسی دوران زرد دریا میں آنے والے چھوٹے سیلابوں نے صورتحال کو مزید ابتر کر دیا تھا۔سرکاری ٹیکسوں کا بوجھ اور شاہراہ ریشم کے کنارے قلعے بنانے کے لیے جبری مشقت کے دباؤ نے اس بغاوت کو بھڑکنے کے مزید مواقع مہیا کیے۔اس بغاوت کی قیادت ژینگ جیاؤ نے کی۔اس کے دو چھوٹے بھائی تاؤ مذہب کے ایک مخصوص فرقے کے ماننے والے تھے۔اس وقت یہ فرقہ تمام لوگوں کے لیے یکساں حقوق اور زمین کی منصفانہ تقسیم کی بات کرتا تھا۔ ژینگ جیاؤ نے نعرہ دیا کہ '' نیلا آسمان (یعنی ہان شاہی خاندان) ختم ہو چکا ہے اور پیلا

آسمان (یعنی باغی) جلد ابھرے گا۔اس سال دنیا میں خوشحالی آئے گی۔''

چین کی تاریخ کی اہم ترین کسان بغاوت سرخ پگڑیوں کی بغاوت کے نام سے جانی جاتی ہے جس نے چین میں منگولوں کے اقتدار کا خاتمہ کیا۔1340ء کی دہائی میں منگولوں کا اقتدار ہچکولے کھا رہا تھا۔اس عرصے میں زرد دریا میں بہت سے سیلاب بھی آئے اور دیگر قدرتی آفات بھی زوروں پر تھیں۔منگولوں کو اتنی بڑی سلطنت پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے فوج پر اخراجات کی بھی ضرورت تھی جس کے باعث ٹیکسوں میں اضافہ کیا جا رہا تھا۔اس دوران چین میں موجود سفید کنول (White Lilly) سوسائٹی کے نام سے کام کرنے والی ایک تنظیم کے افراد نے 1351ء میں اس بغاوت کا آغاز کیا۔اپنے داخلی تضادات سے گزرتی ہوئی یہ بغاوت 1368ء میں منگول خاندان کی حکمرانی کے خاتمے پر منتج ہوئی جب اس بغاوت کے سربراہ نے مِنگ شاہی خاندان کی حکمرانی کا آغاز کیا۔

مِنگ خاندان کی حکمرانی کے آغاز کی طرح اس کا انجام بھی ایک کسان بغاوت کے ذریعے ہوا۔اس بغاوت کی قیادت لی ژی چینگ نے کی اور مِنگ اقتدار کا خاتمہ کر کے 1644ء میں چین کے آخری حکمران کوئنگ خاندان کی حکمرانی کی بنیاد ڈالی۔لی ژی چینگ خود اقتدار میں نہیں آیا لیکن اس نے کوئنگ خاندان کی حکمرانی کا راستہ ہموار کیا۔بغاوت کے دوران کوئنگ جن کا اصل ماخذ منچوریا تھا شمال مشرق سے اپنی فوجوں کو لے کر دارالحکومت کی جانب بڑھے۔اس رستے میں مِنگ حکمرانوں کے ایک طاقتور جنرل نے ان کی مدد کی جس کے باعث لی ژی چینگ کو شکست ہوئی۔اس بغاوت کے سماج پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

باب 2

چین کی نوآبادکاری

انیسویں صدی چین کے لیے بہت سی مشکلات اور دشواریوں سے بھری ہوئی تھی اور چین کا قدیم سماج ایک لمبا عرصہ پوری دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے بعد عالمی معیشت اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بننے جا رہا تھا۔ جب امریکہ اور یورپ کے بہت سے ممالک سرمایہ دارانہ انقلابات سے گزر چکے تھے یا اس کے دہانے پر کھڑے تھے چین اس نظام سے کوسوں دور تھا۔ بالآخر انیسویں صدی میں چین کو اپنی 30 کروڑ آبادی کے ساتھ اس نظام کی جانب بڑھنا تھا لیکن یہ عمل انتہائی پیچیدہ اور تکلیف دہ تھا۔ یہ دردِزہ جیسا تاریخی عمل جہاں چین کے سماج کے لیے ناگزیر تھا وہاں پرانی ریاست کی ٹوٹ پھوٹ اور سماج میں ہونے والی تیز ترین تبدیلیاں عام لوگوں کی زندگیوں پر گہرے اثرات مرتب کر رہی تھیں۔

اس صدی کے آغاز پر نپولین یورپ پر حکمرانی کے لیے آگے بڑھ رہا تھا وہاں اسے بعد ازاں شکست کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ برطانوی سامراج ہندوستان میں اپنے خونی پنجے گاڑتا چلا جا رہا تھا اور 1857ء کی جنگ آزادی کو شکست دینے کے بعد اس نے اپنے ظلم اور استحصال میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اسی صدی میں امریکہ سرمایہ دارانہ انقلاب کی کامیابی کے بعد غلامی کے خاتمے کی خانہ جنگی سے کامیابی سے ہمکنار ہوا جبکہ یورپ کے بیشتر ممالک سرمایہ دارانہ نظام کی استواری میں انقلابات اور رد انقلابات کے عہد سے گزر رہے تھے۔ اس صدی میں چین میں ہونے والے اہم واقعات میں برطانوی سامراج کے ساتھ دو افیون جنگیں شامل ہیں جن میں چین کو ہزیمت اٹھانی پڑی، جاپانی سامراج کے ساتھ شکست خوردہ معاہدے اور بعد ازاں اس کے ساتھ جنگ میں شکست، شمالی ویت نام (ٹانکن) پر قبضے کے لیے فرانس کے ہاتھوں جنگ میں شکست اور داخلی سطح پر تائی پنگ بغاوت تھی جس نے چین میں بادشاہت کے خاتمے کا آغاز کیا۔ کارل مارکس اس عہد کے چین کو ایک ایسے سماج سے تشبیہہ دیتا تھا جو دنیا سے پرے کسی خلا میں واقع تھا اور ان تاریخی واقعات کے ذریعے دنیا کے ساتھ تکلیف دہ انداز میں جڑ رہا تھا۔

بغاوتیں

اس صدی کی پہلی بغاوت ''سفید کنول بغاوت'' کے نام سے جانی جاتی ہے جس کا آغاز کوئینگ بادشاہ کے خلاف 1794ء میں ہوا اور یہ 1804ء تک جاری رہی۔ یہ بغاوت سیچوان، شانزی اور ہوبئی کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئی تھی اور صدی کے آغاز پر باغیوں کا اثر و

رسوخ بڑھتا جا رہا تھا۔سیاسی پارٹیوں کی عدم موجودگی کے باعث ان بغاوتوں کی بنیاد مذہبی فرقوں کی خفیہ سوسائیٹیوں میں ہوتی تھی۔سفید کنول بھی ایک ایسی ہی خفیہ سوسائٹی تھی جس نے اضافی ٹیکسوں کے خلاف احتجاج سے اس بغاوت کا آغاز کیا،لیکن اس بغاوت کے ابھرنے اور پھیلنے کی ایک بڑی وجہ ریاست کی ٹوٹ پھوٹ اور کمزوری تھی۔گو کہ اس بغاوت کو 1804ء میں کچل دیا گیا جس میں ایک لاکھ کے قریب باغی قتل ہوئے لیکن اس کے باوجود کوئینگ خاندان دوبارہ کبھی پہلے جیسا مستحکم نہیں ہوسکا اور اس کے زوال کا آغاز ہوگیا۔اس بغاوت کو کچلنے کے لیے جہاں فوجی کاروائی عمل میں لائی گئی وہاں ٹیکسوں کے نفاذ کو بھی غلط قرار دیا گیا اور بادشاہ نے حکم نامہ جاری کیا کہ ''مقامی اہلکاروں کی لوٹ مار نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا''۔اس بغاوت کے خاتمے کے باوجود عوام میں مانچو فوج کے ناقابل تسخیر ہونے کا خیال دم توڑ گیا جس کے بعد بہت سی مزید بغاوتوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔اس سارے عمل میں ریاست بتدریج کمزور اور زوال پذیر ہوتی گئی۔

1813ء میں شین ڈونگ،ہینان اور ژلی صوبوں میں ایک اور بغاوت پھوٹ پڑی جسے ''آٹھ ترگراموں کی بغاوت'' کہا جاتا ہے۔اس بغاوت کے لیڈروں نے بادشاہ کے محل ''شہرِ ممنوعہ'' کے بہت سے اہم لوگوں کو بھی اپنے ساتھ جوڑ لیا تھا جو ریاست کی داخلی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔15 ستمبر 1813ء کو باغیوں نے بیجنگ میں شاہی محل پر حملہ کر دیا اور محل میں ایک سو کے قریب لوگوں کو قتل یا زخمی کیا۔یہ کوئینگ بادشاہت کا خاتمہ کرنے کے بہت قریب پہنچ گئے تھے لیکن کامیاب نہ ہوسکے اور بالآخر ایک لمبی لڑائی کے بعد اس بغاوت کو بھی کچل دیا گیا جس میں بیس ہزار کے قریب باغی قتل ہوئے۔

انیسویں صدی کی سب سے اہم بغاوت اور انقلابی تحریک ''تائی پنگ'' بغاوت تھی جو 1850ء سے 1864ء تک جاری رہی۔اس خونی تنازعے میں دو کروڑ کے قریب لوگ ہلاک ہوئے۔دیگر بغاوتوں کی طرح یہ بغاوت بھی جہاں گہری سماجی بے چینی اور ٹوٹ پھوٹ کی عکاسی کر رہی تھی وہاں یہ ماضی کی طرح مذہبی فرقہ پرستی کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے تھی۔اس بغاوت کی قیادت ایک غریب کسان ہانگ ژیوقیان کر رہا تھا جس نے نانجنگ کو اپنا دارالحکومت بنا کر ''تائی پنگ کی آسمانی ریاست'' کے نام سے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔اس کے تحت جنوبی چین کا بڑا حصہ اس کے تسلط میں تھا جس کی آبادی لگ بھگ تین کروڑ تھی۔اس بغاوت نے سماجی اصلاحات کا

اعلان کیا جس میں ''مشترکہ ملکیت''، خواتین کی برابری اور کنفیوشن ازم، بدھ مت اور چین کے لوک مذاہب کی جگہ عیسائیت کی ایک مخصوص شکل کو نافذ کیے جانا شامل تھا۔ اسی طرح انہوں نے جسم فروشی، جوئے اور افیون کے استعمال پر پابندی لگا دی گو کہ بغاوت کے قائدین اس سے 'مستثنیٰ' تھے۔ 1856ء کے بعد باغیوں میں خود پھوٹ پڑ گئی اور وہ کمزور ہونا شروع ہو گئے۔ بغاوت کے اہم لیڈر یانگ ژیو کوئنگ، اس کے خاندان اور پیروکاروں کو قتل کروا دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے چین کے درمیانے طبقے کو اپنے ساتھ جوڑنے کی کوششیں کیں اور ساتھ ہی مغربی قوتوں کے ساتھ بھی تعلقات استوار کرنے کا آغاز کیا۔ 1860ء میں اپنی سلطنت کو مزید پھیلانے کی غرض سے شنگھائی پر حملہ کیا گیا جو کامیاب نہ ہو سکا۔ شکست کا یہ سلسلہ بالآخر 1864ء میں اختتام پذیر ہوا جب کوئنگ حکمرانوں نے حتمی طور پر برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کی مدد سے اس بغاوت کے مرکز نانجنگ پر قبضہ کر لیا اور ہانگ کی لاش کو جلا دیا گیا۔ نانجنگ کی لڑائی میں صرف تین دنوں میں ایک لاکھ لوگ مارے گئے۔ بہت سے علاقوں میں باغیوں کی لڑائی اس کے بعد بھی 1871ء تک جاری رہی۔ یہ بغاوت تقریباً اسی عرصے کے دوران وقوع پذیر ہوئی جس دوران امریکہ میں ابراہم لنکن خانہ جنگی میں مصروف تھا لیکن ہلاکتوں کے اعتبار سے یہ بغاوت انیسویں صدی کی سب سے بڑی خانہ جنگی تھی جس میں تقریباً تین کروڑ افراد ہلاک ہوئے۔ اس دوران بہت سی ہلاکتوں کی وجہ قحط اور طاعون کی وبا بھی تھی۔ بیسویں صدی میں چین میں بورژوا انقلاب کا قائد سن یاٹ سین اس بغاوت سے متاثر تھا جبکہ ماؤزے تنگ نے اسے ایک بدعنوان جاگیرداری کے خلاف عظیم انقلابیوں کا ایک کارنامہ گردانا۔

اس صدی کے دوران ہونے والی دیگر بغاوتوں میں 'نائین' بغاوت (1853-1868ء)، جنوب مغربی علاقوں میں ہونے والی 'پانتھے' بغاوتیں (1855-1873ء) اور 'ڈنگان' بغاوت (1862-1877ء) بھی شامل ہیں۔

پہلی افیون جنگ

1839ء سے 1842ء تک جاری رہنے والی اس جنگ میں برطانوی بحریہ نے چینی افواج کو شکست دی اور اپنی مرضی کے معاہدے کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس جنگ میں شکست کے بعد چین میں سامراجی مداخلت کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا جس نے چین کے قدیم سماج کو

بیک وقت تباہ بھی کیا اور ایک نئے سماج کی ناہموار بنیادیں بھی رکھیں۔ سامراجی یلغار نے چین کے تمام پرانے سماجی رشتوں اور ثقافت کو تہہ و بالا کر دیا اور نئے سماجی تعلقات کی بنیاد رکھی۔

''ایسا لگتا ہے کہ تاریخ کو وراثتی بیوقوفی کے خلاف ابھارنے سے پہلے تمام لوگوں کو افیون کے نشے میں غرق کرنا تھا''۔ (کارل مارکس، نیویارک ڈیلی ٹریبیون کا مضمون 'چین اور یورپ کے انقلاب'، 14 جولائی 1853ء)

چین کے ساتھ یورپ کی تجارت کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہی ہو گیا تھا۔ لیکن یہ تجارت چینی تاجروں کے ذریعے ہوتی تھی اور یورپی تاجروں کو چین کے اندر تجارت کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ دوسرا اس تجارت کا مرکز (کینٹن) گوانگ ڈونگ تھا کیونکہ اس کی جغرافیائی حیثیت تاجروں کے لیے موزوں تھی۔ موتی (پرل) دریا کے تجارتی راستے کے گرد ہونے والی اس تجارت سے زیادہ فائدہ چین کو تھا جس کے چینی کے برتن اور ریشم مغرب کی منڈی تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں چائے کی بہت زیادہ مانگ تھی جو چین سے درآمد کی جا رہی تھی۔ چین میں ان اشیاء کو چاندی کے عوض فروخت کیا جاتا تھا اور قدیم معاشی سماجی کیفیت کے باعث یورپ سے ہونے والی درآمدات بہت کم تھیں۔ اس مقصد کے لیے تاجروں کو دنیا کے مختلف خطوں سے حاصل ہونے والی چاندی چین کے تاجروں کو دینی پڑتی تھی۔ برطانیہ نے بھی اٹھارویں صدی میں اپنی معیشت کو سونے سے منسلک کر لیا تھا اس لیے اسے بھی میکسیکو اور دیگر یورپی ممالک سے چاندی خریدنی پڑتی تھی۔ مختلف یورپی ممالک نے چین کی اندرونی منڈی تک رسائی حاصل کرنے کی متعدد کوششیں کیں جنہیں چینی بادشاہوں نے رد کر دیا۔ ایک اندازے کے مطابق سترہویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی تک چین نے اس تجارت سے دو کروڑ اسی لاکھ کلو چاندی حاصل کی۔ انیسویں صدی میں برطانوی سامراجیوں نے تجارت کے اس عدم توازن کو کم کرنے کے لیے چین میں افیون برآمد کرنا شروع کر دی۔ یہ افیون برطانیہ کی نوآبادی ہندوستان میں کاشت کی جاتی اور وہاں سے اسے چین برآمد کیا جاتا۔ چین میں افیون کی فروخت کا آغاز تو 1781ء سے ہی ہو گیا تھا لیکن 1821ء سے 1837ء کے درمیان اس میں تیزی سے اضافہ ہوا اور افیون کی فروخت پانچ گنا زیادہ بڑھ گئی۔ افیون کے بدلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر چاندی لیتے تھے جس کے باعث تجارت کا توازن چینی بادشاہت کے لئے بگڑنے لگا۔ چین کے بادشاہ

نے آغاز میں اس تجارت پر پابندی پر سختی سے عملدرآمد نہیں کروایا کیونکہ اسے اس تجارت سے بالواسطہ ٹیکسوں کی مد میں فائدہ ہو رہا تھا دوسرا چائے کی فروخت میں دگنا اضافہ ہوا تھا۔ چائے کی برآمد پر بادشاہ کے شاہی خزانے یا اس کے ایجنٹوں کی اجارہ داری تھی۔

1834ء میں ایک اہم موڑ آیا جب برطانیہ میں قانون سازی کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت پر اجارہ داری کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد بہت سے دوسرے تاجروں نے بھی چین میں افیون کی فروخت میں سرمایہ کاری شروع کر دی۔ اسی دوران امریکی تاجروں نے بھی ترکی سے سستی افیون خرید کر چینی تاجروں کو فروخت کرنی شروع کر دی۔ 1838ء تک برطانوی تاجر چین میں سالانہ چودہ سو ٹن افیون فروخت کر رہے تھے۔ 1839ء میں ہندوستان سے 56 لاکھ پاؤنڈ افیون چین برآمد کی گئی جو 1884ء میں اپنے عروج پر ایک کروڑ 13 لاکھ پاؤنڈ سے تجاوز کر گئی۔ چین کے شاہی دربار میں افیون کی تجارت کو قانونی حیثیت دینے پر کئی مباحثے ہوئے لیکن بادشاہ نے ہر دفعہ ایسے کسی بھی قانون کو رد کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود بادشاہ خود اور اس کے دربار کے اکثر اہلکار افیون کا نشہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ چینی فوج میں بھی افیون کا نشہ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ شاہی دربار میں ہونے والی بحثوں میں جہاں معاشی بحران کے باعث اس تجارت پر پابندی پر سختی سے عملدرآمد کروانے کی ضرورت پر زور دیا جاتا وہاں اس تجارت سے فیض یاب ہونے والے لوگ مختلف اہلکاروں کے ذریعے اس پر پابندی کے خاتمے کی پالیسی بنانے پر زور دیتے۔ اسی دوران غیر قانونی تجارت کے باعث چینی افسر شاہی میں رشوت اور بدعنوانی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اس تجارت سے اپنی ذاتی دولت میں تیزی سے اضافہ کر رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کے خاتمے کے بعد چین میں کپاس اور انگلستان کے اونی کپڑوں کی فروخت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا جس کے باعث چین کی مقامی صنعت شدت سے متاثر ہونا شروع ہوئی۔ چین میں کپڑے کی صنعت سے وابستہ ہنرمند افراد تیزی سے بیروزگار ہونا شروع ہو گئے جس سے سماجی ہلچل میں مزید اضافہ ہوا۔ چینی کاریگروں کو پہلی دفعہ بیرونی صنعت سے مقابلہ کرنا پڑا جس کے سامنے وہ بے بس پائے گئے تھے۔ اسی بیروزگاری کے باعث وہ بڑے پیمانے پر شہروں کی جانب ہجرت بھی کرنے لگے۔

تجارت کا توازن اب چین کی بجائے برطانیہ کے حق میں تھا اور بڑی تعداد میں چاندی چین سے باہر جا رہی تھی۔ 1834ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کے آخری سال تک برطانیہ کی

چین کو برآمدات کا حجم چھ لاکھ پاؤنڈ تھا جو 1836ء میں 13 لاکھ پاونڈ سے تجاوز کر گیا اور 1845ء میں 24 لاکھ پاؤنڈ کے قریب پہنچ گیا۔ جبکہ دوسری جانب چین سے برطانیہ درآمد ہونے والی چائے میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ یہ 1793ء میں ایک کروڑ 61 لاکھ پاؤنڈ تھا جبکہ 1845ء تک اس کا حجم پانچ کروڑ تک پہنچا تھا۔ چین کے بادشاہ کو اندرونی بغاوتوں سے نپٹنے کے لیے چاندی کے سکوں کی ضرورت تھی لیکن ملک میں چاندی مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ چین کی معیشت بیرونی تجارت کے بوجھ تلے دب رہی تھی جس کے باعث بادشاہ نے افیون کی تجارت ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے ''لن زے شو'' کو ذمہ داری دے کر 1839ء میں کینٹن بھیجا۔

''چین کے سیاسی ڈھانچے، صنعت، اخلاقیات اور معیشت کو تحلیل کرنے والے یہ تمام عوامل 1840ء میں انگریزی توپوں کے سامنے اپنی معراج کو پہنچ گئے۔'' (کارل مارکس، ایضاً)

'لن' نے ملکہ برطانیہ کو خط لکھا کہ جن منشیات پر برطانیہ میں پابندی ہے انہیں چین میں کیوں فروخت کیا جا رہا ہے۔ اس نے ملکہ سے اپیل کی کہ اس تجارت کو فی الفور ختم کیا جائے۔ لن نے افیون کی تجارت پر پابندی لگا دی اور تمام افیون ریاستی تحویل میں لینے کے احکامات جاری کر دیے۔ چینی فوجیوں نے نئے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے برطانوی بحری جہازوں پر موجود تمام افیون کو تباہ کر دیا اور اس تجارت میں ملوث بہت سے تاجروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ چین میں موجود برطانوی تجارت کے سپرنٹنڈنٹ 'چارلس ایلیٹ' نے برطانوی تاجروں کو کہا کہ وہ اپنی تمام افیون چین کے حوالے کر دیں اور اس کے بدلے برطانوی حکومت ان کو خمیازہ ادا کرے گی۔ 3 جون 1839ء کو تمام افیون تباہ کرنے کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد معمول کی تجارت دوبارہ شروع ہوئی لیکن افیون کی تجارت کی سخت ممانعت تھی۔ لن نے تمام تاجروں کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے کا بھی پابند کیا جس کے مطابق افیون کی تجارت کرنے والے کو سزائے موت دی جا سکتی تھی۔

اس تمام صورتحال میں برطانوی تاجروں کو شدید نقصان ہو رہا تھا اور برطانیہ کو خطے میں اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے چین کو سبق سکھانا ضروری تھا۔ اکتوبر 1839ء میں چین اور برطانیہ کی جنگ شروع ہوئی جو 1842ء تک جاری رہی۔ جدید بحری قوتوں کے باعث برطانوی سامراج چین کی کم تر بحری افواج کو بدترین شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ برطانوی افواج نے اس جنگ کو مختلف محاذوں پر پھیلا کر چین کی کمزور افواج کو مزید مشکلات سے دوچار کیا۔ اس وقت تک

پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی اور برطانوی افواج پنجاب پر قبضے کا حتمی منصوبہ بنا رہی تھیں۔ افیون کی پہلی جنگ کے دوران چینی اور سکھ افواج کے درمیان تبت کے محاذ پر بھی جنگ شروع ہوگئی۔ کوئینگ خاندان نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہی تبت پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن ہمالیہ کے جنوب میں رنجیت سنگھ نے اپنا اقتدار مستحکم کیا تھا۔ مئی 1841ء میں کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ کے جنرل زور آور سنگھ نے سکھ افواج کے ساتھ مل کر مغربی تبت پر حملہ کر دیا۔ چینی افواج نے تبت میں تو سکھوں کو کچل دیا لیکن اس کامیابی کے بعد آگے بڑھتے ہوئے لداخ داخل ہوئیں تو وہاں انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ 1842ء میں دونوں افواج کے درمیان بھی ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس میں جنگ سے پہلے کی سرحدوں کو تسلیم کرتے ہوئے جنگ بندی کی گئی۔ اس وقت دونوں افواج برطانوی سامراج سے بھی برسرِ پیکار تھیں جن میں حتمی طور پر برطانوی افواج کامیاب ہوئیں۔

29 اگست 1842ء کو برطانیہ اور چین کی حکومتوں کے درمیان نانجنگ معاہدہ طے پایا جس میں شکست خوردہ چین کو شرمناک شرائط تسلیم کرنی پڑیں۔ چین کی تاریخ میں اسے پہلے ''نابرابر معاہدے'' کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت 1760ء سے رائج کینٹن سسٹم کا خاتمہ کیا گیا اور چار نئی بندرگاہیں تجارت کے لیے کھول دی گئیں۔ تجارت کے لیے مخصوص چینی تاجروں کے لازمی کردار کو ختم کر دیا گیا اور غیر ملکی تاجر کسی بھی شخص کے ساتھ تجارت کرنے کے لیے آزاد تھے۔ معاہدے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ان بندرگاہوں پر محصول برطانوی اور چینی حکومتیں مل کر طے کریں گی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکے گی۔ برطانوی تاجروں کو پہنچنے والے مختلف نقصانات کی مد میں چینی حکومت کو تین سال میں دو کروڑ دس لاکھ چاندی کے سکے دینے کا پابند کیا گیا اور عدم ادائیگی کی صورت میں پانچ فیصد سود لاگو کیا گیا۔ جرمانے کی مکمل ادائیگی تک برطانوی افواج چین کے علاقوں کے اندر موجود رہیں گی۔ ہانگ کانگ کو برطانیہ کے حوالے کرنے کی شرط بھی اس معاہدے میں موجود تھی۔

اس معاہدے کے بعد کوئینگ خاندان کی بادشاہت کے خلاف عوامی نفرت میں اضافہ ہوا اور ان کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ بعد ازاں ''تائی پنگ'' بغاوت نے اس بادشاہت کی بنیادوں کو مزید ہلا کر رکھ دیا۔ اس معاہدے میں کہیں بھی افیون کی تجارت کا ذکر نہیں تھا اور اس جنگ کے بعد یہ تجارت زیادہ زور و شور سے جاری رہی۔ افیون کے علاوہ دیگر اشیاء کی تجارت کے لیے بھی چین

عالمی منڈی کے لیے ایک نیا اضافہ تھا۔اس معاہدے کے بعد چین کو امریکہ، فرانس اور دیگر سامراجی قوتوں سے بھی ایسے ہی شکست خوردہ نابرابر معاہدے کرنے پڑے جس سے چین میں سامراجی قوتوں کی مداخلت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔

''پہلی افیون جنگ میں شکست کے بعد ہرجانے کی ادائیگی، افیون کی غیر پیداواری کھپت، اس تجارت سے قیمتی دھاتوں کا انخلا، مقامی کاریگروں پر بیرونی مقابلہ بازی کے تباہ کن اثرات اور سرکاری اہلکاروں کی مایوس کن صورتحال کے باعث دوکام ہوئے۔اول یہ کہ پرانے ٹیکس زیادہ بوجھ بن گئے اور ڈرانے لگے، دوسرا یہ کہ نئے ٹیکس لگنا شروع ہوگئے''۔(کارل مارکس، ایضاً)

دوسری افیون جنگ

پہلی افیون جنگ درحقیقت چین کی جدید تاریخ کا آغاز تھی۔اس کے بعد چین میں سامراجی طاقتوں کی دلچسپی بڑھنے لگی اور وہ نانجنگ معاہدے پر دوبارہ مذاکرات کرکے اپنے لیے مزید تجارتی مفادات حاصل کرنا چاہتے تھے۔1850ء کی دہائی میں سامراجی قوتیں تیزی سے پھیل رہی تھیں اور نئی منڈیوں کے حصول کی دوڑ لگی تھی۔اس دوران جہاں مختلف ممالک میں ریلوے لائن بچھانے کا آغاز ہو چکا تھا وہاں بحری جہازوں میں بھی جدت آ رہی تھی جواب سمندر میں پہلے سے زیادہ تیزی سے سفر اور تجارت کے حجم میں اضافہ کر سکتے تھے۔برطانوی تاجروں کی خواہش تھی کہ افیون کی تجارت کو قانونی حیثیت دی جائے، پورے چین کو برطانوی تاجروں کے لیے کھول دیا جائے، بیرونی اشیاء کو داخلی محصولات سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور بیجنگ میں برطانوی سفارتکار کو مستقل بنیادوں پر جگہ دی جائے۔لیکن کوئینگ بادشاہت نے نہ صرف برطانیہ کے ان مطالبات کو رد کر دیا بلکہ فرانس اور دیگر سامراجی قوتوں کے تاجروں کے مطالبات بھی تسلیم نہیں کیے۔اس دوران چینی حکام نانجنگ معاہدے کی شرائط پر بھی پوری طرح عملدرآمد نہیں کر رہے تھے اور برطانیہ کے ساتھ تجارت کرنے والے چینی افراد پر سختی کی جاتی تھی۔دونوں اطراف سے پھر تضادات شدت اختیار کرتے جا رہے تھے اور ایک نئی جنگ کے لیے حالات تیار ہو رہے تھے۔

1856ء میں برطانوی افواج نے ''ایرو'' (Arrow) نامی بحری جہاز پر ہونے والے چینی اہلکاروں کے حملے کو بہانہ بنا کر چین پر حملہ کر دیا جس سے دوسری افیون جنگ کا آغاز ہوا۔یہ جنگ 1860ء تک جاری رہی جس میں فرانس کی افواج نے بھی حصہ لیا۔فرانسیسی افواج ایک

فرانسیسی مشنری کے عدالتی قتل کا بہانہ بنا کر اس جنگ میں شامل ہوئیں تھیں۔
اس جنگ کی طوالت کی ایک وجہ ہندوستان میں ابھرنے والی 1857ء کی جنگ آزادی تھی جس سے برطانوی سامراج بوکھلا چکا تھا۔لیکن جب دونوں افواج نے بالآخر مل کر حملہ کیا تو چینی افواج ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔ 1857ء کے اواخر میں ''گوانگ زو'' کے گورنر جنرل کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ تجارتی شہر جنگ کے دوران برطانوی افواج کے قبضے میں رہا۔

1858ء کی گرمیوں میں برطانوی، فرانسیسی، امریکی اور روسی بحری بیڑے ''تیان جن'' کی جانب بڑھے۔ برطانوی اور فرانسیسی افواج نے حملہ کرتے ہوئے ڈاگو قلعے کو فتح کرتے ہوئے شہر پر قبضہ کر لیا۔ جون میں کیا گیا ''تیان جن'' معاہدہ درحقیقت چار مختلف معاہدوں پر مشتمل تھا۔اس کے تحت بیجنگ میں مستقل سفارتکاروں کا تعین ہوا اور پانچ فیصد محصول اور درآمد و برآمد پر 2.5 فیصد ٹیکس طے ہوا۔ دس نئی بندرگاہیں تجارت کے لیے کھول دی گئیں جس کے باعث تائیوان اور ہینان کے اندرونی صوبے بھی تجارت کے لیے کھول دیے گئے۔اس جنگ کے بعد معاہدے کرنے والے ممالک کے شہری چین میں کسی بھی جگہ سفر کرنے کے لیے آزاد قرار دیے گئے۔ برطانیہ کے ساتھ افیون کی تجارت کو قانونی قرار دے دیا گیا جبکہ برطانیہ اور فرانس کو جنگ میں ہونے والے نقصان کا تاوان ادا کیا گیا۔ معاہدے پر عمل درآمد اس وقت ہونا تھا جب دونوں فریق ممالک کے سربراہوں کے دستخط ہو جائیں۔

اگلے سال جب چاروں ممالک کے نمائندے معاہدے پر عملدرآمد کے لیے پہنچے تو چینی افواج نے ان پر حملہ کر دیا اور اتحادی افواج کا بڑا نقصان ہوا۔لیکن آخرکار چین کو اس خلاف ورزی کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور زیادہ تاوان اور مزید سخت شرائط کے ساتھ بالآخر ان معاہدوں کو قبول کرنا پڑا۔ چین کی جانب سے برطانیہ اور فرانس کو جو تاوان ادا کیا گیا وہ اسی لاکھ چاندی کے سکوں پر مشتمل تھا۔اس معاہدے کے بعد چین میں عیسائیوں کو مکمل شہری حقوق حاصل ہوئے اور انہیں نجی ملکیت کا بھی حق دیا گیا۔ان معاہدوں میں روس کے زار نے بڑا فائدہ اٹھایا اور تین لاکھ مربع میل کا زمینی علاقہ چین سے حاصل کر لیا۔ موجودہ روس کے بحیرۂ جاپان میں شمالی کوریا اور چین کی سرحد پر واقع مشرقی شہر 'ولادی ووسٹوک' اور 'خاباروسک' اسی معاہدے کے تحت زار روس کے تسلط میں آئے تھے۔اس دوران چینی حکمران اندرونی بغاوتوں سے بھی برسرپیکار تھے جس کے باعث ان کا اقتدار مسلسل کمزور ہو رہا تھا۔ برطانوی اور فرانسیسی افواج کی عددی طور پر کم قوت کے باوجود چینی

افواج کی شکست ایک بڑی ہزیمت تھی۔ اسکے ساتھ ساتھ جنگ کے دوران بادشاہ بھاگنے پر مجبور ہوا اور بالآخر مر گیا جبکہ اس کے محل کو آگ لگا دی گئی۔ اس تمام صورتحال سے سامراجی طاقتوں کے لیے چین میں اپنے تسلط کو بڑھانے کے لیے مزید مواقع پیدا ہوئے۔

''بلاشبہ 1860ء تک چین کی قدیم تہذیب مغرب کے ہاتھوں مکمل طور پر شکست کھا چکی تھی اور ہزیمت کا شکار تھی''۔ (امانویل ہسو، جدید چین کا ابھار)

برطانوی سامراج افیون کی تجارت سے وسیع منافع حاصل کر رہا تھا۔ ہندوستان میں اپنی نو آبادی میں موجود کسانوں کو افیون اگانے پر مجبور کیا جاتا تھا جس سے خطے کی پیداواری صلاحیتوں کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس افیون کی کلکتہ میں بولی لگائی جاتی تھی جہاں برطانوی حکومت 250 روپے مالیت کی افیون 1600 روپے تک میں فروخت کرتی تھی۔ لیکن صرف اس منافع پر بات ختم نہیں ہوتی تھی بلکہ تاجروں کے ذریعے اسے چین میں بیچ کر مزید منافع کمایا جاتا تھا۔ اگر چین میں اسی افیون کو قانونی حیثیت دے کر کاشت کاری شروع ہو جاتی تو بھی برطانوی حکومت کو نقصان تھا اور ان کے منافعوں میں کمی آسکتی تھی۔ تہذیب اور تمدن کی روشنی پھیلانے کا دعویٰ کرنے والی برطانوی سامراجی حکومت 'غیر مہذب' ساجوں میں اس ''زہر'' کی تجارت سے منافع کما رہی تھی۔ اس وقت کارل مارکس نیویارک ڈیلی ٹریبیون میں ''آزاد منڈی کی معیشت'' کے پیچھے چھپی برطانوی سامراج کی اس منافقت کا پردہ چاک کر رہا تھا اور چین میں افیون کا زہر بیچ کر منافع کمانے والے 'مہذب' برطانیہ کی مکاری کو عیاں کر رہا تھا۔ آج بھی سامراجی قوتیں اسلحے اور منشیات کی فروخت میں ملوث ہیں جبکہ منافقانہ سفارتکاری اور ذرائع ابلاغ پر تہذیب اور امن کا درس دیا جاتا ہے۔

دو جنگوں میں بدترین شکست کے بعد سامراجی تسلط نے چین کا معاشی استحصال مزید تیز کر دیا۔ دیہی علاقوں میں کسانوں کو اپنی پیداوار سستے داموں فروخت کر کے کہیں زیادہ مہنگی درآمد شدہ اشیا خریدنی پڑ رہی تھی۔ ان درآمدات میں افیون اور تیار شدہ مصنوعات تھیں جبکہ چین کے تاجروں کو ریشم، کپاس اور چائے بہت سستے داموں فروخت کرنی پڑتی تھی۔ غیر ملکی بحری جہاز چین کے ساحلی سمندروں اور دریاؤں پر حاوی تھے۔ ایک غیر ملکی انسپکٹر جنرل کسٹمز کی انتظامیہ اور ساحل کی نگرانی کا سربراہ تھا۔ برطانوی ہانگ کانگ بینک، شنگھائی بینک کارپوریشن اور چارٹرڈ بینک آف انڈیا تمام مالیاتی کاروبار کو کنٹرول کرنے لگے تھے۔

1880ء کی دہائی میں سامراجی تسلط میں انفرادی سرمایہ داروں نے گوانگ ڈونگ، شنگھائی، ووہان اور ملک کے دوسرے حصوں میں کپڑے، کاغذ، ماچس اور ریشم کی صنعتیں لگانی شروع کر دیں۔ اس حوالے سے چین میں ابھرنے والا سرمایہ دار طبقہ ہر حوالے سے سامراجی مالیاتی سرمائے اور آشیر باد کا مرہون منت تھا۔ 1869ء میں نہر سویز کے کھلنے سے یورپ اور چین کے درمیان تجارت اور فوجی نقل و حرکت کے روٹ کا فاصلہ بہت کم ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں بیرونی مصنوعات کی بھرمار نے 1871ء میں شنگھائی میں شدید کساد بازاری کو جنم دیا اور مقامی معیشت کو دھچکا لگا۔

اس دوران قدرتی آفات بھی چین کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھیں۔ جہاں طاعون کی وبا لاکھوں لوگوں کو ہلاک کر رہی تھی وہاں 1876ء سے 1879ء تک شمالی چین میں بدترین قحط آیا جس میں ایک کروڑ 30 لاکھ کے قریب افراد ہلاک ہوئے۔ قحط کا آغاز 1875ء میں فصلوں کی ناکامی سے ہوا جس سے شآنزی، شانزی، ہبی، ہینان اور شین ڈونگ کے علاقے متاثر ہوئے۔ جون 1879ء میں جب بارشیں دوبارہ شروع ہوئیں تو قحط سے متاثرہ علاقے میں زندگی کی رمق لوٹنا شروع ہوئی۔

اس صورتحال کے دوران مشرقی سرحد پر جاپان نے اپنے سامراجی عزائم کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا تھا۔ امریکہ چین پر حملے کے لیے جاپان کی معاونت کر رہا تھا۔ اپریل 1874ء میں ایک اہم امریکی فوجی افسر اور سابقہ امریکی کونسل نے جاپانی جرنیلوں اوکوما اور سیاگو سے مل کر جاپان کی چین کے جزیرے تائیوان پر جارحیت کی معاونت کی لیکن ان کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بعد میں امریکہ کے صدر رد رفورڈ بی ہیز نے 1879ء میں چین اور جاپان کے درمیان تائیوان کے علاقے لیوکیو (Liuqui) کے مسئلہ پر ثالثی کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کو جاپان اور چین کے درمیان تقسیم کرنے کی تجویز دی جسے چین نے مسترد کر دیا۔ لیکن 1881ء میں جاپان نے اس پورے خطے پر قبضہ کر لیا۔

دوسری جانب برطانوی سامراج برما پر قبضہ کرنے کے بعد جنوب سے چین کے صوبے یونان (Yunnan) میں مداخلت کر رہا تھا۔ 1876ء میں انہوں نے چینی حکومت کو چی فو (Che Fou) کنونشن پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جس کے تحت برطانیہ کو یونان، سچوان، تبت، کوئنگ ہائی اور گانسو (Gansu) کے صوبوں میں معاشی اور فوجی سرگرمیاں کرنے کا

اختیار حاصل ہو گیا۔

فرانس کے ساتھ جنگ

اس دوران فرانس بھی پوری شدت کے ساتھ ویت نام میں کارروائیاں کر رہا تھا اور ویت نام کے ذریعے وہ بھی چینی صوبے ینان میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس جارحیت کے نتیجے میں چین اور فرانس کے مابین 86-1883ء میں جنگ ہوئی۔ فرانس کے خلاف فوج میں ویت نامی سیاہ پرچم فوج کی سربراہی لیو یونگ فو (Liu Youngfu) کر رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ چینی صوبوں گوانگ شی (Guangxi) اور یونان کی فوجیں بھی شامل تھیں۔ جنگ میں دونوں فریقین کا حتمی مقصد شمالی ویت نام یا ٹانکن پر قبضہ کرنا تھا۔ فرانس اس جنگ کے بعد اپنے زیادہ تر مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس جنگ میں طوالت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ کے دوران ویت نام میں فرانسیسی سامراج کے خلاف عوامی تحریک شروع ہو گئی تھی جسے کچلنے کے لیے فرانس کو اپنے فوجی دستے جنگ سے نکال کر وہاں بھیجنے پڑے۔ عوامی تحریک کا مقصد فرانسیسی سامراج کا خاتمہ کر کے وہاں نوجوان بادشاہ کو آزاد ویت نام کا سربراہ مقرر کرنا تھا۔ اس تحریک کی کوئی مرکزی قیادت نہیں تھی اور علاقائی لیڈر اپنے اپنے علاقوں میں فرانسیسی فوج پر حملے کرتے تھے۔ اس جنگ آزادی کا مرکز ''انام'' کا علاقہ تھا جہاں شروع میں فرانسیسی فوج کی تعداد کم تھی لیکن بغاوت کے آغاز کے بعد وہاں بڑی تعداد میں فوجیں تعینات کی گئیں تاکہ اس بغاوت کو کچلا جا سکے۔ 1889ء تک یہ بغاوت کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی جسے سامراجی قوتوں نے آخر کار شکست دے دی۔ لیکن 1896ء تک اس علاقے کو مکمل طور پر پرامن نہیں کیا جا سکا تھا۔

دوسری جانب ٹانکن (شمالی ویت نام) کی لڑائی چین اور فرانس کی جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ فرانس کو ٹانکن قبضہ کرنے کے لیے چینی افواج سے لڑنا پڑا جو ڈیلٹا میں داخل ہو چکی تھیں۔ لیکن بالآخر فرانسیسی افواج چینی فوج کو ٹانکن سے باہر دھکیلنے میں کامیاب ہوئیں جس کے بعد 9 جون 1885ء کو چین اور فرانس کے درمیان ایک امن معاہدہ کرنا پڑا۔ معاہدے کی شرائط کے تحت چین شمالی ویت نام پر اپنے حق سے دستبردار ہو گیا اور اسے فرانس کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے بعد ٹانکن پر قبضہ بظاہر آسان تھا لیکن عملی طور پر ایسا کرنا بہت مشکل۔ ایک برطانوی سیاست دان نے اس وقت کہا، ''فرانس نے ٹانکن پر حکومت کا حق حاصل کر لیا ہے، لیکن اب اسے ٹانکن کو فتح کرنا

ہوگا''۔1886ء تک ٹانکن کو بڑی لڑائیوں اور ہزاروں فرانسیسی فوجیوں کے ذریعے کسی حد تک کنٹرول میں کرلیا گیا لیکن اس کے بعد بھی بڑی لڑائیاں پھوٹتی رہیں۔

کوریا اور جاپان

جاپان میں سرمایہ داری کے ابھار سے پیدا ہونے والی صورتحال نے اس کی سامراجی ہوس کو بھڑکا دیا تھا۔ جاپان کے سامراجی عزائم کا اظہار جاپانی وزیراعظم ''تناکا'' نے کیا جس کے منصوبے کے تحت وہ ایک بتدریج انداز میں مرحلہ وار تائیوان، کوریا، شمال مشرقی چین، منگولیا اور بالآخر پورے چین اور پھر پوری دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

1882ء میں کوریا کے حکمران طبقے میں ایک اندرونی بغاوت ہوئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جاپان نے اپنی فوجیں کوریا بھیج دیں اور 1884ء میں کوریا کے شاہی محل پر قبضہ کر لیا۔ 1894ء میں کوریائی عوام کی ایک اور بغاوت ہوئی جس میں چین کی حکومت سے جاپان کے خلاف لڑائی میں مدد طلب کی گئی۔ کوئنگ حکومت نے جاپانی حکومت کو ایک پیغام بھیجا کہ چین اور جاپان مشترکہ طور پر کوریا کے خطے سے اپنی فوجیں نکال لیں، جاپانیوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ جاپان نے کوریا کے بادشاہ کو گرفتار کرلیا اور کوریا کے دارالحکومت سیول کو جانے والے تمام راستوں پر قبضہ کرلیا۔ اس اشتعال انگیزی سے چین اور جاپان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس وقت چین کے حکمران جنگ کے لیے بالکل تیار نہ تھے اور انہوں نے مصالحت کرنے کی کوشش کی اور جاپان کے خلاف روس اور برطانیہ سے مدد طلب کی۔ اس شکست خوردہ پالیسی سے جاپانی فوجیں زیادہ تیزی سے آگے بڑھیں اور کوریا اور چین کے مزید علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ 1895ء میں جاپان نے چینی حکمرانوں کو مزید شرمناک نا برابر معاہدے کرنے پر مجبور کیا جس کے تحت لیاؤڈونگ، تائیوان اور پینگو کے صوبے جاپان کے تسلط میں آ گئے، چین کی جانب سے جاپان کو بیس کروڑ چاندی کے سکے تاوان کے طور پر ادا کرنے پڑے اور چینی بندرگاہوں اور شہروں میں جاپانیوں کو صنعتیں لگانے اور کاروبار کرنے کی اجازت مل گئی۔ لیاؤڈونگ پر جاپان کا قبضہ روس کے سامراجی عزائم کے رستے میں رکاوٹ تھا اس لیے روس نے جرمنی اور فرانس کی معاونت سے یہ خطہ واپس چین کو دلوایا۔ جاپان نے اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے لیے بڑی رقم حاصل کی۔

اس وقت چین مختلف سامراجی طاقتوں کے لیے لوٹ مار کا میدان بنا ہوا تھا جہاں ہر کوئی

اپنی طاقت کی مناسبت سے حصہ وصول کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ لینن نے اس وقت لکھا تھا کہ،

''یورپی حکومتوں نے پہلے ہی چین کی تقسیم کا عمل شروع کر دیا ہے۔ لیکن یہ عمل انہوں نے کھلے عام نہیں کیا بلکہ چوروں کی طرح پس پردہ رہ کر کیا ہے۔ یہ چین کو اس طرح لوٹ رہے ہیں جیسے کفن چور لاشوں کو لوٹتے ہیں''۔ (چین میں جنگ، 1900)

1895ء میں فرانس نے صوبے ینان کے دو اہم اضلاع ینگوؤ اور وودے حاصل کرنے کا مطالبہ کر دیا اور ویت نامی ریلوے کو ینان اور گوانگ شی تک وسعت دے دی۔ انہی علاقوں سے فرانس نے معدنیات بھی لوٹنا شروع کر دیں۔ 1898ء میں فرانس نے چینی حکومت سے گوانگ ژاؤان صوبہ بھی لیز پر لے لیا۔ اس پیش قدمی کو دیکھتے ہوئے برطانوی سامراج نے بھی بہت سے خطے اور صوبے لیز پر حاصل کرنے شروع کر دیے۔ 1897ء میں جرمنی نے جیائیوژاؤ کا خطہ جبراً لیز پر حاصل کر کے جائیوژاؤ سے جنان ریلوے لائن کی تعمیر شروع کر دی۔ دوسرے علاقوں سے بھی معدنیات کی لوٹ مار کے لیے ریلوے لائنیں بچھائی جانے لگیں۔ 1898ء میں روس نے لش ین اور دالائن کے خطوں کو لیز پر لے کر چین کی مشرقی ریلوے کی تعمیر کا حق حاصل کر لیا۔ بیجنگ - ہانکاؤ اور دوسرے ریلوے کے ٹھیکے حاصل کرنے کے لیے زار روس کی جانب سے مذاکرات بیلجیم کے ماہرین اور سوداگروں نے کیے۔ اس کے ردعمل میں برطانیہ نے چینی حکمرانوں کو دیوار چین کے باہر ریل کی تعمیر کے لیے قرض دینے کی پیش کش کی۔ لوٹ مار کے ان تنازعات پر روس اور برطانیہ کے درمیان تناؤ بڑھ گیا۔ اس تناؤ کو ختم کرنے کے لیے 1899ء میں برطانیہ اور زار روس کے درمیان ریلوے اور پٹریوں کو بچھائے جانے کے علاقوں کی بندر بانٹ پر سمجھوتہ ہو گیا۔ اس پس منظر میں چین کو مختلف سامراجی ''دائرہ اثر'' میں تقسیم کیا جانے لگا۔ دیوار چین کے شمالی حصے پر روس نے دعویٰ کر رکھا تھا۔ برطانیہ نے چانگ جیانگ کا خطہ قبضے میں کیا ہوا تھا اس کے علاوہ گوانگ ڈونگ اور گوانگ ژی کے اہم علاقے اس کے قبضے میں تھے۔ جرمنی شین ڈونگ اور ینان کے حصوں پر قابض تھا جبکہ دوسرے حصے فرانس کے کنٹرول میں تھے۔ جاپانی فوجیان کو اپنی جاگیر سمجھنا شروع ہو گئے تھے۔ امریکہ کے پاس اپنا کوئی دائرہ اثر نہیں تھا لیکن اس نے ''کھلے دروازے'' کی پالیسی اپنا رکھی تھی جس کے تحت وہ دوسرے سامراجیوں کے زیر اثر خطوں میں مداخلت کر کے چین کے عوام کا استحصال کر رہا تھا۔

چین کے حکمران طبقات اس سامراجی لوٹ مار میں ایجنٹ اور گماشتے کا کردار ادا کر رہے تھے اور چینی محنت کشوں کے استحصال میں اپنا کمیشن وصول کر رہے تھے۔ اس دوران بہت سے مقامی چینی سرمایہ داروں نے صنعتیں لگانی شروع کر دیں۔ 1897ء تک جیانگسو، ژی جیانگ اور ہیوبئ کے صوبوں میں تیس کپاس کی ملیں اور کئی ریشم کی فیکٹریاں مقامی سرمایہ داروں نے لگائی تھیں۔ لیکن یہ صنعت کاری بیرونی سامراجی اداروں اور صنعتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ کان کنی اور ریلوے کے حقوق سامراجیوں کے قبضے میں ہونے کے باعث چین میں بھاری صنعت اور ٹھوس صنعتی بنیادیں استوار کرنا ممکن نہیں تھا۔

''باکسر'' بغاوت

سامراجی لوٹ مار سے عوام میں حکمرانوں کے خلاف نفرت تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی جس کا اظہار ایک عوامی بغاوت کی شکل میں ہوا جسے باکسر بغاوت یا ''یی ہی توان'' تحریک کہا جاتا ہے۔ 1898ء سے 1900ء تک جاری رہنے والی اس بغاوت کا آغاز ''یی ہی توان'' نامی ملیشیا نے کیا تھا جنہیں انگریزی میں باکسر کہا جاتا تھا۔ دیہی علاقوں سے ابھرنے والی اس تحریک کا مقصد چین کا قومی وقار اس کو واپس دلانا اور سامراجی قوتوں کو بے دخل کرنا تھا۔ یہ تحریک عیسائی مشنریوں کے عزائم کی بھی مخالف تھی اور انہیں بھی سامراجی پالیسی کا ایک ہتھکنڈہ سمجھتی تھی اس لیے جہاں سامراجی دفاتر پر حملے کیے جاتے تھے وہاں گرجوں کو بھی نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس سرکشی کو کچلنے کے لیے سامراجی ممالک نے ایک مشترکہ فوج بیجنگ بھیجی جس میں برطانیہ، امریکہ، روس، فرانس، جرمنی، جاپان، اٹلی اور آسٹریا کے دستے شامل تھے۔ اپنے جدید ہتھیاروں کے باوجود وہ ''یی ہی توان'' کی فوج کو بآسانی شکست نہ دے سکے۔ اس لڑائی میں چین کی شاہی فوج کے کچھ افسران نے بھی باغیوں کی حمایت کر دی تھی۔

شین ڈونگ اور شمالی چین میں کاروائیاں کرنے کے بعد ''یی ہی توان'' کے باغی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وہ جدید ہتھیاروں سے لیس سامراجی فوج کو شکست نہیں دے سکتے۔ اپنی آخری کاروائی میں انہوں نے جون 1900ء میں بیجنگ پر حملہ کیا اور نعرہ لگایا کہ ''کوئنگ حکومت کی حمایت کرو اور غیر ملکیوں کو بھگاؤ''۔ آغاز میں چین کی حکمران ملکہ ''دووا گرسی شی'' نے ان باغیوں کی حمایت کی اور 21 جون کو سامراجی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 55 دن تک بیجنگ میں رہنے والے

سفارتکار، غیر ملکی شہری وفوجی اور چینی عیسائی بیجنگ کے ایک علاقے میں شاہی فوج کی نگرانی میں محصور رہے۔ شاہی محل کے افراد دو حصوں میں تقسیم تھے اور تذبذب کا شکار تھے کہ باغیوں کی حمایت کریں یا سامراجی قوتوں کی۔ بعدازاں چینی فوج کے جنرل نے تسلیم کیا کہ غیر ملکیوں کو محصور کرنے کا مقصد ان کا تحفظ کرنا تھا۔

آٹھ ملکی اتحاد نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے بیس ہزار فوجی بھیجے جنہوں نے چین کی شاہی فوج کو شکست دی اور 14 اگست کو بیجنگ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بیجنگ میں وہ لوٹ مار اور خونریزی کی گئی جسے دیکھ کر منگول بھی شرما جائیں۔ چینی دارالحکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور باغیوں کو سزائے موت دی گئی۔

7 ستمبر 1901ء کو ہونے والے باکسر پروٹوکول معاہدے کے تحت ان تمام سرکاری افسران کو سزائے موت سنائی گئی جنہوں نے باغیوں کی حمایت کی تھی، غیر ملکی افواج کی بیجنگ میں مستقل موجودگی کا فیصلہ کیا گیا اور چین پر 45 کروڑ چاندی کے سکوں کا تاوان لاگو کیا گیا جو آٹھ سامراجی ممالک میں تقسیم ہونا تھا۔ یہ تاوان چین کی سالانہ ٹیکس آمدن سے زیادہ تھا جسے 39 سالوں میں ادا کیا جانا تھا۔

اس بغاوت کے بعد سامراجیوں نے فیصلہ کیا کہ چین کو براہ راست نو آبادی بنانے کی بجائے اس کو یہاں کے حکمران خاندان کے کٹھ پتلی افراد کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔ اسی پالیسی کے تحت ملکہ ''دووا گرسی شی'' کو واپس مسند اقتدار پر مسلط کیا گیا جس نے اب سامراجی طاقتوں کی وفادار رہنے کا عہد کر لیا تھا۔ سامراجی قوتوں نے چین کی ایک لمبے عرصے تک لوٹ مار کا منصوبہ بنایا تھا لیکن وقت اور تاریخ کے فیصلے کچھ اور ہی تھے۔

باب 3

1911ء کا سرمایہ دارانہ انقلاب

پچھلی صدی کے آغاز کی صورتِ حال پر ہیرالڈ آئزک اپنی کتاب ''چینی انقلاب کا المیہ'' میں لکھتا ہے کہ ''چین میں طرزِ زندگی نا ہموار، بے ترتیب اور ادھڑا ہوا تھا۔ پیداوار، ذرائع مواصلات اور اقتصادیات کی جدید شکلیں ماضی کی تھکی ہاری، پامال اور فرسودہ طرز پر مسلط تھیں اور صرف جزوی طور پر اس سے جڑی تھیں۔ قدیم تانا بانا اسی وقت ختم ہو رہا تھا جب 19ویں صدی میں مغرب نے اپنی اشیائے تجارت، ہوس اور نظریات کے ساتھ اس پر حملہ کیا۔ اس حملے کا نتیجہ تباہ کن اور متضاد تھا۔ چینی معیشت جبری طور پر تبدیل کی گئی۔ سماج میں موجود طبقے جو ایک لمبے عرصے سے مستحکم تھے تیز ترین تبدیلی کے عہد میں داخل ہو گئے۔ طرزِ حکومت، عادات اور پورا سماجی توازن بگڑ گیا۔ تبدیلی کا یہ عمل انتہائی پیچیدہ تھا۔ اس نے چین میں پیداواری قوتوں کی ترقی کے لیے ایک نئے ڈھانچے کی استواری کے ناگزیر تاریخی فریضے کو اجاگر کیا۔ اس نے ایسے تضادات پیدا کیے جو جلد ہی مجتمع ہو گئے، متحرک ہوئے اور تیزی سے ایک حل کے لیے طبقاتی کشمکش کے میدان جنگ کی جانب بڑھے۔''

انیسویں صدی میں چین میں ہونے والی سامراجی لوٹ مار نے غریب کسانوں پر بدترین اثرات مرتب کیے۔ غربت اور بیروزگاری میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ رہی سہی کسر قدرتی آفات نے پوری کر دی جن کے باعث کروڑوں لوگ جاں بحق ہوئے۔ اسی بے چینی اور مشکل حالات نے بہت سی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کو جنم دیا جو نہ تو بادشاہت کو اکھاڑ سکیں اور نہ ہی کسی مکمل سماجی تبدیلی کی جانب بڑھیں۔ لیکن اس دوران چین میں کچھ افراد نے سامراجی گماشتگی اور ان کی تجارت میں مدد کے ذریعے بڑے پیمانے پر دولت بھی اکٹھی کی۔ چین میں ابھرنے والا نومولود سرمایہ دار طبقہ درحقیقت سامراجی قوتوں کی گماشتگی کرنے والے ایسے افراد پر مشتمل تھا جو ماضی میں بھی چین میں کسی نہ کسی شکل میں اثر و رسوخ رکھتے تھے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

1830ء سے قبل جب غیر ملکی بحری جہاز کینٹن کے ذریعے تجارت کر رہے تھے اور چین کی چائے اور ریشم کے بدلے چاندی کے سکے ادا کرتے تھے، اس وقت بھی محنت کرنے والوں کو ان کا پورا معاوضہ نہیں ملتا تھا بلکہ درمیان میں موجود مینڈرین اور بندرگارہ پر موجود تاجر ہی زیادہ حصہ

وصول کرتے تھے۔اس تجارت سے مخصوص تاجروں،مخصوص اجارہ داریوں جنہیں غیر ملکی تاجروں کے ساتھ معاملات طے کرنے کے لیے بنایا گیا تھا، مقامی افسران جو اپنی مرضی کا ٹیکس عائد کرتے اور 'تحفے' لیتے تھے، نے اس دوران خوب مال کمایا۔خاص طور پر افیون کی تجارت نے انہیں مالا مال کر دیا۔کینٹن کا ایک تاجر دو کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر دولت جمع کرنے کی شیخی مارا کرتا تھا۔

انہی تاجروں اور افسران میں سے ایک نیا طبقہ ابھرنا شروع ہوا۔ایک ایسا طبقہ جو چینی منڈی میں بیرونی سرمائے کا دلال تھا۔چین کے سماج پر سامراجی یلغار کے براہ راست اثرات میں سے یہ ایک تھا۔ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک کی سامراجی مداخلت کے باعث چین میں سرمایہ دارانہ تبدیلی کی آزادانہ مقامی تبدیلی کا رستہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ان چینی تاجروں اور افسران کی بنیاد زمینوں پر تھی۔اس لیے آغاز میں بیرونی تجارت سے حاصل ہونے والا سرمایہ کسی سرمایہ دارانہ طرز کی سرمایہ کاری کی بجائے زمینوں کی طرف گیا۔ایک ایسے عمل کا آغاز ہوا جس میں بڑی جاگیریں ابھرنی شروع ہوئیں اور چھوٹے زمینداروں کا خاتمہ ہونا شروع ہوا۔بڑی جاگیروں کے مالکوں نے اپنے بچوں کو شہروں میں بھیجنا شروع کیا جہاں وہ اس بیرونی تجارت کے فوائد حاصل کر سکیں۔لیکن اس منافع سے جاگیروں میں اضافہ ہوتا یا پھر غریب کسانوں کو سود پر قرض دیا جاتا۔پیداوار میں کمی اور ٹیکسوں میں بڑھتے ہوئے بوجھ کے باعث کسانوں کو اپنی زندگی چلانے کے لیے ان قرضوں کی اشد ضرورت تھی۔غیر ملکی تاجروں کی ترقی یافتہ ٹیکنیک اور قوت کے باعث مقامی زمینوں کے مالک تاجر ایک ایسے طبقے میں تبدیل ہوئے جو دلال، سود خور اور جوئے باز تھے اور ان کے مفادات شہر اور گاؤں دونوں جگہ تقسیم تھے۔

اس عمل میں پورے ریاستی ڈھانچے نے حصہ لیا۔فوجی شکستوں کے باعث ریاستی بیوروکریسی افیون کی تجارت میں رشوت اور منافع خوری میں تیزی سے ملوث ہو رہی تھی۔دارلحکومت پیکنگ دور تھا اور چاندی کی چمک بہت قریب۔چینی بیوروکریسی کی بدعنوانی کی ایک لمبی تاریخ ہے۔سرکاری اہلکار غریب کسانوں کے ٹیکسوں سے ہونے والی آمدن کے ذریعے عرصہ دراز سے ایمانداری کو پس پشت ڈالتے آئے ہیں۔غیر ملکی تجارت نے اس بدعنوانی کو نئی جہتیں عطا کیں۔شاہی خاندان کے زوال کے باعث ایمانداری کا بچا کھچا بھرم بھی اتار کر پھینک دیا گیا اور مرکز کو بھیجے جانے والی رقم کا بڑا حصہ اب مقامی اہلکاروں کی تجوریوں میں جانے لگا۔اسی بڑھتی

ہوئی دولت کے باعث اقتدار کے ایوانوں میں بھی رسائی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اب پڑھے لکھے لوگوں کی بجائے پیسے والے لوگ اہم عہدوں پر فائز ہونے لگے۔ تجارت کے غیر قانونی منافعوں سے امیر ہونے والے افراد اپنے بچوں کے لیے مینڈرین کا عہدہ حاصل کرنے لگے۔ جیسے جیسے یہ طریقہ کار معمول کا حصہ بنتا گیا ویسے ہی تاجر، جاگیردار اور سرکاری اہلکار ایک ہی طبقے میں جڑتے چلے گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ طبقہ سامراجی قوتوں کے لیے چین میں مداخلت اور اس پر کنٹرول حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا گیا۔ اسی طبقے کے ذریعے سماج میں موجود نابرابری کو مستقل بنیادوں پر چلایا جا سکتا تھا۔ نیم نوآبادیاتی چین میں سماج پر قبضے کا یہی فارمولا تھا۔ سامراجی مداخلت کے باعث چین کا معاشی، سماجی اور سیاسی ڈھانچہ تحلیل ہو رہا تھا جبکہ اس کی جگہ لینے کے لیے نیا ڈھانچہ نمودار نہیں ہوا تھا اسی لیے سامراجی قوتوں کے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں تھا کہ چینی سماج کے پسماندہ، جابر اور رجعتی حصے کے ساتھ مل کر مزاحمتی اور انقلابی تبدیلیوں کے حامل طبقے کو روکا جائے۔

''تائی پنگ'' بغاوت میں یہ گٹھ جوڑ مزید مضبوط ہوا جب سامراجی قوتوں کے ساتھ مل کر مقامی گماشتوں نے اس بغاوت کو کچل ڈالا۔ آغاز میں کچھ سامراجی قوتوں نے باغیوں کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کے بارے میں سوچا، خاص طور پر باغی قیادت کے عیسائیت کی جانب مائل ہونے کے باعث انہیں امید کی کرن نظر آئی لیکن حتمی طور پر سامراجی قوتوں کا مفاد اس بغاوت کو کچلنے میں تھا۔ بعد ازاں تحریک داخلی تضادات کا شکار ہو کر خود بھی کمزور ہو کر بکھر گئی تھی۔ دوسری جانب سامراجی مداخلت کے باعث قدیم دور سے جاری چین میں کسان بغاوت اور پھر شاہی خاندان کی تبدیلی کا چکر اب ممکن نہیں رہا تھا۔

سامراجی قوتوں کی موجودگی کے باعث اب چین کی دنیا سے علیحدہ اور کٹی ہوئی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور مشینوں پر تیار کردہ اشیاء کی آمد کے باعث اب چین میں ایک انقلاب کے لیے حالات تیار ہو رہے تھے۔ چین میں اب ایک ایسی انقلابی تبدیلی کی ضرورت تھی جو زمینوں پر مبنی قدیم نظام کا خاتمہ کرتی۔ لیکن سامراجی قوتوں کا انحصار اسی نظام پر تھا جس کے ذریعے ان کی اشیاء دور دراز علاقوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ''تائی پنگ'' بغاوت کی ناکامی کے معنی یہ تھے کہ اب سماجی تبدیلی کا پرانا طریقہ کار متروک ہو چکا ہے۔ لیکن اس بغاوت نے کوئنگ حکمرانوں کی قوت اور اقتدار پر بھی کاری ضرب لگائی تھی۔

انیسویں صدی کے اختتام پر اس قدیم سماج کی تبدیلی کے لیے نئے کردار کی حامل طبقاتی قوتیں ابھرنا شروع ہو چکی تھیں۔ ان قوتوں کا کردار ماضی کی کسانوں کی عوامی تحریکوں سے قطعاً مختلف تھا۔ تبدیلی کی یہ نئی قوتیں سماج کی بالائی پرتوں میں پنپ رہی تھیں۔ بیرونی دباؤ کے نتیجے میں چین میں سرمایہ دارانہ ترقی کلاسیکی طرز پر نہیں ابھر سکتی تھی۔ لیکن ایک نیا طبقہ ابھر رہا تھا جس کے پاس دولت مجتمع ہو رہی تھی اور وہ غیر ملکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ ''لی ہوانگ چنگ'' نے چینی سرمایہ داری کی بنیاد رکھی۔ پہلا چاول صاف کرنے کا کارخانہ 1863ء میں شنگھائی میں لگایا گیا۔ 1865ء میں ''کیانگنان'' شپ یارڈ تعمیر ہوا۔ اس کے سات سال بعد چینی مرچنٹ سٹیم نیوی گیشن کمپنی کی بنیاد رکھی گئی تاکہ ساحلی علاقوں اور دریاؤں میں بیرونی اجارہ داری کا مقابلہ کیا جائے۔ اگلے سال ریشم کاتنے کی پہلی فیکٹری لگائی گئی۔ 1876ء میں شنگھائی سے ووسنگ تک بارہ میل لمبی ریلوے لائن کا آغاز ہوا۔ 1878ء میں پہلی جدید کوئلے کی کان نے کائی پنگ میں کام شروع کیا۔ 1890ء میں شنگھائی میں پہلی کاٹن سپننگ اور ویونگ مل قائم ہوئی جبکہ اسی سال ووچنگ میں لوہے کا کارخانہ قائم ہوا۔ ماچس فیکٹریاں اور فلور ملیں 1896ء سے بننا شروع ہوئیں۔ چین کی سرمایہ داری کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس دوران چین کی تجارت، خاص طور پر کپاس اور کپڑے کی تجارت میں اہم پیش رفت ہوئی۔ 1888ء تک اس مد میں تجارتی خسارہ فائدے میں بدل چکا تھا۔ 1833ء کے بعد کپاس کی برآمد تقریباً ختم ہو چکی تھی لیکن 1868ء کے بعد پھر اس میں تیزی آنا شروع ہوئی اور 1900ء تک اس کا حجم بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اس دوران بیرونی ممالک سے آنے والی کپاس کی تیار مصنوعات کی چین میں فروخت بھی بہت بڑھ رہی تھی۔ صنعت میں ابتدائی ترقی کے ساتھ ساتھ تجارت، مواصلات اور بینکاری کے شعبے میں بھی سست انداز میں کام شروع ہو چکا تھا۔ 1878ء میں ایک جدید ڈاک کے نظام کا آغاز ہوا۔ شنگھائی اور ٹائین ٹسن کے درمیان ٹیلی گراف لائن 1881ء میں بچھائی گئی۔ 1896ء میں چینی سرمائے کی بنیاد پر ''کمرشل بینک آف چائنہ'' قائم ہوا۔ اس کے بعد نئی لائنوں اور بینکوں کی تعداد بڑھنے لگی۔

لیکن آغاز سے ہی چینی سرمایہ دار بیرونی یلغار کے خلاف ایک شکست خوردہ لڑائی لڑ رہے تھے۔ 1895ء میں جاپان سے شکست کے بعد ہونے والے معاہدے کے بعد غیر ملکی افراد چین میں صنعتیں لگا سکتے تھے۔ اس معاہدے کے بعد چین کی سستی محنت کا استحصال کرنے کے لیے نئی

صنعتیں تیزی سے لگنا شروع ہوگئیں۔ غیر ملکی صنعتکاروں کی جدید تکنیک اور ان کے لیے موجود معاشی و سیاسی مراعات کے باعث وہ مقامی صنعتکاروں کو مقابلے میں آسانی سے شکست دے سکتے تھے۔ چینی صنعتکاروں کے لیے موجود ٹیکسوں اور تکنیکی کمزوری کے باعث مشکلات پیدا ہو رہی تھیں جن کے حل کے لیے انہوں نے محنت کشوں کا زیادہ شدید استحصال شروع کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے چین کے حکمرانوں کی کمزوری اور خصی پن کے خلاف بھی احتجاج شروع کر دیا جو اب نئے معاشی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

''تائی پنگ'' بغاوت کی شکست کے بعد موجود حکمران لی ہوانگ چنگ نے ریاست کی جدیدیت کے لیے کچھ کوششوں کا آغاز کیا۔ نہ صرف کچھ نئی صنعتیں لگائی گئیں بلکہ اس نے جدید بحریہ اور فوج کا بھی آغاز کیا، سکولوں میں تبدیلیاں کیں اور طلباء کو ملک سے باہر بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ مغربی قوتوں کی طاقت کا راز جان سکیں۔ لیکن جاپان کے ساتھ جنگ نے ان اصلاحات کا خاتمہ کر دیا جس کے بعد زیادہ شدید اقدامات کی ضرورت تھی۔ 1895ء کے بعد چین کی سیاست میں دو رجحانات حاوی تھے۔ ایک وہ جو خواہش رکھتے تھے کہ شاہی خاندان کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ وہ ایک ایسے بادشاہ کا خواب دیکھتے تھے جو روس کے پیٹر دی گریٹ کی طرز کا ہو اور اس کے ساتھ ایک ایسی حکومت ہو جو انگلینڈ کی آئینی بادشاہت کی طرز پر ہو۔ لیکن دوسرا دھڑا کوئنگ حکمرانوں کے مکمل خاتمے اور اس کی جگہ امریکہ اور فرانس جیسی ریپبلک کے قیام کے خواہاں تھے۔ اپنے زوال کے آخری عرصے میں مانچو حکمران خود ایسے اقدامات کر رہے تھے جن سے ان کا خاتمہ ناگزیر ہوتا چلا گیا اور انقلابیوں کا رستہ ہموار ہوا۔

دوسری جانب اصلاح پسندوں نے کنفیوشس کے قدیم نظریات کو نئی تشریح سے استعمال کرنا شروع کیا۔ مختلف مغربی فلسفیوں اور معیشت دانوں کے ترجمے بھی چینی زبان میں آنا شروع ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ چین کے شاہی خاندان کی اصلاح کی جا سکتی تھی اور اسی مقصد کے تحت 1898ء میں ''اصلاحات کے سو دن'' کا آغاز ہوا۔ ایسے بہت سے حکم نامے جاری ہوئے جن میں قدیم طرز حکومت کی جگہ جدید طرز اپنانے کی کوشش کی گئی۔ ان حکم ناموں کے ذریعے جدید سکولوں کا قیام، انتخابی مشینری کا قیام اور بدعنوانی کا خاتمہ شامل تھا۔ لیکن جدت کے یہ تمام حکم نامے 'شہرِ ممنوعہ' سے نکلنے کے بعد ایک بوسیدہ ریاستی مشینری میں تبدیلی نہ لا سکے۔ پرانے مینڈرین اور مجسٹریٹ یہ سمجھنے لگے کہ شاید بادشاہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے اس لیے ایسے احکامات جاری کیے جا

رہے ہیں۔ کیونکہ یہ احکامات ان کے اختیارات کو محدود کر رہے تھے اور صدیوں سے قائم اداروں کو ختم کر رہے تھے۔ ان احکامات کے باعث پیدا ہونے والی بے چینی بالآخر ملکہ دووا گر کی شخصیت میں مجتمع ہوئی جس نے اپنے بھانجے کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور اس کی جانب سے جاری کردہ تمام احکامات کو کالعدم قرار دیا۔ اس کے کچھ مشیروں کو قتل بھی کروا دیا گیا جبکہ کچھ نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ ان دانشوروں نے مانچو خاندان کی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ اس دوران چین کا سرمایہ دار طبقہ بہت نحیف اور منقسم تھا اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس لیے بورژوا دانشور ایک روشن خیال بادشاہ کی امید کر رہے تھے۔

بادشاہ کے اصلاح پسند احکامات کی مزاحمت کرنے والی بیوروکریسی سماج میں جاری تیز ترین تبدیلی کی مزاحمت نہیں کر سکتی تھی جو تیزی سے اس کے خاتمے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ قدرتی آفات اور وباؤں کے ساتھ ساتھ عوامی بغاوتیں بھی تیزی سے بڑھ رہی تھیں اور ساتھ ہی سامراجی جنگوں میں بھی چین کو مسلسل پسپائی ہو رہی تھی۔

چین کے دانشوروں نے اب اصلاحات کی بجائے انقلابی تبدیلی پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ احساس بڑھنے لگا کہ چین کی بادشاہت اب تاریخ کے کوڑے دان کا حصہ بن چکی ہے۔ چین کے طلبا اور دانشوروں نے اب ایک نئے انقلابی کی گفتگو پر غور کرنا شروع کیا جس کا نام ''سن یاٹ سین'' تھا۔

1895ء میں بادشاہ کو اصلاحات کی پیش کش کرنے والوں میں سن بھی شامل تھا۔ لیکن اس کی سیاسی بنیادیں دوسرے اصلاح پسندوں سے مختلف تھیں۔ جس سال تائی پنگ بغاوت کو کچلا گیا اسی سال کینٹن کے نزدیک سن کی پیدائش ہوئی۔ اپنی جوانی میں سن کے ان افراد سے قریبی تعلقات استوار ہوئے جو تائی پنگ بغاوت کی مسلح جدوجہد میں زیرزمین کام کرنے میں ماہر تھے۔ نوجوانی میں اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہونولولو (امریکہ) بھیج دیا گیا جہاں وہ عیسائی مذہب کے قریب ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے امریکی جمہوریت سے گہری شناسائی حاصل کی۔ اپنی سیاست کے آغاز میں سن خفیہ تنظیموں کے ذریعے بادشاہت کے خاتمے کی کوششیں کرتا رہا۔ 1895ء میں اس کی پہلی کوشش ناکام ہو گئی اور اسے جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔ جلاوطنی میں اس کی ملاقات تارکین وطن چینیوں سے ہوئی اور ان میں اس کے انقلابی پروگرام کو حمایت ملنی شروع ہوئی۔

چین کے پہلے انقلاب میں سن کے غیر ممالک میں مقیم چینیوں سے تعلقات نے اہم کردار

ادا کیا۔مقامی چینی سرمایہ دار ایک جانب سامراجی یلغار کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے اور دوسری جانب نیم زرعی سماجی بنیادوں کے باعث ان کی ترقی محدود تھی۔سرمایہ دارانہ طرز ارتقا میں رکاوٹ کے ساتھ ساتھ ان عوامل کے باعث کوئی واضح قومی انقلابی تحریک نہیں پنپ رہی تھی۔لیکن امریکہ، یورپ اور دیگر ممالک میں مقیم چینی محنت کش اور تاجر ان جدید جمہوریتوں کے ساتھ براہِ راست تعلق میں تھے۔چین میں موجود غیر ملکیوں کی مراعات کے مقابلے میں بیرونی ممالک میں چینیوں کو نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔چین کے مقامی افراد سے پہلے بیرونی ممالک میں رہنے والے چینیوں میں ایک گہرا قوم پرستی کا جذبہ ابھرنا شروع ہوا۔لیکن یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سن کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے ملنے والی امداد کا بڑا حصہ محنت کشوں اور چھوٹے تاجروں کی جانب سے آیا۔بیرونی ممالک میں مقیم بہت کم بڑے تاجروں اور دولت مند افراد نے مالی امداد کی۔

ایک فوجی سازش کے ذریعے بادشاہت کے خاتمے کے پروگرام کو اصلاح پسندوں کی جانب سے بھی وسیع بنیادوں پر حمایت ملنی شروع ہوئی۔وہ طلبا جو تعلیم کے حصول کے لیے بیرونی ممالک میں گئے تھے انہوں نے بھی اس منصوبے کی حمایت شروع کر دی۔چین میں اس تحریک نے خفیہ تنظیموں سے تعلقات استوار کرنے شروع کر دیے۔شہروں اور قصبوں میں رہنے والے دانشوروں نے ان خفیہ تنظیموں کو پہلی دفعہ قومی اور جمہوری رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔روس کے 1905ء کے انقلاب نے چین کے تعلیم یافتہ افراد پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اسی دوران حکمرانوں کی جانب سے رعایتوں کا بھی اعلان کیا گیا۔اس کے بعد چینی تاجروں اور سرمایہ داروں نے اپنے دباؤ کو بڑھانا شروع کیا۔1905ء میں امریکہ اور 1908ء میں جاپان کے خلاف ہونے والے بائیکاٹ میں یہ نیا رجحان زیادہ شدت کے ساتھ نظر آیا۔

ان تحریکوں نے عوامی شکل اختیار کرنی شروع کر دی۔تاجروں کے گلڈ اور نومولود اخبارات نے ان کی حمایت شروع کر دی۔امریکہ میں مقیم چینیوں سے برتے جانے والے ہتک آمیز سلوک کا جواب چین میں معاشی ہتھیاروں سے دینے کے عمل نے چین کے تاجروں اور چھوٹے سرمایہ داروں کو ایک نیا اعتماد بخشا۔اس بائیکاٹ سے امریکہ میں مقیم چینیوں کا چین میں مقیم تاجروں سے رشتہ مزید مضبوط ہوا۔امریکہ کے خلاف ہونے والے بائیکاٹ کی سب سے زیادہ شدت کینٹن میں تھی۔امریکہ میں رہنے والے زیادہ تر چینیوں کا تعلق بھی کینٹن سے تھا۔لیکن اس بائیکاٹ کے

دوران سنگاپور، شنگھائی اور ٹائین ٹسن میں احتجاجی مظاہرے بھی ہوئے۔امریکی سفارتکاروں کے دباؤ کے تحت شاہی دربار نے اس بائیکاٹ کی مذمت کی تھی۔اسی لیے 1908ء میں ہونے والا جاپان کے خلاف بائیکاٹ حکومت مخالف بھی تھا۔بحری جہازوں کے ایک واقعے میں حکومت کے جاپان کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کے باعث اس بائیکاٹ کا آغاز ہوا۔تاجروں نے جاپانی اشیا کو آگ لگا دی اور بندرگاہ پر موجود محنت کشوں نے جاپانی جہازوں سے سامان اتارنے سے انکار کر دیا۔اس طرح بیسویں صدی میں پہلی مرتبہ چینی محنت کشوں نے سامراج مخالف جدوجہد میں براہ راست حصہ لیا۔

امریکی بائیکاٹ کے دوران ابھرنے والا ایک اہم مطالبہ یہ بھی تھا کہ کینٹن سے ہانکو تک بچھائی جانے والی ریلوے لائن کا امریکی کمپنی کو دیے جانا والا ٹھیکہ ختم کیا جائے۔چین میں دولت مند ہونے والے نئے افراد اب شاہی خاندان کی جانب سے دیے جانے والے ان ٹھیکوں کی مخالفت کر رہے تھے۔نئی ریلوے لائنیں بچھائے جانے کے منصوبے بنائے جا چکے تھے اور چینی سرمائے سے کمپنیاں قائم ہو چکی تھیں جو ان منصوبوں پر کام کرتیں۔لیکن پیکنگ میں موجود حکومت اب سامراجی طاقتوں کی ایک گماشتہ بن چکی تھی اور ایسے منصوبے غیر ملکی کمپنیوں کو دے کر منافع حاصل کرتی تھی۔انہوں نے غیر ملکی سرمائے سے چینی کمپنیوں میں حصے لے کر ان منصوبوں کو غیر ملکی کمپنیوں کے حوالے کر دیا۔اس کے خلاف ہینان، ہوپے اور سیچوان کے چینی سرمایہ داروں میں شدید مزاحمت ابھری۔زیر زمین خفیہ تنظیموں نے اس تنازعے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور چینی بادشاہت کو قابل نفرت سامراجی طاقتوں کا حصہ قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف جدوجہد کا اعلان کیا۔اس پروگرام سے سماج کے بالائی طبقے بھی تیزی سے جڑنے لگے۔سیچوان میں اسی مسئلے کے گرد تحریک کا آغاز ہوا جس نے ایک کھلی بغاوت کو جنم دیا۔

ستمبر 1911ء میں سیچوان کے سامراجی اہلکاروں کے خلاف ابھرنے والی بغاوت کے بعد اکتوبر میں ووچانگ میں ایک فوجی چھاؤنی میں بغاوت شروع ہو گئی۔جب لانچو میں تعینات شاہی فوجی دستوں نے باغیوں کے خلاف پیش قدمی سے انکار کر دیا تو مانچو خاندان کے خاتمے کا نقارہ بج گیا تھا۔شاہی خاندان نے اس بغاوت کے سامنے سر خم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی رہی سہی حکومت کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ملکہ دوواگرسی شی (Dowager Cixi) 1908ء میں ہی وفات پا چکی تھی اور اس کی جگہ چھ سالہ بادشاہ حکومت کر رہا تھا۔اس بادشاہ کو ملکہ کی وفات پر تین

سال کی عمر میں شاہی تخت پر مسلط کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی سرپرستی کرنے والے بدعنوان اہلکار شاہی خاندان کے زوال کے سامنے بے بس تھے اور اس زوال کا مجسم اظہار تھے۔ اپنی بیوقوفی پر مبنی حکم ناموں کے ذریعے وہ جس تخت کو بچانا چاہتے تھے اس کا عہد ختم ہو چکا تھا۔ 1910ء میں ایک محدود قسم کی اسمبلی بنانے کی بھی کوشش کی گئی جس میں صرف انہی موضوعات پر بحث ہو سکتی تھی جن کی دربار کی طرف سے اجازت ہو۔ اپنے ہی منتخب کیے ہوئے نمائندوں پر مبنی یہ اسمبلی بھی شاہی دربار کے خلاف آواز بلند کرنے لگی۔ دوسری جانب سین ایسی تنظیمیں بنا رہا تھا جو چین میں بغاوتوں کی مدد کریں اور وہ کسی خفیہ طریقے سے اقتدار پر قبضہ کر کے چین میں ایک جمہوریہ قائم کرنے کا اعلان کر سکے۔ 1905ء میں اس نے ٹوکیو میں موجود چینی طلبا کے ساتھ مل کر انقلابی تنظیم قائم کی۔ اسی طرح ملائشیا، سنگاپور اور دوسرے ایسے جزیروں میں چینی تارکین وطن کو منظم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ 13 نومبر 1910ء کو اس نے 'ملایا' (حالیہ ملائیشیا) میں ہونے والی پینانگ کانفرنس میں چندے کی اپیل کی تاکہ چین میں جاری بغاوتوں کی مالی امداد کی جا سکے۔ اس دوران اسے 1,87,000 ڈالر چندہ ملا۔

27 اپریل کو ''ہوانگ ژنگ'' نے گوانگ زو میں ایک بغاوت کے ذریعے بادشاہت کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ناکام ہوگئی اور باغیوں کو قتل کر دیا گیا لیکن ہوانگ زنگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ 10 اکتوبر 1911ء کو اس نے ووچانگ میں ایک فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سین جلاوطنی میں تھا اور اس کی براہ راست کوئی مداخلت نہیں تھی۔ جب سین کو پتہ چلا کے بغاوت کامیاب ہوگئی ہے اور کوئنگ بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے وہ جنرل ہومر لی کے ساتھ امریکہ سے چین واپس لوٹا۔ یہ بغاوت پھیلتی گئی اور چین کے بورژوا انقلاب کی صورت میں ابھر کر اس وقت سامنے آئی جب چھ سالہ بادشاہ کے اقتدار کا خاتمہ کر کے جمہوریہ چین کا اعلان کیا گیا۔ 29 دسمبر 1911ء کو نانجنگ میں صوبائی نمائندوں کی موجودگی میں سن یاٹ سین کو عبوری صدر منتخب کیا گیا جبکہ ہوانگ ژنگ فوج کا وزیر بنا۔ یکم جنوری 1912ء کو جمہوریہ کا پہلا دن چنا گیا اور جمہوریہ چین کی عبوری حکومت کا آغاز ہوا۔

لیکن 10 مارچ 1912ء کو جنرل ''یوان شی کائی'' نے بیجنگ پر قبضہ کر لیا اور عبوری حکومت کا صدر اسے نامزد کر دیا گیا۔ سین جمہوریہ چین کی قومی اسمبلی بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مئی 1912ء میں 120 ممبران پر مشتمل اسمبلی کو بھی نانجنگ سے ناچنگ منتقل کر دیا گیا۔ اسمبلی کے بہت سے

ممبران بھی سین کی بجائے شی کائی کی حمایت کر رہے تھے۔اس دوران ''سانگ جیاؤرن'' نے پارلیمنٹ پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کی اور 25 اگست 1912ء ''کومنتانگ'' کے نام سے ایک پارٹی بھی قائم کرلی۔ 13-1912ء کے قومی اسمبلی کے نام نہاد بالواسطہ انتخابات میں کومنتانگ کو بھاری اکثریت ملی۔ان انتخابات میں صرف نجی ملکیت کے حامل با اثر اور دولت مند افراد حصہ لے سکتے تھے۔انتخابات میں کامیابی کے باوجود اقتدار سے محرومی کے بعد سین اور کومنتانگ نے مل کر شی کائی کی 80 ہزار افراد پر مشتمل فوجوں کے خلاف مسلح لڑائی لڑ کر اقتدار پر قبضے کی کوشش کی جس میں انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس کے بعد سین جاپان بھاگنے پر مجبور ہوا جبکہ کومنتانگ کے بانی سانگ کو 20 مارچ 1913ء کو قتل کروا دیا گیا۔اس کے بعد سیاسی خلفشار اور خانہ جنگیوں کا آغاز ہوگیا۔1915ء میں شی کائی نے چین کو اپنی سلطنت قرار دیتے ہوئے خود کو بادشاہ مقرر کر دیا۔

1911ء کے انقلاب کی شدت سے نحیف بادشاہت اور اس کی اسمبلی ریزہ ریزہ ہوگئی۔اس تمام ریاستی ڈھانچے کو گرانے کے لیے جس معمولی سے دھکے کی ضرورت تھی وہ 1911ء کے انقلاب نے مہیا کیا۔لیکن اس انقلاب کی کامیابی کے باوجود ایسا کوئی طبقہ ابھر کر سامنے نہیں آسکا جو پورے ملک کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا، زرعی مسئلہ حل کرتا اور سامراجی طاقتوں کو شکست دے کر چین کی قومی آزادی و سالمیت کو حاصل کرتا۔چینی نومولود سرمایہ دار طبقہ ابھی تک نیم جاگیردارانہ مفادات کے ساتھ جڑا ہوا تھا جس کے باعث وہ غربت میں گھرے کسانوں کو نجات نہیں دلا سکتا تھا۔ 1911ء کے انقلابیوں نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔کسانوں نے شاہی خاندان کے خاتمے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا اور وہ ایسا کرنے کی صلاحیت اور طاقت بھی نہیں رکھتے تھے۔اسی وجہ سے صوبائی سطح پر فوجی اور سول بیوروکریسی کو پرانا ڈھانچہ برقرار رکھنے میں آسانی ہوئی، گو کہ اب اس میں شاہی خاندان کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔

مرکزی حکومت کے خاتمے کے بعد اقتدار صوبائی اور علاقائی حکمرانوں کے پاس چلا گیا جو پرانا استحصالی نظام برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ان کے ذریعے سیاست اور معیشت پر غیر ملکی کنٹرول مزید مضبوط ہوگیا۔برسر اقتدار آنے والی علاقائی قوتیں مختلف سامراجی قوتوں کے ''دائرہ اثر'' کے ساتھ مطابقت بنانے لگیں۔''ینان'' اور ''وانگسی'' کے حکمرانوں نے فرانس سے مدد طلب کی۔ دریاؤں کے کنارے وادیاں جو ہانگ اور شنگھائی کے زیر اثر تھیں برطانوی کنٹرول میں چلی گئیں۔

شمالی علاقوں میں جاپان نے اپنے پنجے گاڑ لیے۔ان علاقائی حکومتوں کے درمیان ہونے والی خانہ جنگیاں ان کی پشت پر موجود سامراجی قوتوں کے معاشی مفادات کی پراکسی جنگیں تھیں۔ 1911ء کے انقلاب کے بعد کی خانہ جنگیوں اور قدیم چین کی خانہ جنگیوں میں یہی فرق تھا۔

بورژوا انقلاب میں شرکت کرنے والے دانشوران نئی تقسیموں کے سامنے بے بس تھے۔ جس طبقے کی وہ نمائندگی کر رہے تھے وہ معاشی طور پر کمزور اور سیاسی طور پر خصی تھا اس لیے اس کے گرد کوئی عوامی تحریک نہیں بن سکی۔اس طبقے کے مفادات کے تحفظ کا مطلب تھا کہ چین کی تمام پسماندہ روایات کو تحفظ دیا جاتا جن میں قدیم خاندانی نظام، جہالت، توہم پرستی اور دیہاتی علاقوں کی تمام تر پسماندگی شامل تھیں۔شہروں میں اس طبقے کے مفادات بیرونی سرمائے کے مرہونِ منت تھے۔اس لیے بورژوا دانشوروں کی تمام جدوجہد فوجی سازشوں پر مبنی تھی جو ہر دفعہ ناکامی سے دوچار ہوئی۔درحقیقت بادشاہت کا خاتمہ ان کی کوششوں کے بغیر ہی ہو گیا تھا۔بعد ازاں یہ دانشور صرف ان فوجیوں کے دم چھلے بن گئے تھے جنہوں نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ان کے بنائے ہوئے آئین اور پارلیمنٹ کے منصوبوں کی کوئی ٹھوس حقیقت نہیں تھی بلکہ اقتدار پر قابض فوجی ان منصوبوں کو اپنے تحفظ کے لیے استعمال کرتے تھے۔اسی لیے سن یاٹ سین جو فتح یاب ہو کر چین لوٹا اور اسے جمہوریہ چین کا پہلا صدر منتخب کیا گیا چند ماہ بعد ہی ''یوان شی کائی'' کے حق میں دستبردار ہو گیا۔یہ پرانی حکومت کا ایک جنرل تھا جس نے پیکنگ میں اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔

وہ دانشور جو جاہل جرنیلوں کے سیکرٹری یا کسی اور عہدے پر فائز نہ ہو سکے انہوں نے گمنامی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔سن یاٹ سین اور اس کی پارٹی کومنتانگ کے بچے کھچے افراد پارلیمانیت کی بیماری کا شکار ہو گئے اور ''آئین کی حفاظت کرو'' کا نعرہ لگانے لگے۔لیکن درحقیقت کبھی ایک جرنیل اور کبھی دوسرے سے حفاظت طلب کر رہے تھے۔اس کھیل میں وہ باقاعدگی سے ہارتے رہے۔صرف جرنیل جیتتے رہے۔

بادشاہت کا خاتمہ ایک بہت بڑا ترقی پسندانہ قدم تھا لیکن بظاہر اس سے ملک آگے جانے کی بجائے پیچھے جا رہا تھا۔خانہ جنگیوں اور جرنیلوں کی حکومتوں نے دیہاتوں میں محرومی اور ذلت میں مزید اضافہ کر دیا۔وصولیاں زیادہ ہو رہی تھی اور زمین بیکار ہو رہی تھی۔زرعی پیداوار میں مزید کمی آ گئی۔چین اب گندم اور چاول درآمد کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔قحط اور قدرتی آفات سے اموات

میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کروڑوں کی تعداد میں کسان زمینوں سے در بدر ہو کر یا تو فوجی بن رہے تھے یا ڈکیتیاں کر رہے تھے۔ بدترین ٹیکسوں کے نفاذ اور فوجی کاروائیوں نے چین کی دیہاتی معیشت کو تباہ کر دیا اور آبادی کا ایک بڑا حصہ قحط کا شکار ہو گیا۔ مقامی صنعتوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اتنے بڑے پیمانے پر زائد محنت کو جذب کر سکیں۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے دوران اس سمت میں بڑی تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں۔

پہلی عالمی جنگ کے دوران چین کے سرمایہ داروں کے لیے بھی نئے مواقع پیدا ہوئے جب اس جنگ میں شامل تمام ممالک کی صنعتیں اپنی پوری صلاحیت سے پیداوار کر رہی تھیں۔ جنگ کے دنوں میں مانگ میں اضافے کے باعث چین کی برآمدات میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ 1913ء کا معیار اگر 100 تسلیم کیا جائے تو 1914ء میں درآمدات 91.6 تھیں جبکہ 1919ء میں 105.9۔ برآمدات 1914ء میں 83.8 سے بڑھ کر 1919ء میں 140.1 ہو گئیں تھیں۔ درحقیقت درآمدات میں زیادہ کمی بیشی نہیں ہوئی لیکن برآمدات میں تیز اضافہ ہوا۔

جنگ کے دوران صنعتی ترقی میں تیز اضافہ ہوا۔ صنعتی مشینری کی درآمد میں تیز اضافہ ہوا۔ کاٹن ملوں کی تعداد 1916ء میں 42 سے 1923ء میں 120 تک پہنچ گئی۔ ریشم کی فیکٹریاں 1915ء میں 56 سے 1927ء میں 93 ہو گئیں۔ سگریٹ کی 1915ء میں صرف چار فیکٹریاں تھیں جو 1927ء میں 182 ہو گئیں۔ اگر 1913ء کو 100 تسلیم کیا جائے تو 1923ء کے اعشاریے کچھ یوں بنتے ہیں: کوئلے کی پیداوار 183.5، لوہے کی پیداوار 180.6، ریشم کی برآمدات 152.3، کھانے کے تیل کی برآمدات 432.5، کاٹن کے تکلے 403.9 تک پہنچ گئے۔ اسی دوران مواصلات اور بحری جہازوں کی صنعت میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔

اس ترقی کے باعث چین کے کاروباری شعبے کا ڈھانچہ بھی تبدیل ہوا۔ کارپوریٹ شکلیں بننی شروع ہوئیں۔ بینکوں میں جدت آئی۔ جیسے جیسے مشینیں ہاتھ سے کام کرنے والی صنعت کی جگہ لے رہی تھیں ویسے ہی قدیم استاد، کاریگر اور شاگرد کے سماجی رشتے ختم ہو کر کمپنی کے حصص کا مالک، منیجر اور مزدور کے رشتے استوار ہو رہے تھے۔

ذرائع پیداوار کی ترقی نے چینی سرمائے کے بیرونی سرمائے کے مفادات اور سیاسی اور معاشی مراعات سے تضادات کو از خود ابھار دیا۔ اس نئی صورتحال میں قومی شناخت اور تحریکیں پھوٹنے لگیں جنہوں نے اگلی دہائی کی سماجی تبدیلیوں اور انقلابات کو جنم دیا۔

باب 4

کمیونسٹ پارٹی کا قیام اور تیسری انٹرنیشنل

پہلی عالمی جنگ کے دوران چین تبدیلیوں کے ایک تکلیف دہ عہد سے گزر رہا تھا۔ اس دوران نئے نظریات اور نئے آدرش اپنی جگہ بنا رہے تھے اور ماضی ایک بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ 1911ء کے انقلاب کی ناکامی نے باشعور پرتوں کو بھی مایوس کر دیا تھا اور وہ کسی نئے حل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ چین ڈوشو (Chen Duxiu) انہی نئے نظریات کی پیاس لیے ہوئے ایک شخص تھا جو چین کی آئندہ نسل کے لیے اہم سنگِ میل عبور کرنے جا رہا تھا۔ چین ڈوشو نے نئی نسل کے فرائض کے متعلق اپنے میگزین نئے نوجوان (New Youth) میں 1915ء میں لکھا کہ ''کنفیوشن ازم کے خلاف لڑائی لڑنا، پرانے رسوم و رواج کے خلاف لڑنا، پرانی اخلاقیات اور سیاست کے خلاف لڑنا۔۔۔ اور پرانی تعلیم اور ادب کے خلاف لڑنا ہے''۔ ان کی جگہ وہ جمہوریت اور جدید سائنس لانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے میگزین میں قدیم روایتوں کو توڑ کر نئے جذبے کے ساتھ ایک نئے سویرے کے طلوع کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس عہد میں چین کے نوجوانوں میں یہ سوچ تیزی سے مقبول ہونا شروع ہوئی اور اس کا دائرہ کار پھیلنا شروع ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران طلبا میں اس فکر نے ایک نئے طرز کی قومی سوچ کو ابھارنا شروع کیا۔ اس نئی سوچ کا ٹکراؤ براہ راست جاپانی سامراج سے ہوا جو 1915ء میں چین پر شرمناک 21 شرائط لاگو کرنا چاہتا تھا اور شنٹونگ کے صوبے پر قبضہ کرنے جا رہا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر چین میں یہ خیال حاوی تھا کہ اس کو خدمات کے عوض بہتر مقام حاصل ہو سکے گا لیکن ورسائی (Versailles) میں ہونے والے معاہدے میں چین کی سامراجی محکومی کو بلواسطہ تسلیم کر لیا گیا۔

مزدور تحریک

اس دوران چین میں صنعتی مزدوروں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ 1916ء میں مزدوروں کی تعداد دس لاکھ سے بڑھ کر 1922ء میں دوگنی ہو چکی تھی۔ اسی دوران یورپ میں بھی چین کے دو لاکھ کے قریب محنت کش کام کر رہے تھے اور وہاں کی جدید صنعت کے ساتھ ساتھ جدید نظریات سے بھی روشناس ہو رہے تھے۔ یورپ کی مزدور تحریک کا حصہ بننے کے باعث وہ اپنے حقوق کی جدوجہد سے بھی آگاہ ہو رہے تھے۔

چین میں سرمایہ داری کی سامراجی طرز پر مبنی آمد اپنے ساتھ محنت کشوں کا بدترین استحصال بھی لائی تھی۔ شنگھائی اس دوران مشرقی ایشیا کی اہم ترین بندرگاہ بن چکا تھا جہاں آنے والا سامان آبادی کے ایک بڑے حصے تک پہنچتا تھا۔ شنگھائی میں طبقاتی تضاد کی شدت ان دنوں عام دیکھی جا سکتی تھی جہاں ایشیا کا سب سے بڑا بینک اور دولت مند افراد کے لیے بہترین آسائشیں موجود تھیں وہاں غربت اور ذلت میں رہنے والے محنت کشوں کا ایک وسیع سمندر تھا۔ اسی شنگھائی میں ہی ایشیا کی سب سے بڑی جھونپڑ پٹی بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ شنگھائی کی فیکٹریوں میں چھوٹے بچوں کا استحصال کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا۔ 1924ء میں چائلڈ لیبر کی تحقیقات کے لیے قائم ہونے والی کمیٹی کی رپورٹوں کے مطابق شنگھائی کے صنعتی علاقے کی 274 فیکٹریوں میں بارہ سال سے کم عمر کے بائیس ہزار بچے کام کر رہے تھے۔ ان کے کام کا دن بارہ گھنٹے روزانہ پر مشتمل تھا اور ہفتہ وار کوئی چھٹی نہیں تھی۔ کمیٹی کے مطابق بہت سے بچے ابھی چھ سال سے بھی کم عمر کے تھے اور فیکٹری کے مالکان پانچ سال کی عمر سے بچوں کو کام پر لگا دیتے تھے۔ آگاتھا ہیریسن نے اس عرصے میں چین میں مزدوروں کے کام کے حالات پر تفصیلی تحقیق کی۔ 1923ء میں اس کی ایک رپورٹ کے مطابق، ''یہ طے کرنا آسان نہیں کہ بچے کس عمر میں کام شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں سے کئی تو اپنی ماؤں کے ساتھ نومولود حالت میں ہی فیکٹری میں قدم رکھ لیتے ہیں۔ مائیں ان بچوں کو کام کے دوران کندھوں کے ساتھ باندھ کر رکھتی ہیں اور کام کرتے ہوئے ہی انہیں دودھ بھی پلاتی ہیں۔ فیکٹری کے ماحول میں رہتے ہوئے بچے بہت چھوٹی عمر میں ہی چھوٹے موٹے کام کر لیتے ہیں اور چھ، سات یا آٹھ سال کی عمر میں باقاعدگی سے کام پر لگ جاتے ہیں''۔ ایک فیکٹری مالک کی گفتگو بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا، ''اگر ہم بچوں کو کام پر رکھنا چھوڑ دیں تو ہمیں فیکٹریاں بند کرنی پڑیں گی''۔

1925ء میں چائلڈ لیبر کمشنر نے برطانوی پارلیمنٹ کو رپورٹ بھیجی کہ شنگھائی میں

14 فیصد محنت کشوں کی عمر بارہ سال سے کم ہے۔ان کم عمر محنت کشوں میں 80 فیصد لڑکیاں تھیں۔ایک اندازے کے مطابق اس دوران شنگھائی کے محنت کشوں کی کل تعداد بیس لاکھ کے لگ بھگ تھی جو شہر کی کُل آبادی کا ایک تہائی بنتا تھا۔دوسرے شہروں میں ایسی ہی صورتحال تھی جس میں محنت کشوں کا بدترین استحصال کیا جاتا تھا۔کام کے بارہ گھنٹے مسلسل کھڑے ہو کر کام کرنا پڑتا تھا، بہت سے بچے تھکاوٹ کے باعث چھپ کر نیند پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن فیکٹری میں بجنے والا الارم انہیں جگا دیتا تھا۔

بالغ محنت کشوں کے لیے کام کے اوقات بارہ سے چودہ گھنٹے تک تھے لیکن شنگھائی میں کچھ صنعتیں ایسی بھی تھیں جہاں وہ بیس گھنٹے تک کام کرتے تھے۔ایک اندازے کے مطابق اس وقت غیر ہنرمند مرد محنت کشوں کے لیے اوسط اجرت 9 ڈالر جبکہ خواتین کے لیے 7.50 ڈالر تھی۔بہت سی فیکٹریوں میں کام صبح پانچ بجے شروع ہوتا اور شام چھ سے سات بجے تک جاری رہتا تھا۔یورپ میں پہنچنے والا خوبصورت ریشم زیادہ تر چیفو (Chefoo) میں تیار ہوتا تھا۔یہاں موجود 40 فیکٹریوں میں 26 ہزار بچے اور بڑے کام کرتے تھے جن کی 13 گھنٹے روزانہ کام کی اوسط اجرت 12 سینٹ تھی۔اس دوران بنیادی اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا جس کی مناسبت سے اجرتیں انتہائی کم تھیں اور اتنی شدید محنت کے بعد بھی مزدوروں کے لیے سانسوں کو جاری رکھنا مشکل تھا۔دیہاتوں کی غربت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے شہروں میں آنے والے مرد و خواتین محنت کش یہاں سرمایہ داروں کی دولت میں اضافے کا ایندھن بن رہے تھے۔ان کے لیے واپس جانا ممکن نہیں تھا اور شہر میں رہنا بھی ایک عذابِ مسلسل ہی تھا۔محنت کشوں کے اسی بدترین استحصال کے باعث سرمایہ داروں کے منافعوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ 1924ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ٹیکسٹائل کی ایک فیکٹری کا سالانہ منافع دس لاکھ ڈالر سے تجاوز کر گیا۔ 1916ء میں اس فیکٹری کا کُل سرمایہ چھ لاکھ ڈالر تھا۔سستے مقامی خام مال اور محنت کشوں کے شدید استحصال کے باعث یہ فیکٹری تین سال تک اپنے کل سرمائے سے زیادہ منافع کماتی رہی۔

اس تمام تر استحصال کے دوران چین کی مزدور تحریک بھی منظم ہو رہی تھی۔کینٹن میں یکم تا 6 مئی 1922ء میں چینی محنت کشوں کی پہلی کانگریس منعقد ہوئی۔اس کانفرنس میں 200 یونینوں کے 160 مندوبین شریک تھے جو تین لاکھ محنت کشوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔اس کانفرنس میں آٹھ گھنٹے کے اوقات کار، ہڑتالیوں کی باہمی امداد، ایک مستقل ملکی تنظیم اور صنعتی یونینوں کے لیے

پالیسی سازی کے حق میں قراردادیں منظور کی گئیں۔اس کانفرنس کے بعد چائینیز نیشنل لیبر فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ مئی 1925ء میں دوسری ملکی سطح کی لیبر کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں 285 مندوبین نے شرکت کی جو ساڑھے چار لاکھ محنت کشوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ اس فیڈریشن کو ماسکو کی سرخ انٹرنیشنل لیبر یونینز (RILU) کے ساتھ منسلک کیا جائے گا۔

1922ء سے پہلے مزدور تحریک مختلف تحریکوں اور ہڑتالوں کے ذریعے پھیل رہی تھی۔ بہت سے چینی سرمایہ دار بیرونی سرمایہ داروں کی فیکٹریوں میں ہونے والی ہڑتالوں کی مدد کرتے تھے تاکہ ان کا خاتمہ کر کے کے کاروبار پر اپنا تسلط حاوی کر سکیں۔لیکن 1922ء تک خود چینی سرمایہ داروں کی فیکٹریوں میں بھی ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جس کے خلاف مقامی سرمایہ داروں اور حکومت کا رویہ اب سخت تھا۔اکتوبر 1922ء میں تان شینگ کے کان کنوں کی ہڑتال کو توڑنے کے لیے حکومت نے پولیس اور فوج کا بھی استعمال کیا۔اس کے علاوہ ریلوے، شپنگ اور دیگر شعبوں میں بڑی ہڑتالیں ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔لیکن چین میں محنت کش طبقے کی تحریک کے ابھار کا آغاز 4 مئی 1919ء کی تحریک سے ہوا تھا جو چین کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔

4 مئی کی تحریک

4 مئی 1919ء کو چین میں اس سامراجی معاہدے اور پیکنگ کی بدعنوان حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے جو بیسویں صدی کے آغاز پر چین میں ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان تھے۔1915ء سے 1921ء کے اس دور کو چین میں نئی ثقافتی تحریک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔4 مئی کو مظاہرے کا آغاز پیکنگ سے ہوا جہاں 13 مقامی یونیورسٹیوں کے طلبا اکٹھے ہوئے اور انہوں نے پانچ بنیادی نکات پر جدوجہد کرنے کا متفقہ فیصلہ کیا۔

1۔شین ڈونگ کو جاپان کے حوالے کیے جانے کی مخالفت کرنا

2۔چین کے عوام کو چین کی مشکل صورتحال سے آگاہ کرنا

3۔پیکنگ میں ایک عوامی سطح کا اجتماع کرنا

4۔پیکنگ سٹوڈنٹ یونین کے قیام کی جدوجہد کرنا

5۔معاہدۂ وارسائی کی شرائط کیخلاف اسی دن شام کو احتجاج کرنا

شام کے وقت تین ہزار کے قریب طلبا تیانامن کے وسیع چوراہے پر احتجاج کے لیے جمع ہوئے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں 1989ء میں بھی طلبا کی احتجاجی تحریک کا آغاز ہوا تھا جسے فوجی جبر کے ذریعے کچلا گیا۔ 1919ء میں سامراجی طاقتوں کے درمیان ہونے والے معاہدۂ وارسائی اور دیگر سامراج مخالف نعروں سے پیکنگ گونج اٹھا۔ احتجاجی طلبا نے جاپانی اشیا کے بائیکاٹ کا بھی اعلان کیا اور جاپانی سامراج کے ساتھ گٹھ جوڑ میں ملوث تین چینی اہلکاروں کے خلاف کاروائی کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اگلے دن پیکنگ کے طلبا ہڑتال پر چلے گئے۔

پیکنگ میں ہونے والے یہ احتجاجی مظاہرے جلد ہی پورے ملک میں پھیل گئے۔ فیکٹریوں کے مزدوروں نے بھی طلبا کے مطالبات کے حق میں ہڑتالیں شروع کر دیں اور یہ مظاہرے ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے۔ شنگھائی کے مزدوروں کی جانب سے طلبا کی گرفتاری کی شدید مذمت کی گئی اور یہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔

''ہم لوگوں کی جانب بدترین مظالم کا سلسلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ غیر ملکی ہمارے علاقوں پر قبضہ کر رہے ہیں اور حکومت ہمیں بیچ رہی ہے۔ اگر درست اصولوں پر عملدرآمد نہ کیا جائے تو انصاف کیسے مل سکتا ہے؟ طلبا نے پڑھائی چھوڑ دی ہے اور اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا ہے لیکن اس کے باوجود حکومت کے دل میں کوئی رحم نہیں۔

تاجروں نے تجارت چھوڑ دی ہے اور ہزاروں ڈالر کا نقصان کر رہے ہیں اور پھر بھی حکومت کو رحم نہیں آیا۔ یقیناً اب عوام کو بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا چاہیے۔

لیکن آفاقی انصاف اس ظلم کو شکست دے گا۔ ہم، شنگھائی کے لاکھوں محنت کش، طلبا اور تاجروں کی صفوں کو مضبوط کریں گے اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔ ہماری تجویز ہے کہ محنت کش عملی اقدامات کرتے ہوئے اپنے آپ کو نچلی سطح تک منظم کریں، اور پھر بالائی ڈھانچہ بناتے ہوئے منظم ہوں۔

پہلے مرحلے میں سڑکوں پر محنت کشوں کے احتجاجی مظاہرے منظم کیے جائیں۔ دوسرے مرحلے میں تمام صنعتوں میں ایک بڑی ہڑتال منظم کی جائے۔ تیسرے مرحلے میں اس ظلم کے خلاف اپنا سرخ خون بہایا جائے، لاکھوں محنت کشوں کا خون''۔

اس کے نیچے 24 افراد نے اپنے خون سے دستخط کیے۔ اس اعلامیے کے بعد طلبا کو رہا کر دیا گیا۔

4 مئی کی تحریک درحقیقت چین کا دوسرا بورژوا انقلاب تھا جس نے پرانی تمام روایتیں ختم کر

کے جدید خیالات اور نظریات کی بنیاد رکھی۔نوجوان نسل تیزی سے ان نظریات کی جانب راغب ہونے لگی اور اپنے مستقبل کی جدوجہد اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے بڑھی۔نوجوانوں کی نظریں ورسائی سے ہٹ کر اب روس پر لگ چکی تھیں جہاں 1917ء میں لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں بالشویک انقلاب برپا ہو چکا تھا اور ایک بہت بڑی سماجی تبدیلی کا آغاز ہوا تھا۔چین میں اس دوران یورپ کے تمام نظریات جن میں جمہوریت، انارکزم اور دیگر شامل تھے اپنی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن مارکسزم کی جانب رجحان تیزی سے فروغ پا رہا تھا۔ہر قسم کا نیا ادب نوجوانوں میں دلچسپی کا باعث بن رہا تھا اور ان نظریات کے گرد نئی سوسائٹیاں اور گروپ تشکیل پا رہے تھے۔

اس دوران 1911ء کے انقلابیوں کی پارٹی کومنتانگ اپنی متروکیت کے باعث کوئی واضح کردار ادا کرنے سے قاصر تھی۔اس کے ''دائیں'' بازو سے وابستہ افراد مختلف علاقائی سرداروں کے رحم و کرم پر تھے جبکہ سن یاٹ سین ابھی بھی سیاسی طریقہ کار کی بجائے عسکری طریقہ کار کے ذریعے مختلف علاقائی سرداروں کے ساتھ مل کر انقلاب کی کوشش میں مصروف تھا۔اس نے 'تین عوامی اصولوں' کی پالیسی دی جو درپیش سماجی مسائل کا واضح حل دینے کی بجائے متذبذب نقطہ نظر کا اظہار تھیں۔اس کا نیشنلزم کا اصول سامراجی طاقتوں کے خلاف لڑنے کا کوئی طریقہ نہیں پیش کرتا تھا۔ بلکہ پہلے صدر کی حیثیت سے اپنے دور اقتدار میں سین ان طاقتوں کے آگے جھک گیا تھا۔پہلی عالمی جنگ کے بعد سین مختلف عالمی طاقتوں سے رحم کی اپیل کرتا ہوا ان کے بہتر برتاؤ کے ذریعے کوئی حل تلاش کرنا چاہتا تھا۔سین چین میں رہنے والی مانچو، منگول، تبتی اور دیگر اقلیتی قومیتوں کو بھی چینی نیشنلزم کے تحت ہان چینیوں کے اقتدار میں اکٹھا کرنا چاہتا تھا اور ان قومیتوں کے حقِ خودارادی کا مطالبہ بہت تاخیر سے اس کے پروگرام میں شامل ہوا۔

اس کی سوچ تھی کہ جمہوریت کے اصول کے تحت ''جاہل'' اور پسماندہ عوام کو روشن خیال راہنما اندھیروں سے باہر نکالیں گے۔اس کی 'جمہوریت' میں عوام کے سیاسی حقوق اور آزادی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔اس کے ''عوام کی زندگیوں'' کے اصول کے تحت بھی زرعی سوال کو حل کرنے کے بارے میں مبہم رائے دی گئی تھی جسے سین مختلف تشریحوں کے ذریعے وقت کی مناسبت سے موزوں بنانے کی کوشش کرتا رہا۔4 مئی کی تحریک کے بعد سین کی کومنتانگ بھی اس سیاسی ہلچل میں قدم رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور اسے سامعین بھی مل رہے تھے۔مختلف طلبا کے اکٹھ میں وہ

تقریریں کر کے اپنی سیاست کو ختم ہونے سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

اس دوران مارکسی نظریات اور تصانیف بھی نوجوانوں میں پھیل رہی تھیں اور مختلف سٹڈی سرکل اور تربیتی نشستوں میں ان نظریات پر بحث کی جا رہی تھی۔ 1918ء اور 1919ء میں جو سوشلسٹ سوسائیٹیاں اور گروپ بنے وہی 1920ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد بنے۔ ان میں شنگھائی کمیونسٹ گروپ، سوشلسٹ کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ لیگ سمیت مختلف تنظیمیں تھیں۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں 4 مئی کی تحریک کے بھی بہت سے قائدین شامل تھے جن میں پیکنگ نیشنل یونیورسٹی کا پروفیسر چین ڈوشو بھی شامل تھا جس نے 4 مئی کی تحریک میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ جولائی 1921ء میں ہونے والے شنگھائی میں تاسیسی اجلاس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے افراد نے شرکت کی جنہیں جلد ہی طبقاتی کشمکش کے میدانِ کارزار میں اہم ذمہ داریاں ادا کرنی تھیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو جلد ہی اپنی زندگیوں کو قربان کر گئے لیکن ماؤزے تنگ اور کچھ دیگر افراد نے چین کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرنا تھا وہ فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ تاسیسی اجلاس میں چین ڈوشو کو پارٹی کا پہلا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

کمیونسٹ پارٹی کا قیام

مارکسزم کی تصانیف کا چینی زبان میں پہلا ترجمہ 1899ء میں ہو چکا تھا لیکن 1918ء تک مارکسزم کے نظریات کو چین میں زیادہ پذیرائی نہیں ملی تھی اور اس موضوع پر بحثیں بہت محدود تھیں۔ لیکن 1917ء کے انقلاب روس کے بعد اس میں تیزی آنے لگی اور مارکسزم کے نظریات چین میں مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ اس سے پہلے مارکسزم میں دلچسپی تاریخی مادیت تک محدود تھی اور چین کی تاریخ کو ان بنیادوں پر دیکھنے کے لیے مارکسزم کا حوالہ دیا جاتا تھا لیکن 1917ء کے بعد سیاسی اور سماجی موضوعات میں مارکسزم کے نظریات زیر بحث آنا شروع ہوئے۔ 1920ء کے وسط میں سوویت یونین اور یورپ میں زیر تعلیم طلبا نے مارکسی تصنیفات کا چینی زبان میں ترجمہ شروع کر دیا تھا لیکن اس سے پہلے مارکسی تصنیفات چین میں پہنچانے کا سہرا جاپانی ترجمہ نگاروں کے سر جاتا ہے۔ 1921ء میں جب چین کی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اس وقت تک مارکسی تصنیفات جاپان سے ترجمہ ہو کر چین میں پہنچتی تھیں۔ مارکسی اصطلاحات کے چینی زبان میں ترجمے کے لیے بھی

جاپانی مترجموں کی مدد لی جاتی تھی جن میں سب سے اہم نام کاواکامی حاجیمے (Kawakami Hajime) کا ہے جو اس دور میں مادی نقطہ نظر رکھنے والا ایک اہم مصنف تھا اور تراجم کے ساتھ اس کی تشریحات کو چین میں قبول کیا جاتا تھا۔ دیگر بہت سے مارکسی جاپانی مصنفین کی تحریروں کا بھی چینی زبان میں ترجمہ کیا گیا جن میں تاکاہاتا موتویوکی (Takahata Motoyuki) بھی شامل ہے جس نے سرمایہ کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا۔

انقلاب روس کے بعد کے چند سالوں میں مارکس اور اینگلز کی بنیادی تصانیف کے چینی تراجم کے باعث مارکسزم کے نظریات کے فروغ میں آسانی پیدا ہوائی۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو جس کا ایک حصہ جو صدی کی پہلی دہائی میں ہی ترجمہ ہو چکا تھا اس دوران مکمل ہوا۔ جبکہ اینگلز کی ''سوشلزم۔۔۔ سائنسی اور خیالی'' کا بھی ترجمہ ہوا۔ جاپانی مارکسی کاکاواکامی کی 1920ء کی ایک تحریر میں مارکس کی تصانیف مقدس خاندان، فلسفے کی غربت، مینی فیسٹو، اجرت، محنت اور سرمایہ کے بہت سے حوالے ملتے ہیں۔ یہ تحریر بھی چینی زبان میں ترجمہ ہوئی اور اس سے چین میں سامراجی جنگ کے خلاف تحریکوں میں شامل بہت سے طلبا اور اساتذہ نے فیض حاصل کیا۔

1921ء میں معروف جاپانی مصنف اور سیاسی کارکن آکوتاگاوا (Akutagawa Ryunosuke) شنگھائی کے دورے پر گیا۔ اس دوران وہ جن مقامات پر گیا وہ بہت زیادہ تبدیل ہو چکے ہیں لیکن ایک جگہ اب بھی ویسی ہی ہے۔ اس عمارت کا موجودہ پتہ 76 Xingye روڈ، ضلع لوان، شنگھائی ہے۔ 1919ء میں اس کا پتہ مختلف تھا۔ اس عمارت کے باہر آج ایک تختی لگی ہوئی ہے جس پر لکھا ہے، ''چینی کمیونسٹ پارٹی کی تاسیسی کانگریس کا مقام''۔ کانگریس کے انعقاد سے تین ماہ پہلے ہی آکوتاگاوا نے یہاں کا دورہ کیا تھا۔ وہ ''نوجوان چین'' کے ایک نمائندے لی رینجی (Li Renjie) سے ملنے یہاں آیا تھا جسے تاریخ لی ہانجن (Li Hanjun) کے نام سے جانتی ہے۔ ہانجن چین کی کمیونسٹ پارٹی کا تاسیسی ممبر تھا۔ اس نے 1927ء میں پارٹی چھوڑ دی اور ایک علاقائی سردار کے ہاتھوں مارا گیا۔ آکوتاگاوا اپنی ملاقات کے بارے میں لکھتا ہے،

''میں اور مرا تا مسٹر رینجی سے ملنے گئے۔ وہ ابھی 28 سال کی عمر کو نہیں پہنچے۔ نظریاتی طور پر سوشلسٹ اور ''نوجوان چین'' کے شنگھائی میں نمائندے ہیں۔۔۔ مسٹر لی نے بتایا، 'ہم آج کے

چین کو کیسے تبدیل کریں۔ نہ ہی جمہوریہ مسائل کا حل ہے اور نہ ہی (پرانے نظام کی) بحالی۔ سیاسی انقلاب چین کی اصلاح کرنے میں ناکام رہا ہے اور ماضی کے چند سال اور موجودہ حالات اس کا ثبوت ہیں۔ واحد رستہ جس کی جانب ہم جدوجہد کر رہے ہیں وہ ایک سماجی انقلاب ہے۔ اگر ہم نے یہاں سماجی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمیں پراپیگنڈہ تیز کرنا ہوگا۔ اسی لیے ہم کتابیں اور مضامین لکھ رہے ہیں۔ (انقلاب کے) بیج ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہزاروں میل کا بیابان ہمارے سامنے ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ ہمارا عزم اس فریضے کے مطابق نہیں۔ کیا ہمارا جسم اس جدوجہد کو برداشت کر سکے گا؟ میں یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں'۔

اس نے یہ بات کہہ کر آنکھیں بند کر لیں''۔

اس ملاقات کے دو ماہ بعد لی ہانجن کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی جانب سے ہدایات ملیں کہ کمیونسٹ پارٹی آف چین (CCP) کا تاسیسی اجلاس منعقد کیا جائے۔ اس نے مختلف شہروں سے ممبران کو اجلاس میں شرکت کی دعوت دینی شروع کر دی۔ اسی دوران وہ مختلف رسالوں اور اخباروں میں سوشلسٹ نظریات کا پرچار بھی کر رہا تھا۔ آکاتو گاوا نے اس کے طرزِ تحریر اور نظریاتی پختگی کی تعریف کی تھی۔ 30 اپریل کو جاپان کے شہر اوساکا میں مقیم ایک رپورٹر کو ایک خط میں آکاتو گاوا نے شنگھائی میں مختلف افراد سے ملاقاتوں کا ذکر کیا لیکن اس ملاقات کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''لی رینجی نام کا ایک شخص غیر معمولی قابلیت کا حامل ہے''۔

تاسیسی اجلاس میں شریک تمام 13 افراد انہیں خصوصیات کے حامل تھے۔ 1949ء کے انقلاب کی کامیابی کے موقع پر ان میں سے صرف چھ افراد حیات تھے، لیکن صرف دو افراد، ماؤزے تنگ اور ڈانگ بیوو (Dong Biwu) نے ہی اپنی آنکھوں سے تیانامین چوک پر یکم اکتوبر 1949ء کو ہونے والی تقاریب کو دیکھا۔

اس تاسیسی اجلاس میں 4 مئی کی تحریک کے اہم راہنما لی ڈازہاؤ (Li Dazhao) بھی شریک تھے جو لینن ازم کی جانب آنے والے چین کے اولین دانشوروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ 21 تا 23 جولائی 1921ء کو ہونے والے اجلاس میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کے حصے کے طور پر چین کی کمیونسٹ پارٹی کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی اور ''چین ڈوشؤ'' کو جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ شنگھائی میں ایک لیبر سیکرٹریٹ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور چین کے محنت کش طبقے کو منظم کرنے کی

جدوجہد کا آغاز ہوا۔

تیسری انٹرنیشنل

چین کی کمیونسٹ پارٹی کے قیام میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کا کلیدی کردار ہے۔ سوویت حکومت 25 جولائی 1919ء کو ہی چین میں زار کے عہد کے سامراجی عزائم اور اقدامات سے دستبردار ہو چکی تھی اور چین کو اس کا علاقہ واپس کرنے کے لیے تیار تھی۔ 27 اکتوبر 1920ء کو دوبارہ یہ اعلان دہرایا گیا اور ایک نمائندے کے ذریعے اس معاہدے کے لیے کام شروع کر دیا گیا۔ بالشویک انقلاب کو سبوتاژ کرنے کے لیے سامراجی طاقتوں کے ساتھ مقابلے کے باعث اس پیش رفت میں تاخیر ہوئی لیکن اس کے باوجود سوویت حکومت کے اس اعلان پر چین کی باشعور پرتوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ بالشویک نظریات کی حمایت کرنے لگے۔

1920ء میں پیٹروگراڈ میں ہونے والی کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس میں نوآبادیاتی ممالک میں سوشلسٹ انقلاب کے کردار پر بحث کی گئی اور اس کانگریس میں قومی اور نوآبادیاتی سوال پر ایک دستاویز بھی اتاری گئی جسے ایم این رائے نے تیار کیا تھا۔ اس کانگریس کے چوتھے سیشن میں 25 جولائی کو لینن نے اس موضوع کا تعارف کرایا جس کے بعد مارینگ نے تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ کے بعد ایم این رائے نے اپنی دستاویز پیش کی۔ اس بحث میں نوآبادیاتی ممالک میں سامراجی ممالک کیخلاف قومی آزادی کی جدوجہد کو طبقاتی کشمکش سے جوڑتے ہوئے انقلاب کے سفر کو سوشلسٹ منزل کی جانب لے جانے پر تفصیلی غور کیا گیا۔

اس موضوع پر بحث کے نتیجے میں کمیونٹرن کی جانب سے نوآبادیاتی ممالک میں کمیونسٹ پارٹیوں کے قیام اور ترویج پر کام شروع ہو گیا۔ ستمبر 1920ء میں ''باکو'' (قازقستان) کے مقام پر کمیونٹرن کی جانب سے 'مشرق کے عوام کی کانگریس' کا انعقاد کیا گیا جس میں نوآبادیاتی ممالک کے عوام سے سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد میں شمولیت کی اپیل کی گئی۔ اس کانگریس کے 1900 مندوبین میں دیگر ایشیائی ممالک کے علاوہ چین سے بھی آٹھ مندوبین شامل تھے۔ اسی سال سائبیریا میں ارکٹسک (Irkutsk) کے مقام پر مشرقِ بعید میں نظریات پھیلانے کے لیے کمیونٹرن کا بیورو قائم کیا گیا جس میں وائے تنسکی (Voitinsky) کو سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس نے روس میں انقلاب کے بعد خانہ جنگی کے دوران اسی محاذ پر اہم ذمہ داریاں ادا کی تھیں۔

اس بیورو کے قیام کے بعد کوریا اور جاپان میں بھی بالشویک پارٹی کی طرز پر کمیونسٹ پارٹیاں بنانے کے عمل کا آغاز ہوا۔ اس دوران ان ممالک میں بھی انقلابی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔

1921ء میں تیسری انٹرنیشنل کی مرکزی مجلسِ عاملہ ''کمیونٹرن'' کے نمائندے وائے تنسکی کی ملاقات پیکنگ میں چین ڈوشو سے ہوئی جو 'نئے نوجوان' (New Youth) کے نام سے ایک مارکسی میگزین کی اشاعت جاری رکھے ہوئے تھا۔ وائے تنسکی کی تجویز پر کمیونسٹ پارٹی کے قیام کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا گیا۔ مئی 1920ء میں ایک عبوری مرکزی کمیٹی قائم کر دی گئی اور ''دی کمیونسٹ'' کے نام سے ایک پرچے کا اجرا کیا گیا۔ چین ڈوشو اور چین تائی لی نے مل کر سوشلسٹ یوتھ لیگ کا بھی آغاز کیا۔ جلد ہی دوسرے شہروں میں بھی کام کا آغاز ہو گیا اور پیکنگ کے علاوہ شنگھائی، ووہان، چانگشا، کینٹن اور سینان میں چھوٹے گروپ بنتے گئے۔ فروری 1921ء میں پیرس میں بھی ایک گروپ قائم ہو گیا جس میں سرکردہ کردار چواین لائی ادا کر رہے تھے۔ جولائی 1921ء کے تاسیسی اجلاس کے موقع پر کمیونسٹ پارٹی کے 50 کے قریب ممبران تھے جبکہ سینکڑوں نوجوان مختلف تنظیموں میں منظم تھے۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کے قیام کے فوری بعد جو اہم مسئلہ درپیش تھا وہ ایک پرولتاری پارٹی کی حیثیت سے کومنتانگ سے اس کے تعلق کا تھا۔ قومی آزادی کی تحریک سے محنت کش طبقے کے تعلق کی بحث آنے والے دور میں جدوجہد کی بنیاد بنی۔ کمیونٹرن کی دوسری کانگریس میں لینن نے واضح کر دیا تھا کہ سامراج کے اس عہد میں نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ممالک میں قومی آزادی کی تحریکوں میں مداخلت کر کے ان کو محنت کش طبقے کی تحریک کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ ان قومی تحریکوں سے تال میل ضروری ہے لیکن پرولتاری پارٹیوں کی آزادانہ تنظیم سازی کو اس اتحاد پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔

1922ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس کے موقع پر کومنتانگ کے ساتھ الائنس کی تجویز پیش کی گئی۔ اس سے پہلے سن یاٹ سین اس تجویز کو رد کر چکا تھا اور اس کا مؤقف تھا کہ کمیونسٹ انفرادی طور پر اس کی پارٹی میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن وہ کسی ایسے الائنس کو رد کرتا ہے۔ اس کے بعد کمیونٹرن کا چین میں نمائندہ مارینگ چینی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبران سے ملا اور انہیں اس الائنس کی تجویز پیش کی تا کہ کمیونسٹ کومنتانگ کی عوامی بنیادوں تک

رسائی حاصل کر سکیں اور اپنے روابط بڑھا سکیں۔ مارینگ کے مطابق CCP کی مرکزی کمیٹی کی اکثریت اس تجویز سے متفق تھی۔ جن افراد نے اس تجویز کی مخالفت کی وہ سمجھتے تھے کہ کومنتانگ سیاسی طور پر اتنی وسیع بنیادیں نہیں رکھتی اور کسی عوامی تحریک کی قیادت نہیں کر سکتی۔ بحث کے بعد اس تجویز کو قبول کر لیا گیا لیکن کومنتانگ کی قیادت کی جانب سے جواب کا انتظار تھا۔

مارینگ اس سے پہلے انڈونیشیا جسے اس وقت جاوا کہا جاتا تھا، میں یہ تجربہ کر چکا تھا۔ وہاں جنگ سے پہلے بائیں بازو کے سوشل ڈیموکریٹوں نے ایک مذہبی، سماجی تحریک شراکت الاسلام میں شرکت کی تھی اور اسے سامراجیوں کے خلاف استعمال کیا تھا۔ دوسرا مارینگ کمیونٹرن کی دوسری کانگریس میں ہونے والی بحثوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا اور وہ سین کی جنوبی چین کی ٹریڈ یونینوں کو قومی آزادی کی تحریک میں متحرک ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس نے 1920ء جنوری میں ہانگ کانگ میں بحری جہازوں کے محنت کشوں کی ہڑتال میں سین کا کردار دیکھا تھا۔ کینٹن میں کومنتانگ کے چین کی نوآموز مزدور تحریک سے اچھے مراسم تھے۔ اسی باعث مارینگ نے ارکٹسک بیورو کی پالیسی کو تبدیل کرتے ہوئے کمیونٹرن کو تجویز دی کہ کومنتانگ کے ساتھ روابط استوار کیے جائیں۔ اگست 1922ء میں سین کو کینٹن کی ایک بغاوت کے بعد وہاں سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس دوران واشنگٹن کانفرنس میں بھی چین میں سامراجی کردار سے دستبردار نہ ہونے کا فیصلہ کیا گیا جس کے باعث سین مایوسی کے عالم میں ماسکو سے امیدیں وابستہ کرنے لگا۔

اس حوالے سے پیش رفت سوویت حکومت کی جانب سے کی گئی جس نے سین سے باقاعدہ مذاکرات کے لیے ایڈولف جوفے کو ذمہ داری سونپی۔ 26 جنوری 1923ء کو جوفے اور سین نے مشترکہ بیان میں کہا کہ، ''چین میں کمیونزم اور سوشلزم کے قیام کے حالات موجود نہیں اور یہاں فوری مقصد قومی یکجہتی اور قومی آزادی کا حصول ہے''۔ جوفے نے سین کو یقین دلایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے سوویت روس اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

اس پالیسی کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ چینی کمیونسٹوں کا کام صرف کومنتانگ کی مدد کرنا ہے۔ اسی سال جب مائیکل بوروڈن کو سین کا مشیر مقرر کیا گیا تو وہ کمیونٹرن کے نمائندے کے طور پر نہیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کے پولٹ بیورو کے نمائندے کے طور پر آیا تھا۔ یہ فرق آنے والے وقت میں مزید واضح ہو گیا۔ بوروڈن کا کام کومنتانگ میں نئی روح پھونکنا تھا اور اب

چینی کمیونسٹوں کی تمام قوتیں اس مقصد کے لیے صرف ہونی تھیں۔

کمیونسٹوں کے سامنے یہ پروگرام رکھا گیا کہ قومی آزادی کے لیے اور سامراج کیخلاف جدوجہد کے باعث طبقات کے مابین کشمکش عارضی طور پر ملتوی ہوگئی ہے۔ یہ خیال کیا گیا کہ متضاد مفادات کے حامل طبقے ایک پارٹی میں اس لیے اکٹھے ہو سکتے ہیں کیونکہ سامراج نے ان طبقات کے مفادات کو جوڑ دیا ہے۔ یہ کہا گیا کہ بورژوازی نہ صرف انقلابی کردار ادا کرے گی بلکہ قومی جمہوری تحریک کی قیادت کرے گی۔ یہ کمیونٹرن کی دوسری کانگریس میں لینن کے مؤقف سے مکمل انحراف تھا۔ لیکن اس کے باوجود 1923ء میں کومنتانگ کے قائدانہ کردار کو مسلط کیا گیا۔ اسی پالیسی کے باعث 1923ء میں کمیونٹرن نے طبقات کے مابین اس کشمکش کو دھندلا کرنے والے مؤقف کو نظریاتی بنیادیں فراہم کیں اور کہا کہ کومنتانگ بورژوازی کی پارٹی نہیں بلکہ ایک ایسی پارٹی ہے جس میں مختلف طبقات سامراج کیخلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

بوروڈن نے سین کو قائل کیا کہ کومنتانگ کو ایک مضبوط تنظیمی ڈھانچے کی ضرورت ہے۔ سین نے جب بوروڈن کے کہنے پر مزدوروں اور کسانوں سے حمایت کی اپیل کی تو اس کے حیران کن نتائج حاصل ہوئے۔ اس کے بعد سین اور بوروڈن نے مل کر کومنتانگ اور سوویت یونین کے مابین ایک معاہدے کی دستاویز تیار کی جسے جنوری 1924ء میں کومنتانگ کی پہلی نیشنل کانگریس میں منظور کر لیا گیا۔ جس دن اس کانگریس کا آغاز ہوا، اسی دن لینن کی وفات ہوگئی۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ جس وقت لینن کا انتقال ہوا اس وقت سوویت یونین اور کمیونٹرن کے کچھ لیڈر چین میں ناقابل مصالحت سوشلسٹ جدوجہد کا نظریہ ترک کر رہے تھے۔

سوویت مشیر بوروڈن کی ہدایات پر کومنتانگ کو تنظیمی طور پر بالشویک طرز پر استوار کیا گیا اور پراپیگنڈہ اور احتجاج کے بالشویک طریقہ کار متعارف کرائے گئے۔ اس سے پہلے کومنتانگ جنگجو یا علاقائی سرداروں کے ساتھ مل کر لڑتی تھی جو جاگیردارانہ نظریات کے حامل تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے روسیوں نے مئی 1924ء میں ''وہامپوا'' (Whampoa) ملٹری اکیڈمی کی بنیاد رکھی تاکہ ایک نئی قومی فوج تعمیر کی جا سکے۔ اس اکیڈمی کو روسی امداد سے چلایا جاتا تھا۔ کومنتانگ اس نئے ڈھانچے کے تحت تیزی سے مضبوط ہونے لگی اور اس میں موجود کمیونسٹ اب زیادہ زور قومی جمہوری انقلاب کے نعروں پر دے رہے تھے۔ طلبا اور مزدوروں سے پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے والے کمیونسٹ پارٹی کے کارکنان کو پرولتاری انقلاب کے نظریات سے لیس کرنے کی

بجائے قومی جمہوری انقلاب کا نظریہ دیا جانے لگا۔ کمیونسٹ اپنا تناظر تخلیق کرنے کی بجائے کومنتانگ کی قیادت کے رحم و کرم پر تھے۔ لیکن یہ تمام جرائم اس وقت تک چھپے رہے جب تک کومنتانگ تیزی سے پھیلتی رہی اور ساتھ ہی ایک عوامی تحریک ابھرتی رہی۔ لیکن اس عوامی تحریک کے ابھرنے کا تعلق کومنتانگ سے نہیں تھا بلکہ سماجی حالات کے باعث ایسی معروضی کیفیت پیدا ہو چکی تھی جس میں ایسی تحریک کا ابھرنا ناگزیر تھا۔

اس دوران پورے چین میں ہڑتالوں کا سلسلہ تیزی سے ابھرنے لگا اور مزدور تحریک ایک بڑی جدوجہد کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب زوال پذیر کمیونٹرن چین میں قومی جمہوری انقلاب کی تیاری کر رہی تھی اسی وقت حالات ایک عظیم سوشلسٹ انقلاب کی جانب بڑھ رہے تھے۔

باب 5

1925-27ء کا انقلاب

یکم مئی 1925ء کو کینٹن میں مزدوروں اور کسانوں کا ایک عظیم الشان اکٹھ دیکھنے میں آیا۔ کئی سالوں سے مزدوروں اور کسانوں کی تحریک سماج میں پنپ رہی تھی اور مختلف ہڑتالیں اور احتجاجی مظاہرے ایک بہت بڑی تحریک کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ یکم مئی کو دوسری قومی لیبر کانفرنس منعقد کی گئی جبکہ اسی دوران کسان تنظیموں کی پہلی صوبائی اسمبلی کا بھی انعقاد ہوا۔ لیبر کانفرنس میں 230 مندوب شریک تھے جو 5 لاکھ 70 ہزار منظم مزدوروں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ کسان تنظیمیں ابھی کوانگ تنگ خطے کے 22 علاقوں تک ہی محدود تھیں، لیکن اس کے باوجود اس اجلاس میں 117 مندوب تھے جو 1 لاکھ 80 ہزار کسانوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس روز چین کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مزدوروں اور کسانوں نے اکٹھے مظاہرہ کیا۔ مظاہرے میں مندوبین کے علاوہ کینٹن شہر میں رہنے والے ہزاروں مزدور اور کسان بھی شریک ہوئے۔ مظاہرے کے دوران طلبا نے بھی ان کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا اور ایک عظیم انقلاب کی بنیاد رکھی۔

چند ہفتوں بعد کینٹن پر براجمان وار لارڈز نے اپنا تسلط جمانے کی دوبارہ کوشش کی لیکن ایک مسلح جدوجہد کے بعد انہیں مزدوروں اور کسانوں نے شکست دے دی۔ اسی دوران شنگھائی کے محنت کش بھی غلامی کی طرز کی زندگی کے خلاف احتجاج میں ابھر رہے تھے اور 1925ء کے

آغاز میں بڑی ہڑتالیں دیکھنے میں آ رہی تھیں۔ خاص طور پر جاپانی سرمایہ داروں کی فیکٹریوں میں زیادہ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ سنگ تاؤ میں ہڑتالی محنت کشوں پر گولی چلانے اور خاص طور پر ایک جاپانی فورمین کی جانب سے ایک چینی مزدور کے قتل کے بعد حالات سنگین ہو گئے اور سطح کے نیچے پکتا ہوا لاوا پھٹ پڑا۔ شنگھائی کے محنت کشوں اور طلبا نے ایک احتجاجی مظاہرہ کیا جس پر کئی مظاہرین کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد مظاہرین پولیس اسٹیشن کی جانب بڑھے تو ایک برطانوی افسر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ طلبا زمین پر گرنے لگے۔ 12 طالب علم ان گولیوں کی نذر ہو گئے۔ یہ 30 مئی کا دن تھا۔

اس کے انتہائی طوفانی اثرات مرتب ہوئے۔ شنگھائی جو سامراجی طاقتوں کا مرکز تھا اور جہاں غیر ملکی بینک اور فیکٹریاں بڑی تعداد میں تھیں، ایک عام ہڑتال سے جام ہو گیا۔ ایسا لگا کہ ایک بہت بڑا دیو متحرک ہو گیا ہے۔ سرمایہ داروں اور سامراجی اہلکاروں کے دل دہل گئے۔ اس طوفان کے اثرات سمندر پار بھی محسوس کیے جانے لگے۔ یہ ہڑتال پورے ملک میں پھیل گئی۔ ایک غیر مکمل اندازے کے مطابق صرف 30 مئی کے واقع کے خلاف 130 ہڑتالیں ہوئیں جس میں 4 لاکھ محنت کشوں نے حصہ لیا۔ یہ ہڑتالیں جنوب میں کینٹن اور ہانگ کانگ سے لے کر شمال میں پیکنگ تک پھیلی ہوئی تھیں۔

عام ہڑتال کے دوران برطانوی اشیا کے بائیکاٹ کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ ہانگ کانگ جو چین میں برطانوی سامراج کا قلعہ تھا ان کے خلاف کھڑا ہو گیا۔ ایک بھی پہیہ نہیں گھوم رہا تھا اور نہ ہی سامان کا کوئی ایک ڈبہ جہاز سے اتارا یا چڑھایا گیا۔ کوئی جہاز بندرگاہ سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ ہانگ کانگ کے ایک لاکھ سے زیادہ محنت کش اکٹھے کینٹن چلے گئے۔

کینٹن میں محنت کشوں نے جوئے اور منشیات کے اڈوں کی صفائی کی اور انہیں ہڑتالیوں کی رہائش اور کھانے کی جگہ کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ دو ہزار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جو ہانگ کانگ اور شامین کے گرد رکاوٹیں کھڑی کرے گی اور ان کا تحفظ بھی۔ پوری تحریک کو انتہائی مہارت سے منظم کیا گیا۔ ہر پچاس ہڑتالی ایک مندوب منتخب کرتے جو ہڑتالیوں کے مندوبین کی کانفرنس میں شرکت کرتا اور یہ کانفرنس تیرہ افراد پر مشتمل ایگزیکٹو کمیٹی منتخب کرتی۔ چین میں سوویتوں (محنت کشوں کی پنچائتوں) کا جنم ہو چکا تھا۔ اسی انتظام کے تحت محنت کشوں کے لیے ایک ہسپتال اور 17 سکولوں کا اہتمام کیا گیا۔ فنڈ اور دیگر معاشی معاملات کے لیے خصوصی کمیٹیاں

بنائی گئیں۔ ہڑتالیوں کی عدالت بھی قائم کی گئی جس میں بائیکاٹ کی خلاف ورزی کرنے اور امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں پر مقدمہ چلایا جاتا۔

سامراجی قوتوں نے غنڈوں کی مدد سے ہڑتال کو توڑنے کی متعدد کوششیں کیں اور اس دوران دیہاتوں میں رہنے والا کوئی ایسا غنڈہ نہیں تھا جس نے برطانوی پونڈ کی شکل نہ دیکھی ہو۔ لیکن ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود ہڑتال کو نہیں توڑا جا سکا۔

اس ہڑتال کا فائدہ کومنتانگ کو پہنچا جس نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور جون کے آخر تک قومی حکومت قائم کر لی۔ 1925ء کے آخر تک کومنتانگ نے مقامی جنگجو سردار کے خلاف فتوحات حاصل کرتے ہوئے وسیع حصے پر اپنا اقتدار مستحکم کر لیا۔

اس عوامی تحریک کے باعث، جس کے روحِ رواں کمیونسٹ پارٹی کے کارکنان تھے، دو سالوں میں کومنتانگ ایک شکستہ حال پارٹی کی شکل میں اقتدار پر براجمان ہو گئی تھی۔ جنوبی علاقوں میں اقتدار مضبوط کرنے کے بعد اس نے شمالی علاقوں کی جانب پیش قدمی کی۔ کومنتانگ کی شکل میں چین میں ایک پارٹی قائم ہو چکی تھی لیکن اسے کس طبقے کے مفادات کے لیے استعمال کیا جانا تھا اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔ 1925ء کی انقلابی تحریک نے درحقیقت چین میں طبقاتی کشمکش کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا تھا۔

چیانگ کائی شیک

تجارت سے وابستہ چی کیانگ (Chekiang) خاندان کا چشم و چراغ 1911ء کے انقلاب کے وقت ٹوکیو کی ملٹری اکیڈمی میں تھا۔ انقلاب کے بعد وہ فوری طور پر واپس آیا اور جنرل چین چی می کے دستوں میں شامل ہوا اور سن یاٹ سین سے ملاقات کی۔ اس دوران چیانگ کائی شیک شنگھائی کے غنڈوں اور انڈر ورلڈ کے افراد سے مل کر کام کرنے لگا جہاں اسمگلر، قاتل، ڈاکو اور سماج کے بچھڑے ہوئے لمپن حصے یکجا ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ وہ شنگھائی اسٹاک ایکسچینج میں بروکر کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔ اسی دوران اس کے دوستوں نے اسے سین کے ساتھ کام کرنے کے لیے کینٹن بھیج دیا۔

جب سین کے سوویت حکومت سے تعلقات استوار ہوئے تو اس نے چیانگ کائی شیک کو ماسکو بھیجا تا کہ سرخ فوج کا طریقہ کار اور سوویت نظام کو سمجھ سکے۔ چیانگ جولائی 1923ء میں

روس گیا اور چھ ماہ تک وہاں رہا۔ایک برباد سماج سے آنے والے شخص کے لیے اس وقت کا ماسکو اور سرخ فوج ایک بہت بڑی حیرانگی کا باعث تھی۔اس نے انقلاب اور خانہ جنگی سے ابھرتی ہوئی ایک سرخ فوج کو دیکھا جو محنت کشوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی تھی۔بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ چیانگ کائی شیک نے اس دوران جو کچھ سیکھا وہ یہی تھا کہ عوام کی طاقت کو کیسے سیاسی اور فوجی عزائم کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔واپس آ کر اس نے ''عالمی انقلاب زندہ باد'' کے نعرے کے ذریعے اپنے اقتدار تک کے سفر کا آغاز کیا۔

روس سے واپسی پر چیانگ کائی شیک روس کے فوجی مشیروں اور بوروڈن کا منظورِ نظر بن گیا۔جب مئی 1924ء میں واہمپوا ملٹری اکیڈمی کی بنیاد رکھی گئی تو کائی شیک ہی ڈائریکٹر کے عہدے کے لیے موزوں شخص تھا۔واہمپوا اکیڈمی کے فارغ التحصیل فوجی اہم فوجی معرکوں میں کامیابیاں حاصل کرنے لگے جس سے کائی شیک کا اعتماد بڑھنے لگا۔اسی دوران مزدوروں اور کسانوں کی تحریک بھی زوروں پر تھی جس کے اثرات اکیڈمی میں بھی پڑ رہے تھے۔اکیڈمی کے طلبا میں دائیں اور بائیں بازو کی تفریق واضح ہونے لگی۔خاص طور پر جب کسانوں نے منظم ہو کر جاگیروں پر قبضے شروع کیے تو اکیڈمی میں موجود جاگیرداروں کے بچوں نے ان کے خلاف کاروائیوں کے لیے الگ سے منظم ہونا شروع کر دیا۔اس دوران کمیونسٹ پارٹی کے کیڈر بھی الگ سے منظم ہونا شروع ہو گئے۔1925ء کے مختلف معرکوں کے دوران ان دونوں کے درمیان جھڑپیں بھی ہوئیں۔لیکن ابھی چیانگ کائی شیک کو ان دونوں کی ضرورت تھی اس لیے وہ انہیں اکٹھا کرنے پر زور دیتا رہا۔

چیانگ ابھی تک کومنتانگ کے سویلین لیڈروں کے ماتحت تھا اس لیے اسے ابھی عوامی تحریک، کمیونسٹوں، سوویت مشیروں اور سوویت امداد کی ضرورت تھی۔چیانگ کائی شیک دیگر جرنیلوں کو بھی مات دینے کے لیے عوامی تحریک کی قیادت پر براجمان ہونا چاہتا تھا۔چین کے نومولود سرمایہ دار طبقے کی بھی یہی خواہش تھی۔

بوروڈن اور ماسکو میں زوال پذیر سٹالنسٹ قیادت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انقلاب کی کامیابی کے لیے بورژوازی کا تعاون کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ان کے لیے محنت کش طبقے کا آزادانہ کردار اور ان کی طاقت اہمیت کی حامل نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس طبقے پر انحصار کرتے ہوئے ابھی تک صرف قومی جمہوری (بورژوا) انقلاب ہی کو مکمل کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔دونوں طبقات

کے باہمی تضادات اور تصادم بھی ان کی سوچ کو تبدیل نہ کر سکے۔ یہ خیال اس حد تک پختہ ہو گیا کہ کمیونٹرن کے لیے اب کومنتانگ لبرل بورژوازی کی پارٹی نہیں رہی تھی جس کے ساتھ کمیونسٹ ایک عارضی اتحاد میں تھے بلکہ ''کومنتانگ مزدوروں، کسانوں، دانشوروں اور بورژوازی کے ایک انقلابی اتحاد کی نمائندہ ہے۔ اسی بنیاد پر سماج کا یہ حصہ اپنے طبقاتی مفادات کے لیے سامراجیوں کے خلاف برسر پیکار ہے اور ایک انقلابی جمہوری حکومت کے لیے اور ملک کی آزادی کے لیے اس فوجی اور جاگیردارانہ کُل کے خلاف لڑ رہے ہیں۔'' (چینی سوال پر قرارداد، کومنٹرن کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں منظور ہوئی، 13 مارچ 1926ء)

اس قرارداد کی بنیاد طبقاتی مفادات تھے نہ کہ طبقاتی تضادات۔ اس نقطہ نظر سے یہ ابہام پیدا ہوا کہ بورژوازی اور محنت کش طبقہ سامراجیوں کے ہاتھوں ایک ہی طرح کے استحصال کا شکار ہیں۔ بوروڈن نے جب چیانگ کائی شیک کو کومنتانگ کی قیادت کے لیے منتخب کیا اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا۔ اس کے مطابق بورژوازی کا جو حصہ سامراج کے خلاف لڑنا چاہتا ہے چیانگ کائی شیک اس کی قیادت کرے گا۔ چیانگ کائی شیک بھی بوروڈن کے سامنے انقلابی بیان بازی کرتا رہتا اور اسے بھی کومنتانگ کی قیادت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

چینی کمیونسٹ پارٹی کے بیشتر لیڈروں کی بھی کبھی ایسی تربیت نہیں کی گئی کہ وہ ایک عوامی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے اسے آزادانہ سیاسی جدوجہد کی جانب لے کر چلتے اور محنت کش طبقے کے مفادات کو مقدم رکھتے ہوئے ان کے لیے لڑتے۔ اس کے برعکس انہیں ہمیشہ کومنتانگ کا دم چھلا بن کر چلنے کو کہا گیا تا کہ بورژوا قوم پرست تحریک کی قیادت کر سکیں۔ تمام تر اقتدار اور شان وشوکت کومنتانگ کے لیے مخصوص کر دی گئی۔

سٹالن اور پارٹی کے دیگر ممبران نے جنوری 1926ء میں سی پی ایس یو (کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین) کی پارٹی کانفرنس کی جانب سے کومنتانگ کی دوسری کانگریس کو پیغام بھیجا کہ ''ہماری پارٹی پر دنیا کے پہلے کامیاب پرولتاری انقلاب کی فتح کی قابلِ فخر اور تاریخی ذمہ داری تھی۔۔۔ ہمیں یقین ہے کہ کومنتانگ مشرق میں یہی کردار ادا کرے گی اور ایشیا میں سامراجیوں کی حکمرانی کی بنیادیں ختم کرے گی''۔

سٹالن نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کومنتانگ ''یونائیٹڈ فرنٹ'' نہیں ہے بلکہ مزدوروں اور کسانوں کے اتحاد کا سیاسی اظہار ہے۔ چین کی بورژوازی بھی کمیونٹرن کی اس حمایت پر ان کی شکر

گزار تھی اور کینٹن کے سرمایہ داروں کی چیمبر آف کامرس نے عالمی انقلاب زندہ باد کے نعرے پر بھی دستخط کیے۔ کمیونسٹ جو 1925ء کی تحریک میں کلیدی کردار ادا کر رہے تھے، مزدور تحریک کو منظم کر رہے تھے اور کسانوں کی بغاوتوں کی قیادت کر رہے تھے انہیں ماسکو کی جانب سے مجبور کیا گیا کہ وہ کومنتانگ کے ماتحت کام کریں اور اپنے کسی بھی آزادانہ کردار سے باز رہیں۔ انہیں بتایا گیا کہ محنت کش طبقہ ابھی کمزور ہے اور اقتدار پر قابض نہیں ہو سکتا۔ اسی پالیسی نے چیانگ کائی شیک کو موقع دیا کے وہ کچھ عرصہ بعد بڑی تعداد میں کمیونسٹوں کو قتل کروائے۔

اس دوران سوویت یونین میں لیون ٹراٹسکی کمیونٹرن کی غلط پالیسیوں کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا اور چین کے انقلاب کو خون میں ڈبونے کی سٹالنسٹ پالیسیوں کو عیاں اور ان کا تناظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے لکھا،

''چلو یہ مان لیتے ہیں کہ کینٹن کے محنت کش ابھی اتنے کمزور ہیں کہ اپنا اقتدار قائم نہیں کر سکتے۔ عوام کا کمزور نکتہ کیا ہے؟ یہی کہ استحصال کرنے والوں کے پیچھے چلنے کا رجحان۔ یہاں انقلابیوں کا پہلا فریضہ یہ بنتا ہے کہ وہ محنت کشوں کو اس بداعتمادی سے نجات دلائیں۔ لیکن کمیونٹرن کی بیوروکریسی کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات اس کے بالکل الٹ ہیں۔ انہوں نے عوام میں یہ خیال مضبوط کیا ہے کہ سب کچھ بورژوازی پر چھوڑ دیا جائے اور انہوں نے کہا کہ بورژوازی کے دشمن محنت کشوں کے دشمن ہیں۔'' (ٹراٹسکی، چین پر مضامین)

بوروڈن کے مطابق اگر جارحانہ پالیسی اختیار کی جاتی تو ''تحریک خون میں ڈوب جاتی''۔ لیکن بورژوازی کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے باعث نہ ہی فتح نصیب ہوئی اور خون کا سمندر آنے والے عرصے کے لیے ملتوی ہو گیا۔ چین میں چین ڈوشو نے ماسکو کی سرکاری لائن کے خلاف کومنتانگ سے الگ کمیونسٹ پارٹی کی آزادانہ تحریک کی تجویز بھی دی تھی جسے رد کر دیا گیا تھا۔

20 مارچ 1926ء کا کُو (قومی بغاوت)

18 مارچ 1926ء کو چیانگ کائی شیک نے ایک سازش کے تحت ایک کمیونسٹ کی کمان میں بحری جہاز چنگ شان (Chungchan) کو کینٹن سے واہمپوا کی جانب روانہ کیا۔ جب یہ بندرگاہ سے نکل گیا تو چیانگ نے افواہ پھیلانی شروع کر دی کہ یہ بحری جہاز بغیر اجازت کے نکلا ہے اور کمیونسٹ پارٹی کومنتانگ کی حکومت کے خلاف سرکشی کی تیاری کر رہی ہے۔ 20 مارچ کو

چیانگ کائی شیک نے واہمپوا کی فوجی اکیڈمی اور ''قومی انقلابی فوج'' میں کمیونسٹ ممبران کی حراست کے احکامات جاری کر دیے۔ کینٹن، ہانگ کانگ ہڑتالی کمیٹی کے دفاتر اور روس سے آئے ہوئے کومنٹانگ کے مشیروں کی رہائش گاہوں کا محاصرہ کروادیا گیا۔ قومی انقلابی فوج کی پہلی ڈویژن میں سے تمام کمیونسٹوں کو برطرف ہونا پڑا۔ سٹالنزم کی دائیں بازو کی جانب مصلحت پسندی کے رجحانات کے تحت جنم لینے والی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کی مصلحت پسند پالیسیوں کی وجہ سے چیانگ کائی شیک کو چین کی قومی فوج کو اپنے زیر کنٹرول لینے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ 15 مئی کو کومنٹانگ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں ایک قرارداد کے ذریعے کومنٹانگ کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والے کمیونسٹ پارٹی کے اراکین کو برطرف کر دیا گیا اور حکومت کے کسی بھی شعبہ میں کمیونسٹوں کو کوئی بھی اہم عہدہ دینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس طرح مصلحت پسندی کی یہ پالیسی کمیونسٹ پارٹی کی پسپائی کا باعث بننے لگی تھی۔

دوسری جانب سامراجیوں نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انقلاب کو کچلنے کا کام تیز کر دیا۔ 24 مارچ 1927ء کو انہوں نے نانجنگ کے شہر پر شدید بمباری کی۔ چیانگ کائی شیک جس کو سامراج دشمنی کے نام پر کمیونسٹوں کی مکمل حمایت دلوائی گئی تھی اب سامراجیوں کے ساتھ مل کر انقلاب کو کچلنے میں مصروف تھا۔ سامراجیوں نے اس فوجی بورژوازی کو شنگھائی میں پوری رسد پہنچانا شروع کر دی۔ 12 اپریل 1927ء کو چیانگ کائی شیک نے ایک فوجی ایکشن کے ذریعے ہزاروں مزدوروں کا قتل عام کروایا۔ چیانگ مارشل لاء لگانے سے پہلے ہی کھلے عام کمیونسٹ دشمن سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا لیکن کمیونٹرن اس کی حمایت کرنے پر زور دیتی جا رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے لیڈروں نے بھی ماسکو کے دباؤ پر چیانگ کی حمایت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود چیانگ اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے سرگرم عمل تھا۔ ان تمام کاروائیوں کے باوجود انقلابی سرگرمیاں جاری تھیں۔

3 جنوری 1927ء کو ہانکو میں برطانوی تنصیبات کو انقلابی سرکشی کے ذریعے قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ شمالی مہمات میں چیانگ کی فوجوں نے اپنی پیش قدمی اس لیے سست کر دی تھی تاکہ وہاں کے جنگی سردار انقلابی کسانوں اور محنت کشوں کے ابھار کا قتل عام کر سکیں۔ 21 مارچ کی شنگھائی سرکشی کو کچلنے کے لیے چیانگ اور سامراجیوں نے مشترکہ کاروائی کی۔ اس میں مافیا اور سماج کے رجعتی اور دیگر غلیظ عناصر بھی شامل تھے۔ شنگھائی کے اس قتل عام کے بعد بھی حیران کن عمل ہے کہ

چین میں کمیونٹرن کے نمائندوں ایم این رائے اور ڈوراوٹ نے چیانگ کو تار بھیجا کہ وہ یکطرفہ کاروائی نہ کرے۔ اس کے برعکس چیانگ نے سامراجیوں کے ساتھ مل کر نانجنگ میں ایک انقلاب دشمن حکومت قائم کر لی۔ اپریل 1927ء میں چین کی کمیونسٹ پارٹی کی پانچویں قومی کانگریس ہوئی جس میں 80 مندوبین 57,967 ممبران کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس میں چین ڈوشو پر سٹالن کی ایما پر کی جانے والی تنقید کے باوجود وہ دوبارہ جنرل سیکرٹری چن لیا گیا۔ اس کانگریس میں ایک غلطی یہ کی گئی کہ وانگ چن وی کی نام نہاد ''بائیں بازو'' کی حکومت میں خوش فہمیاں پیدا کر کے اس کی حمایت کی گئی۔ یہ کومنتانگ کی نام نہاد بائیں بازو کی حکومت تھی۔ اس کی اصلیت بھی جلد ہی ظاہر ہوگئی۔ جب وانگ چن وی نے ووہان میں محنت کشوں کا قتل عام شروع کر دیا اور یہ حکومت بھی چیانگ کے ساتھ ملنا شروع ہوگئی۔ یہ الحاق سٹالن کی پالیسیوں کے تحت ہو رہے تھے جبکہ ٹراٹسکی نے وانگ سے کسی قسم کی مصالحت کے خلاف کمیونٹرن (کمیونسٹ انٹرنیشنل کی مجلسِ عاملہ) میں آواز اٹھائی تھی۔ اس سے پیشتر 1923ء میں بھی ٹراٹسکی نے چیانگ سے کسی قسم کی مصالحت اور اسکو اور اس کی پارٹی کو تیسری انٹرنیشنل کے ہمدرد کا رتبہ دینے کی مخالفت کی تھی۔ جون میں کمیونسٹ پارٹی نے پھر وانگ سے چیانگ کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی پالیسی پیش کی جس کا جواب وانگ نے کمیونسٹ پارٹی کے ممبران اور محنت کشوں کا مزید قتل عام کر کے دیا۔ قیادت کی ان متذبذب اور غیر مستقل پالیسیوں کا اس انقلابی خانہ جنگی کی ناکامی میں اہم کردار بنتا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ فیصلہ کن ردِ انقلابی کردار ادا کرنے والی کومنتانگ پارٹی کو کمیونسٹ پارٹی نے خون پسینہ دے کر مضبوط کیا۔

15 جولائی کو اس کومنتانگ کے بائیں بازو کی وانگ حکومت نے مارشل لا نافذ کر کے تمام محنت کشوں کی تنظیموں پر پابندی لگا کر بڑے پیمانے پر کمیونسٹوں کی گرفتاریوں کے ساتھ ساتھ محنت کشوں کا قتل عام بھی کیا۔ سوویت یونین اور کمیونٹرن سے آئے ہوئے مشیروں کو بھی ان مجرمانہ پالیسیوں اور انقلاب کی تباہی کی وجہ سے چین چھوڑنا پڑا، ایم این رائے اور بوروڈن واپس بلا لیے گئے اور سٹالن نے اپنے خصوصی نمائندے لومی ناڈزے (Luminadse) کو چینی کمیونسٹ پارٹی کو ہدایات دینے کے لئے چین بھیجا۔

15 جولائی کو ہی ماسکو میں ہونے والی کمیونٹرن کی میٹنگ میں چین کی کمیونسٹ پارٹی کو اس شکست کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کی مذمت کی گئی۔ 7 اگست کو انہی احکامات کے تحت لومی ناڈزے کی

سربراہی میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنہ کی غیر معمولی کانگریس کی گئی جس میں چین ڈوشوکو ''مفاد پرست'' بنا کر اس کی مذمت کی گئی اور اس کو سٹالن اور کمیونٹرن کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہونے والی شکست کا ذمہ دار بنا کر قربانی کا بکرا بنایا گیا۔ یہی حشر کسانوں کے کمیونسٹ لیڈر تانگ پن سان (Tang pin San) کے ساتھ بھی ہوا۔ چوکیوی بائی (Chu Quibai) کو کمیونسٹ پارٹی کا نیا جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ ابھی تک انقلابی عمل پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔

ستمبر میں نیان کے علاقے میں ماؤزے تنگ کی قیادت میں کسانوں کی ایک بڑی بغاوت ابھری اور اکتوبر میں شون سی میں انقلابی ابھار نے محنت کشوں کی پنچایتوں کو جنم دیا۔ چین کے مسئلہ پر سرکاری اپوزیشن کو تنقید کا نشانہ بنانے اور اختلاف کرنے کی بنیاد پر کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین (CPSU) سے ٹراٹسکی اور زنوویف (Zinoviev) کو نکال دیا گیا۔ ان اقدامات کے بعد کمیونٹرن کی قیادت نے مفاد پرستی اور مصلحت انگیزی کی پالیسی سے ہٹ کر انتہا پسندی کی جانب پلٹا کھایا جو پہلی پالیسی سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی پندرہویں کانگریس کے ساتھ منسلک کرتے ہوئے 11 سے 14 دسمبر 1927ء کو کینٹن میں ایک سرکشی کی جائے گی۔ کمیونٹرن کے نمائندے لومی ناڈزے اور نیومان اس سرکشی کو مشتعل کروانے والے تھے۔ لیکن یہ انتہا پسندی اور مہم جوئی کمیونسٹ پارٹی اور 1925-27ء کے انقلاب کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس کو چیانگ کی فوج نے سامراجی امداد سے خون میں ڈبو دیا۔ 70 ہزار کمیونسٹوں کو اس غیر منظم، جلد بازی اور قبل از وقت سرکشی کے دوران چیانگ کی فوجوں نے قتل کیا۔ 1927ء کی شکست کے بعد کے پانچ سال کے عرصے میں ایک لاکھ انقلابیوں اور محنت کشوں کا قتل عام کیا گیا۔ ان میں کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے اہم اور نظریاتی طور پر پختہ لیڈر شامل تھے۔ اس انقلاب کی شکست صرف چین کے پرولتاریہ اور محنت کش عوام کی شکست نہیں تھی بلکہ اس شکست سے بین الاقوامی انقلاب اور محنت کش طبقے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس سے عالمی انقلاب اور کمیونسٹ تحریک پر فیصلہ کن اثرات مرتب ہوئے جس کا خمیازہ آج بھی اربوں انسان بھگت رہے ہیں۔

اسباق

1911ء کا انقلاب ایک ترقی پسند قدم تھا گو کہ یہ انقلاب سامراجیوں کی براہِ راست مداخلت سے تکمیل تک پہنچا تھا۔ سن یاٹ سین نے اپنی یادداشتوں میں تسلیم کیا کہ اس کے تنظیمی کام کا مکمل انحصار سامراجی طاقتوں جاپان، برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی حمایت اور امداد پر مبنی تھا۔ چینی بورژوازی کی مانچو خاندان کے خلاف لڑائی زار شاہی کے خلاف روسی بورژوازی کی لڑائی سے زیادہ انقلابی نہیں تھی لیکن دونوں کیفیتوں میں سرمایہ دار طبقے کا بنیادی کردار انقلابی نہیں تھا۔

کومنتانگ کا سامراج کی جانب رویہ آغاز سے ہی انقلابی نہیں تھا بلکہ انتہائی مفاد پرستانہ تھا۔ وہ سامراج کے ایک یا دوسرے ایجنٹ کو تباہ کر کے اس یا کسی دوسرے سامراج سے چینی بورژوازی کے مفادات کے لیے سمجھوتہ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار تھے۔

کسی بھی قومی بورژوازی کا سامراج کی جانب رویہ عمومی طور پر نہیں پرکھنا چاہیے بلکہ اس کو قوم کے سامنے درپیش فوری تاریخی اور انقلابی فرائض کے حوالے سے پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چینی بورژوازی ایک نوآبادیاتی اور پسماندہ طبقہ تھا۔ سامراج کے تسلط کا خاتمہ چین میں ایک انتہائی ترقی پسندانہ اقدام بنتا لیکن اسی بورژوازی کا مزدوروں اور کسانوں کی جانب رویہ انتہائی زہریلا، رجعتی اور دشمنانہ تھا۔ چینی بورژوازی عالمی سامراج کی ہیئت کو دیکھتے ہوئے اتنا ضرور جانتی تھی کہ اس کے خلاف کوئی بھی سنجیدہ جدوجہد عوام کی اتنی بڑی انقلابی اٹھان کو جنم دے سکتی تھی جو اس حکمران سرمایہ دار طبقے کے اپنے وجود کے لیے خطرہ بن جاتی۔ اگر مانچو جاگیردارانہ بادشاہت کا اکھاڑا جانا ایک فریضہ تھا تو سامراجی تسلط کو توڑنا اس سے کہیں زیادہ بڑا کام تھا۔ سٹالن اور بخارن نے چینی بورژوازی کے بارے میں انقلابی روح رکھنے والا غلط نظریہ دے کر چینی محنت کش طبقے کو تباہ کن غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

سرمایہ دار طبقہ جب بھی کسی انقلابی تحریک میں شامل ہوا ہے یا متحدہ محاذ بناتا ہے تو وہ اپنے مخصوص طبقاتی مفادات کے دباؤ کے تحت ایسا کرتا ہے لیکن جلد یا بدیر انقلاب کو پچھاڑنا اور انقلاب کے خلاف اس طبقے کی چھپی ہوئی حقارت کا بے نقاب ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ وہ انقلابی تحریکوں سے ہمیشہ اپنے مخصوص مفادات کے لیے کھلواڑ کرتا ہے۔ اسی طرح سامراج کے خلاف ان کی جدوجہد بھی ہمیشہ سامراجی سستی مصنوعات سے اپنی قومی منڈی کو بچانا اور اس کی خودمختاری حاصل کرنا ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مفاد اور مقصد بھی اس کے اولین مقصد یعنی محنت کشوں پر طبقاتی تسلط قائم

رکھنے کے بعد آتا ہے۔

چین میں 1925ء سے 1927ء کے دوران ابھرنے والی مزدوروں اور کسانوں کی تحریک سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں تھی۔ حکمران طبقات کی ٹوٹ پھوٹ اور خلفشار انتہا پر تھا اور چین کے حکمران اپنے چیانگ کائی شیکوں اور وانگ چنگ وؤں کو ماسکو میں کمیونٹرن کے در پر صرف اس لیے بھیج رہے تھے کیونکہ تحریک کے ابھرنے کی کیفیت میں چینی بورژوازی کو اپنی کمزوری کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ ابھرتے ہوئے عوامی طوفان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اگر کمیونٹرن سے غلط پالیسی جاری نہ کی جاتی تو نہ مزدور اور نہ ہی کسان سرمایہ دار طبقے کے سیاسی نمائندوں کی پیروی کرتے۔ اگر کمیونٹرن کی جانب سے درست پالیسی دی جاتی تو تحریک کے اس ابھار کی صورت میں چینی پرولتاریہ کمیونسٹ پارٹی کی حمایت کرتا اور دیہی علاقوں میں چلنے والی کسان جنگ چین کا مزدور طبقہ اپنی تحریک کے ساتھ جوڑتا۔ اس انقلابی کیفیت میں کمیونسٹ پارٹی کی اپنی فوج تشکیل پا سکتی تھی اور کمیونٹرن کی درست قیادت میں اگر پورے چین میں نہیں تو کم از کم اس کے بڑے حصے پر کمیونسٹ پارٹی طاقت حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن سوویت یونین، بالشویک پارٹی اور اکتوبر انقلاب کا جو مقام اور اتھارٹی تھی اس کی بنیاد پر کمیونٹرن کے احترام میں چین کی کمیونسٹ پارٹی نے جو پالیسیاں قبول کیں وہ چیانگ کائی شیک کی حمایت کرنے، وانگ چین وی کا ساتھ دینے کی مصلحت پسندانہ پالیسیاں تھیں۔ ان پالیسیوں کا 1925-27ء کے انقلاب کے خون میں اہم کردار بنتا ہے۔

سٹالن اور بخارن کے زیر کنٹرول کمیونٹرن کی قیادت نے ان پالیسیوں کو مندرجہ ذیل دلائل کی بنیاد پر استوار کیا:

1۔ چین سوشلسٹ انقلاب کے لئے تیار نہیں اس لیے اس کا قومی جمہوری مرحلے سے گزرنا ناگزیر ہے۔

2۔ اس بنیاد پر یہ فرائض ادا کرنے کے لئے چین کی قومی انقلابی بورژوازی کی حمایت کرنا اور ان سے الحاق کرنا کمیونسٹوں کا بنیادی فریضہ ہے۔ چونکہ سماج پر جاگیردارانہ باقیات حاوی ہیں اس لیے انقلاب کا کردار سرمایہ دارانہ بنتا ہے۔

3۔ چین میں صنعتی محنت کش طبقہ بہت قلیل اور چھوٹا ہے اس لیے کسانوں، مزدوروں، پیٹی بورژوازی اور بورژوازی کے چار طبقوں کے بلاک کی انقلابی جدوجہد کی جائے۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کو نوزائیدہ ہونے اور کمیونٹرن کی بے پناہ تاریخی اتھارٹی کی وجہ سے ان کی تنقید کے باوجود اس پالیسی کو تسلیم کرنا پڑا تھا۔ لیکن انقلاب کے اپنے اندر رونما ہونے والے واقعات اور عوامل نے اس لائحہ عمل کی کئی مرتبہ نفی کی تھی، مثلاً 1927ء کے اواخر میں ہونے والی کینٹن سرکشی نے جو اقدامات کیے وہ قومی جمہوری نہیں بلکہ سوشلسٹ تھے۔ ان اقدامات میں سامراجی اور قومی سرمائے اور ذرائع پیداوار پر قبضہ، مالیاتی سرمائے اور بینکوں کو ضبط کرنا شامل تھا۔ لیکن چونکہ اس سرکشی کی بھرپور تیاری نہیں کی گئی تھی، سوویتوں کو ترتیب دیے جانے کے عمل سے گریز کیا گیا تھا، وسیع پیمانے پر اس کی حمایت کو منظم نہیں کیا گیا اور اسے ایسے وقت میں منظم کیا گیا تھا جب انقلاب کا ریلا پسپا ہونا شروع ہو گیا تھا، اس لیے یہ انقلابی سرکشی شکست سے دوچار ہوئی اور محض مہم جوئی بن کر رہ گئی۔ کینٹن سرکشی کا لیڈر ریے تنگ (Yeh Ting) تھا اور اس نے بعد میں ماسکو میں ہونے والی ایک میٹنگ میں بتایا کہ کمیونٹرن کا نمائندہ نیومان (Neumann) سرکشی کی شکست کے آثار دیکھتے ہی بھاگنے والوں میں سب سے آگے تھا۔

جہاں تک چین کے سماج کا سوشلزم کے لیے تیار ہونے کا سوال ہے تو اس سے بہتر سوال یہ ہے کہ کیا چین مزدور راج کے لیے پک کر تیار ہو گیا تھا یا نہیں؟ ٹراٹسکی کا انقلاب مسلسل کا نظریہ چینی سماج پر بھی پوری طرح لاگو ہوتا ہے۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے،

''اگر اس سوال کو اس حوالے سے دیکھا جائے کہ جاگیردارانہ باقیات چین کے سماج پر حاوی تھیں تو تاریخ میں بھلا ایسے کبھی ہوا ہے کہ عمومی طور پر باقیات کہیں غالب آ سکیں، لیکن اگر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کا عمل دیکھیں تو تجارتی (مرکنٹائل) اور بینکوں کے سرمائے کے ذریعے چین میں صنعت میں تیز اضافہ ہوا تھا۔ زیادہ تر زرعی اضلاع کا منڈی پر انحصار بہت بڑھ گیا تھا۔ بیرونی تجارت کا کردار مسلسل بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر پہلو سے چین کے دیہات چین کے شہروں کے ماتحت ہو چکے تھے اور سرمایہ دارانہ رشتے پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔ جبکہ مزارع اور دیہی غلامی کے رشتے بھی موجود رہے تھے۔ یہ جاگیرداری دور کا تسلسل تھے لیکن ان کی ہیئت میں تبدیلی آ چکی تھی۔ اس کے معنی یہ بنتے ہیں کہ ماضی کے رشتے حال پر اس لیے غالب آ رہے تھے کیونکہ ذرائع پیداوار کا ارتقا مسخ شدہ کیفیت اختیار کر گیا تھا جبکہ دوسری جانب فاضل زرعی آبادی کا ابھرنا، تاجروں کی سرگرمیاں اور سود خوروں کی کاروائیاں بھی اس صورتحال کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ لیکن عمومی طور پر غالب رشتے سرمایہ دارانہ تھے، جاگیر

دارانہ اور قبل از سرمایہ دارانہ رشتے حاوی نہیں تھے ان کی باقیات رہ گئیں تھیں ۔ ان سرمایہ دارانہ رشتوں کے سماج پر غلبے کی وجہ سے ہم کسی قومی انقلاب میں پرولتاریہ کی سربراہی، قیادت اور حاوی پن کی بات سنجیدگی سے کر سکتے ہیں۔ ورنہ یہ جوڑ ملایا ہی نہیں جا سکتا۔'' (لیون ٹراٹسکی، لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل، صفحہ 159)

چین کے پرولتاریہ کا پیداواری عمل میں کردار بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اس کا سیاسی و انقلابی کردار جیسا کہ واقعات نے ثابت کیا، بہت ہی عظیم اور دیوہیکل ہوسکتا تھا لیکن قیادت کا تمام لائحہ عمل ہی پرولتاریہ کو ہراول اور قائدانہ کردار دینے کے منافی تھا۔ کمیونٹرن اور چینی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کی اکثریت نے یہ سوچا تھا کہ کومنتانگ کی کانگریسوں میں سادہ انتخابات سے طاقت بورژوازی سے پرولتاریہ کی جانب چلی جائے گی۔ اس سے زیادہ خود فریبی کیا ہوسکتی ہے کہ بورژوا پارٹی کے اندرونی انتخابات جیت کر کوئی انقلابی تبدیلی آسکتی تھی۔ فوج، افسر شاہی، پریس، ذرائع ابلاغ اور سرمایہ تمام کے تمام بورژوازی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ صرف اسی وجہ سے وہ حکمران پارٹی اقتدار پر قابض ہوتی ہے۔

ان ذرائع اور کومنتانگ کی دھوکہ بازی کے ذریعے چین میں بورژوازی نے محنت کش عوام کو اپنے چنگل میں جکڑ رکھا تھا لیکن جب عوام کی تحریک اور جدوجہد ابھرتی ہے تو یہی نام نہاد عوامی پارٹیوں کی قیادت گولیوں کی بوچھاڑ سے انہی مزدوروں اور کسانوں کو خون میں ڈبو دیتی ہے۔ یہ شرمناک جمہوری ڈھونگ بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے اور طبقاتی کشمکش کی خونی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ نوآبادیاتی ممالک میں یہ صورتحال بار بار ہمارے سامنے آئی ہے۔

اس انقلاب کے دوران ہونے والے واقعات نے جہاں ایک طرف ٹراٹسکی کے نظریات کو درست ثابت کیا وہاں سٹالن ازم کی غلط نظریاتی بنیادوں اور لائحہ عمل و طریقہ کار کو بھی عیاں کیا۔ چین میں زوال پذیر کمیونٹرن کے کیے گئے جرائم کو ایک نسل نے بھگتا اور چین کے کمیونسٹوں نے اپنے خون سے ان کی قیمت چکائی۔ لیکن یہیں وہ تجربات بھی حاصل ہوئے جو آنے والے عرصے میں چین کی ایک نئی انقلابی تحریک کی بنیاد بنے۔

باب6

لانگ مارچ

1927ء کے انقلاب کی خونریز شکست کے بعد اور اس کے دوران جب کمیونسٹ پارٹی منتشر ہونا شروع ہوئی تو اس کے بہت سے لیڈر اور کارکنان جنوبی چین اور دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ اس خونریزی کا اندازہ ان اعداد وشمار سے لگایا جا سکتا ہے جن کے مطابق نہ صرف سامراجیوں کے ہاتھوں بلکہ ''قومی بورژوازی'' کے ہاتھوں کتنے بڑے پیمانے پر قتل وغارت ہوئی تھی۔ اپریل سے دسمبر 1927ء کے دوران 37,985 افراد کا خون کیا گیا۔ یہ سرکاری طور پر قتل کیے جانے والے افراد کی تعداد ہے جبکہ مظاہروں اور جلوسوں پر چلائی جانے والی گولی اور دوسری فوجی کاروائیوں کے دوران جاں بحق ہونے والے افراد ان میں شامل نہیں۔ جنوری تا اگست 1928ء کے دوران 27,699 افراد کو قتل کیا گیا۔ 1930ء میں 14 ہزار افراد قتل ہوئے جبکہ 1931ء میں صرف چھ صوبوں میں 39,778 افراد کے قتل کی اطلاعات مل سکیں۔ یہ وہ اعداد وشمار ہیں جن کی تفصیلات مل سکیں۔ ردِ انقلاب کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف

سے بیجنگ سے شائع ہونے والے جریدوں کی تاریخوں میں جان سے جانے والوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ چیانگ کائی شیک کی قیادت میں اس ردِ انقلاب نے نہ صرف کمیونسٹ پارٹی کی کمر توڑ دی بلکہ اس کی تنظیمی اور خصوصاً نظریاتی بنیادوں پر بھی کاری ضرب لگی۔ اس پسپائی میں پارٹی کی طبقاتی ساخت بری طرح متاثر ہوئی۔ ایک رپورٹ کے مطابق 1927ء میں پارٹی کی ممبرشپ 60 ہزار تھی جس میں 58 فیصد صنعتی مزدور تھے۔ لیکن اس شکست کے بعد صنعتی مزدوروں کی تعداد دس فیصد سے بھی کم رہ گئی جبکہ اس کے بعد کے دور میں پارٹی نے جو راستہ اور لائحہ عمل اپنایا اس سے صنعتی مزدوروں کی تعداد میں مزید کمی ہونا شروع ہوگئی۔ 1930ء کے اوائل میں یہ شرح محض 1.2 فیصد رہ گئی۔

کمیونسٹ پارٹی کے اس طرح بکھرنے کے بعد جو اہم لیڈر بچ کر دور دراز کے دیہی علاقوں میں چلے گئے تھے ان میں ایک اہم لیڈر ماؤزے تنگ تھا۔ ماؤ نے مشرقی صوبے جنگ گانگ (Jinggang) کے پہاڑی سلسلے میں پڑاؤ ڈالا۔ اسی طرح ایک دوسرا گروپ جو تقریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا ژیوڈے (Zhude) کی قیادت میں جنوبی ینان پہنچا اور وہاں کچھ کسان بغاوتوں میں حصہ لینے کے بعد اس کی تعداد 9 ہزار تک پہنچ گئی۔ بعد میں ذیوڈے اور چین یی (Chen Yi) اپنے دستوں کی قیادت کرتے ہوئے دشوار گزار راستوں سے جینگانگ پہاڑوں میں پہنچے اور ماؤ کی کمان میں فوجوں کو یکجا کیا۔ ان قوتوں کے ملنے سے چین کی ابتدائی کسانوں اور مزدوروں کی سرخ فوج کی بنیاد پڑی۔ اس فوج کو چند ابتدائی جھڑپوں میں جو شکستیں اٹھانا پڑیں اس کے بعد براہ راست فوجی تصادم کا طریقہ کار ختم کر دیا گیا اور ماؤ اپنے دستوں کے ساتھ لوژیاؤ (Luoxiao) پہاڑوں کی جانب بڑھنے لگا اور گوریلا جنگ کا طریقہ کار اپنانا شروع کر دیا۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کی چھٹی کانگریس جولائی 1928ء میں ماسکو میں منعقد ہوئی جس میں چالیس ہزار ممبران کی نمائندگی 84 مندوبین کر رہے تھے۔ اس کانگریس میں 27-1925ء کے انقلاب کی شکست کے تجربات سے سیکھنے کی بجائے غلط نتائج اخذ کیے گئے اور چین کے انقلاب کے کردار کو سامراج اور جاگیرداری کے خلاف پھر بھی ایک بورژوا (سرمایہ دارانہ) جمہوری انقلاب قرار دیا گیا۔ چین کے جمہوری انقلاب کے لیے ایک دس نکات کا پروگرام پیش کیا گیا۔ تاریخ کے واقعات اور ان لیڈروں کے اپنے عمل نے ان کے اس نظریئے کو رد کر دیا تھا۔

1929ء کے موسم بہار میں ماؤزے تنگ اور ژیوڈے نے اس فوج کی قیادت میں جنوبی جیانگ ژی کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ وہاں کے عوام کو گوریلا جنگ کے لیے متحرک کیا گیا اور جنوبی جیانگ ژی کو انقلابی تحریک کا میدان بنایا گیا۔

1930ء کے موسم گرما میں فوجیان-جیانگوی (Fujian-Jiangxi) کا انقلابی مرکز تشکیل دیا گیا اور 1931ء میں یہاں چینی سوویت ریپبلک کا اعلان کیا گیا۔ پہلا سرخ محاذ سرخ فوج کے 30 ہزار افراد کی قوت پر بنایا گیا جس کا فوجی کمانڈر ژیوڈے اور اس کا سیاسی لیڈر ماؤزے تنگ تھا۔ 1930ء کے آخر تک چین کی اس کمیونسٹ پارٹی نے 15 انقلابی مراکز چین کے دور دراز دیہی علاقوں میں تشکیل دیئے۔ ان میں ینان، جیانگوی، فوجیان، ہوئیمی، آنہوائی، گوانگ ژی، گوانگ ڈونگ، ہینان اور چند دوسرے صوبے شامل ہیں۔ لیکن مرکز جیانگ ژی ہی رہا۔

ان علاقوں میں زمینوں کی تقسیم اور جاگیروں کی بلا معاوضہ ضبطی کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ اس طرح سرخ فوج تیرہ ذیلی فوجوں پر مشتمل تھی۔ جن میں ملک کے مختلف حصوں میں 60 ہزار افراد تھے۔ اس تمام کاروائی کی قیادت کمیونسٹ پارٹی کر رہی تھی جس کی وجہ سے دیہی علاقوں میں اس کی حمایت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

1930-31ء میں چیانگ کائی شیک کی کومنتانگ کی فوجوں نے جیانگوی کے مرکز پر حملے کرنے شروع کر دیے تھے۔ جنوری اور ستمبر 1931ء کے دوران تین بڑے حملوں کو پسپا کر دیا گیا جس کے باعث اس خطے میں سرخ فوج کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ نومبر 1931ء میں کسانوں اور مزدوروں کی پہلی قومی کانگریس روئی جن (Ruijin) جیانگوی صوبے میں منعقد ہوئی جس کی مجلس عاملہ کا چیئرمین ماؤزے تنگ کو بنایا گیا جبکہ سرخ فوج کا کمانڈر انچیف ژیوڈے کو مقرر کیا گیا۔ اس دوران 1931ء میں جاپان نے چین پر بڑا حملہ کر دیا اور کومنتانگ کی عدم مزاحمت کی پالیسی کی بدولت جاپانیوں نے 20 لاکھ مربع کلومیٹر رقبہ پر قبضہ کر کے 30 کروڑ چینی عوام کو مفتوح کر لیا۔ 1932ء میں اس علاقے میں جاپانیوں نے اپنا کنٹرول قائم رکھنے کے لیے مانچوکوؤ (Manchukuo) کی کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی۔

اس جاپانی قبضے کے خلاف وسیع پیمانے پر احتجاجی تحریکوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ شنگھائی، کینٹن، ہانگ کانگ اور دوسرے بڑے صنعتی مراکز میں محنت کشوں کی ہڑتالوں نے زور پکڑا۔ لیکن

کمیونسٹ پارٹی کی قیادت چونکہ دیہی علاقوں میں گوریلا جنگ میں مصروف تھی اس لیے قیادت کے فقدان کی وجہ سے یہ تحریک آگے نہیں بڑھ سکی۔اس تحریک کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ کومنتانگ کی فوجوں کے اندر بھی بغاوت پھوٹ پڑی اور شنگھائی کی 19ویں روٹ فوج نے سائی تنگ کائے (Cia Tingkai) کی کمان میں بغاوت کر دی اور جاپانیوں کو سخت مزاحمت دی۔لیکن پھر تحریک کا پھیلاؤ نہ ہونے اور مارکسی قیادت کے فقدان کی وجہ سے یہ تحریک بھی زائل ہو گئی۔

جون 1932ء میں چیانگ کائی شیک نے پانچ لاکھ کی فوج منظم کر کے سرخ فوج کے گڑھ پر حملہ آور ہونے کی مہم کا آغاز کیا۔لیکن فروری 1933ء تک یہ چوتھا بڑا حملہ بھی پسپا ہو گیا۔اکتوبر 1933ء میں امریکہ، برطانیہ اور جاپانی سامراج کی حمایت سے چیانگ کائی شیک نے محاصرہ کر کے پانچویں مہم کا آغاز کیا۔اس مہم کا مقابلہ کرنے کے لیے کمیونسٹ پارٹی کے لائحہ عمل میں پھر شدید تضادات اور دراڑیں ابھریں۔پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ماؤ کا لائحہ عمل مسترد کر دیا۔ایک سال تک شدید جنگ لڑی گئی لیکن آخر کار سرخ فوج کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ 16 اکتوبر 1934ء کو ایک مرتبہ پھر ایک انقلابی گڑھ بنا کر گوریلا جنگ کی پالیسی ترک کر دی گئی اور ماؤ حصار توڑ کر اپنی فوجیں لے کر جیانگسی سے نکل گیا اور مشہور زمانہ لانگ مارچ کا آغاز کر دیا۔ژیانگ ژنگ (Xiang Xing) اور چین یی (Chen Yi) اپنی فوجوں سمیت جیانگسی میں ہی رہے اور گوریلا کاروائیاں جاری رکھیں۔یہ وقت بعد ازاں نئی چوتھی فوج (New Fourth Army) کو جنم دینے کا موجب بنا۔

سرخ فوج لانگ مارچ جاری رکھتے ہوئے گوانگ ڈونگ، ہینان اور گوانگ ژی سے ہوتی ہوئی جنوری 1935ء میں گواز ہو (Guizhou) صوبے کے مقام زینی (Zunyi) پہنچی۔ یہاں ماؤ نے اپنے دھڑے کی ایک کانفرنس منعقد کی جس نے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی بائیں لائن مسترد کر دی اور فوجی کمان کا ایک گروپ تشکیل دیا جس کی قیادت ماؤزے تنگ، چواین لائی اور وانگ ژیاژینگ کر رہے تھے۔نئی مرکزی کمیٹی میں ماؤ کو سربراہی سونپ دی گئی۔

اس کے بعد مارچ دوبارہ شروع ہو گیا۔یونان کے صوبے سے گزر کر یہ سرخ فوج سچوان اور ژیکانگ (Xikang) کو عبور کرتی ہوئی جون 1935ء میں ماؤ گونگ (Maogong) کے مقام پر پہنچی جہاں اس سے سچوان شانکسی سے پسپا ہونے والی چوتھی سرخ فوج آ ملی۔یہاں

سے انہوں نے شمال کے برفانی پہاڑوں کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ان پہاڑوں کو عبور کر کے وہ ماسرگائی کے مقام پر پہنچی جہاں پارٹی کے داخلی تضادات میں ژیانگ گواؤتو (Zhang Guaoto) کے دھڑے کو شکست ہوئی۔اس کے بعد شمال کی جانب پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے دریاؤں اور دلدلوں کے دور دراز ویرانوں کو عبور کرتی ہوئی یہ سرخ فوج سمال شانکسی کے انقلابی مرکز میں اکتوبر 1935ء کو پہنچی۔ یہاں پر اس میں مقامی سرخ فوج کے یونٹ شامل ہونا شروع ہوئے۔اس طرح چھ ہزار میل کے لانگ مارچ کا پہلا مرحلہ ختم ہوا۔اس میں اس نے گیارہ صوبوں اور اس فاصلے کو ایک سال میں عبور کیا۔اس پہلے لانگ مارچ میں اس سرخ فوج نے کومنتانگ کی گیارہ رجمنٹوں کو شکست دی۔اس دوران انہوں نے پانچ پہاڑی سلسلوں اور تین بڑے دریاؤں کو عبور کیا۔یہ دریائے ووزیانگ (Wujiang)، جنشا (Jincha) اور دادو (Dadu) کے دریا تھے۔اس دوران سرخ فوج کو برفانی طوفانوں، تپتے ہوئے صحراؤں اور خطرناک دریاؤں سے گزرنا پڑا۔

اس تمام تر کٹھن رستے پر چلنے کے باوجود نظریاتی زوال پذیری کو ختم نہیں کیا جا سکا۔ماسکو سے احکامات کے تحت انہوں نے پھر بورژوازی کے کچھ حصوں سے مصالحت کر لی۔یکم اگست کو جاپان کے خلاف مزاحمت کے لیے قومی نجات کے فرنٹ کی تشکیل میں اس مصالحت کے لیے چینی حکمران طبقات کے خلاف جنگ کو روک دیا گیا۔دسمبر 1935ء میں اس پالیسی کو جاری رکھنے کے لیے چین کی کمیونسٹ پارٹی نے ''موجودہ سیاسی صورتحال اور پارٹی کے فرائض'' کے نام سے ایک قرارداد منظور کی۔اس حوالے سے سرخ فوج کی علیحدہ شناخت ختم کر کے حکمران طبقات کے دھڑوں کے فوجی دستوں سے پھر الحاق کر کے شمال مشرق میں جاپان دشمن اتحادی فوج کو منظم کیا گیا۔اس دوران ایک اہم واقعہ ہوا جو اس وقت کی کمیونسٹ قیادت کی نظریاتی اور لائحہ عمل کی مسخ اور خستہ حالی کی بہت واضح عکاسی کرتا ہے۔

12 دسمبر 1936ء کو کومنتانگ فوج کے کمانڈروں ژیانگ ژیولیانگ (Zhang Xuliang) اور ژینگ ہوچینگ (Yang Hucheng) نے ہینان میں سرخ فوج پر حملہ کرنے کے لیے چیانگ کائی شیک کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا۔اس بغاوت میں انہوں نے چیانگ کائی شیک کو گرفتار کر کے اس کو ژیان میں بند کر دیا اور کمیونسٹ پارٹی کو اطلاع دی اور دریافت کیا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ کمیونسٹ پارٹی نے فوری طور پر چواین لائی، کوئن

بانگ ژیان (Quin Bang Xian) اور یی جیانجنگ (Ye Jianying) کو اپنے نمائندوں کے طور پر ژیان بھیجا۔ ان مذاکرات میں چیانگ کائی شیک نے قومی یکجہتی اور ''جاپان کے خلاف مزاحمت'' کے ''مطالبات'' کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی 'سفارش' پر کینٹن کے اس جلاد کو رہا کروا دیا گیا۔

چیانگ کائی شیک نے واپس پہنچتے ہی برطانوی، امریکی اور جاپانی سامراج کے ساتھ مل کر پھر سرخ فوج کے خلاف سرگرمیاں تیز کر دیں۔ لیکن نظریاتی دیوالیہ پن کی انتہا یہ تھی کہ جاپان دشمن ''قومی'' متحدہ محاذ کو کمیونسٹ پارٹی نے پھر ترجیح دی اور اس میں بڑے سرمایہ داروں کے امریکہ اور برطانیہ نواز عناصر کو قیادت میں شامل کر لیا گیا۔ اس پالیسی کو فروغ دینے کے لیے 1937ء کے موسمِ بہار میں کمیونسٹ پارٹی نے ''داخلی امن'' کو مستحکم کرنے، جمہوریت اور جاپان کے خلاف مزاحمت کا احساس دلوانے کا پروگرام پیش کیا۔

طبقاتی مصالحت اور مارکسزم لینن ازم کی ترمیم پرستی کی اس پالیسی کی وضاحت اور فروغ دینے کے لیے ماؤزے تنگ نے ''چین کی انقلابی جنگ میں لائحہ عمل کے مسائل'' اور ''عمل پر تضادات'' 37-1936ء میں لکھیں۔

لیکن جب 7 جولائی 1937ء کو جاپان نے بیجنگ کے جنوب مغربی مضافات پر حملہ کیا تو حکمرانوں کی مزاحمت صرف اس لیے تھی کہ امریکہ اور برطانیہ کے مفادات کو جاپانی یلغار سے ضرب لگ رہی تھی اور ان اس مزاحمت میں حصہ ڈالنے کا مقصد اپنے سامراجی آقاؤں کو خوش کرنا تھا۔ اس پاپولر فرنٹ کی پالیسی میں مصلحت پسندی کرنی پڑی جس میں سرخ فوج کے ایک اہم حصے نے اپنا نام تبدیل کر کے آٹھویں روٹ فوج (Eighth Route Army) رکھ لیا۔ اس فوج میں 45 ہزار فوجی تھے۔

جاپانی جارحیت کے خلاف اصل مزاحمت اور جنگ سابقہ سرخ فوج کے دستے کر رہے تھے۔ جبکہ کومنٹانگ کی قومی فوجیں پسپائی کا شکار تھیں ان کو ایک کے بعد دوسری شکست سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ ستمبر 1937ء میں آٹھویں روٹ فوج (سابقہ سرخ فوج کا بڑا حصہ) نے جاپان کے اہم ترین فوجی ڈویژن اتاگاکی (Itagaki) ڈویژن کے تین ہزار کمانڈوز کا شانکسی صوبے کے درہ پنگ ژنگ گوان (Ping Xingpian) کی لڑائی میں صفایا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ سرخ فوج کے دستے جاپانیوں کے خلاف گوریلا کاروائیوں میں بھی سرگرم تھے۔ جہاں جہاں ان کا

قبضہ ہوتا تھا وہاں اصلاحات کے ذریعے ان کو دیہی عوام میں زیادہ مقبولیت مل رہی تھی۔ اس جنگ کے پہلے سال میں جاپان کے تین لاکھ فوجیوں کو حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔

اکتوبر 1938ء میں چین کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی چھٹی مرکزی کمیٹی کا اجلاس ینان (Yanan) میں منعقد کیا جس میں دوسرے امور کے علاوہ پارٹی کو کومنتانگ کے ساتھ مصالحت کروانے اور اس سے الحاق کرنے کے نقطہ نظر پر سخت تنقید کی گئی اور ان کو مسترد کیا گیا۔ یہ نظریات وانگ منگ (Wang Ming) پیش کر رہا تھا جو چین کی کمیونسٹ پارٹی میں سٹالن کا حامی تھا۔ اس کا دھڑا 1931ء کے بعد سے پارٹی پر حاوی رہا۔ لیکن 1938ء میں اس کے نقطہ نظر کو لانگ مارچ کے دوران شکست ہوئی اور 1945ء کی ساتویں کانگریس کے دوران اس کو پارٹی سے نکال دیا گیا۔ پالیسی میں پھر یہ تبدیلی بنیادی طور پر ان تجربات کے دباؤ کی وجہ سے ہوئی تھی جو 1935ء (یکم اگست) کے معاہدے کے نتیجے میں سرخ فوج اور کمیونسٹ پارٹی کو بھگتنے پڑے تھے۔

لڑائی کی شدت بڑھنے سے جاپانیوں نے کومنتانگ کی فوجوں کے خلاف کاروائیوں کو معطل کر دیا اور ساری جنگ اور حملوں کا رخ سرخ فوج کے دستوں کی جانب موڑ دیا۔ اس دوران سٹالنزم کا طبقاتی انحراف اور قومی پالیسی سامنے آتی ہے جب 21 اگست 1937ء کو سٹالن نے چین کے حکمران طبقات کے ساتھ ''عدم جارحیت'' کا سمجھوتہ کیا اور اس مزدور دشمن حکومت کو سوویت یونین کی جانب سے آنے والی امداد برطانیہ اور امریکہ کی امداد سے بھی زیادہ تھی۔ یہ امداد چیانگ کائی شیک کو دی جا رہی تھی جو اس وقت چین کا حکمران تھا۔

امریکہ اور برطانیہ ایک جانب اس جنگ میں تماشائی بنے ہوئے تھے اور دوسری جانب چیانگ کائی شیک اور جاپان کا سمجھوتہ کروا کے اپنے سامراجی تسلط کو مزید سخت کرنا چاہتے تھے۔ 1939ء کے موسمِ بہار میں مغربی پریس میں یہ خبریں شائع ہونا شروع ہو گئیں کہ برطانوی اور امریکی حکومتیں ''بحرالکاہل پر بین الاقوامی کانفرنس'' بلانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ چین میں برطانوی سفیران مصالحتی سرگرمیوں کے لیے ہانگ کانگ، چونگ کوئنگ اور شنگھائی کے دورے کر رہا تھا۔ اس پسپائی کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ کمیونسٹ پارٹی پر لانگ مارچ اور جاپانی سامراج کے خلاف پورے چین میں چلنے والی تحریک کا دباؤ تھا۔ سٹالن نے پہلے وانگ منگ کے ذریعے اور پھر براہ راست ماؤ پر دباؤ ڈالا کہ اتنے تلخ تجربات کے بعد بھی چین کی کمیونسٹ پارٹی چیانگ کائی شیک سے پھر اتحاد کر لے۔ لیکن اسی دباؤ اور تلخ تجربات کی وجہ سے ماؤ کو انکار کرنا پڑا

کیونکہ اس قسم کی مصالحت سے کمیونسٹ پارٹی اور سرخ فوج میں شدید پھوٹ جنم لے سکتی تھی جس سے پارٹی بکھر جاتی۔اس سے روس کی سٹالنسٹ حکومت اور چینی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کے درمیان شدید اختلافات بھی پیدا ہوئے لیکن چین میں انقلابی تحریک کی شدت اور سرخ فوج کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے سٹالن اور اس کی حکومت ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی مگر پھر بھی چیانگ کائی شیک کی حکومت کو سوویت یونین کی امداد جاری رہی۔

1939ء کے موسمِ سرما اور 1940ء کے موسمِ بہار میں کومنٹانگ کی فوجوں نے جاپان دشمن چینی فوجوں کے شانکسی میں ٹھکانوں پر حملہ کر دیا۔لیکن اس حملے کو بری طرح پسپا کر دیا گیا۔ اس دوران کومنٹانگ حکومت سے مصالحت نہ کرنے اور سٹالن کی پالیسی کو اپنانے سے انکار کرنے کی بنا پر چینی کمیونسٹ پارٹی کی تعداد اور حمایت میں اضافہ ہوا تھا۔ 1940ء تک کمیونسٹ پارٹی کی کمان میں مسلح افواج کی تعداد پانچ لاکھ ہو چکی تھی اور اس کی ممبر شپ آٹھ لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی لیکن المیہ یہ تھا کہ سماج کے ہراول طبقے یعنی صنعتی مزدوروں کی تعداد سات فیصد سے بھی کم تھی اور اس کی ممبر شپ زیادہ تر مزارعوں اور دیگر مظلوم مگر پسماندہ طبقات پر مبنی تھی۔اس قوت کے مقابلے کے لیے چیانگ اور جاپان کے درمیان اب کھلا اتحاد تھا، اس کے علاوہ کومنٹانگ کے ''بائیں بازو'' کا نمائندہ وانگ جنگ وی دسمبر 1938ء میں جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر مکمل طور پر بک چکا تھا۔ 1940ء میں وہ نانجنگ کی بوگس اور جاپان کی کٹھ پتلی حکومت بنا چکا تھا۔اس نے چیانگ کائی شیک سے مل کر وسطی چین میں تائینان نیوفورتھ آرمی (سرخ فوج) کے مختلف دستوں اور چھاؤنیوں پر حملے کرنے شروع کر دیے تھے۔

1939ء میں سٹالن نے ہٹلر سے باہمی معاہدہ کر لیا۔لیکن تھوڑے عرصے میں ہی یہ معاہدہ ٹوٹ گیا اور ہٹلر نے جون 1941ء میں سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔جاپان کا اس دوران ہٹلر سے معاہدہ ہو گیا اور بحرالکاہل کے خطے میں یہ جنگ دسمبر 1941ء میں شروع ہو گئی۔اس جنگ کی ابتدا میں جاپانی خاصے طاقتور تھے اور انہوں نے چین پر ظلم و بربریت کی یلغار کر دی۔ ہر طرف تباہی اور بربادی پھیلنے لگی۔اس جاپانی بربریت میں کومنٹانگ کی فوجیں ان کی بھرپور معاونت کر رہی تھیں۔

ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سرخ فوج نے زمینیں ضبط کر کے کسانوں میں تقسیم کیں اور انہیں مزید مراعات دے کر پیداوار میں اضافہ کروا کر اپنی جنگی کوششوں کے لیے غذائی اور دوسرے وسائل حاصل کرنے شروع کر دیے۔ 1942ء کے بعد جن علاقوں میں شکستیں اور

پسپائیاں ہوئیں وہاں دوبارہ سرخ فوج نے پیش قدمی شروع کر دی۔ جنگی تباہ کاریوں اور بوجھ نے جاپانی سامراج کو بھی کمزور کرنا شروع کر دیا اور چین پر اس کی جارحیت کا زور ٹوٹنے لگا۔

کومنتانگ نے تیسرا کمیونسٹ دشمن حملہ جون اور جولائی 1943ء میں کیا تھا۔ اس حملے میں انہوں نے ینان (Yannan) پر 9 اطراف سے وار کرنا شروع کر دیا۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی اس سرحدی صوبے کے دارالحکومت میں متعین تھی لیکن عوامی حمایت سے کمیونسٹ پارٹی نے یہ حملہ بھی پسپا کرنا شروع کر دیا۔ چین میں پندرہ مختلف علاقوں کو کومنتانگ اور جاپانی تسلط سے آزاد کروالیا گیا تھا۔ اس وقت باقاعدہ فوجوں کی تعداد چار لاکھ سے زائد تھی جبکہ پارٹی کی ممبرشپ نو لاکھ سے بڑھ گئی تھی۔

دوسری جانب کومنتانگ کے زیر انتظام علاقوں میں بدعنوانی اور سماجی بدحالی اور خلفشار بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ چار بڑے خاندانوں کا اقتدار اور دولت پر قبضہ تھا۔ ان میں چیانگ کائی شیک، ٹی وی سونگ (T.V.Song)، ایچ ایچ کنگ (H.H.Kung) اور چین لی فو (Chen Li Fu) کے خاندان شامل تھے۔ تمام معیشت پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عوام پر مزید ٹیکسوں کا بوجھ بڑھاتے جا رہے تھے اور استحصال بڑھتا جا رہا تھا۔ کومنتانگ کی سول اور فوجی افسر شاہی کے اہلکاروں نے بدعنوانی، بلیک میل، خورد برد اور جبر کے ذریعے غریبوں کو لوٹنے کا بازار گرم رکھا۔ ہر سال گندم اور زرعی اجناس کی قلت بڑھتی جا رہی تھی۔ جاپانی حصار نے ضروریات کی ترسیل انتہائی مشکل بنا دی تھی۔ عام انسان کے لیے زندگی ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ کومنتانگ کی خفیہ پولیس نے عام آبادی پر ظلم اور بربریت کی یلغار کر رکھی تھی۔ کسی قسم کی سیاسی آزادی نہیں تھی۔ ہزاروں ترقی پسند نوجوانوں کو بیگار کیمپوں میں پھینک کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ اس ظالمانہ اور بدعنوان کومنتانگ آمریت کے خلاف بے چینی اور نفرت نئی بغاوتوں اور ابھاروں کو جنم دے رہی تھی۔ اس دوران کومنتانگ جاپانیوں سے وفاداریاں تبدیل کر کے امریکی سامراج کی جھولی میں گر چکی تھی۔

کمیونسٹ پارٹی کی قیادت نے پھر پلٹا کھایا اور مصالحتی پالیسی اپنانی شروع کر دی۔ اس میں 1943ء میں ہونے والے سٹالن، روز ویلٹ اور چرچل معاہدے کا بھی اہم ہاتھ تھا۔ ستمبر 1944ء میں چین کی کمیونسٹ پارٹی نے اس پالیسی کے تحت مخلوط قومی حکومت کا مطالبہ کر دیا لیکن اس پیش کش کو کومنتانگ نے ہی مسترد کر دیا۔ اس کے مقابلے میں امریکی نمائندوں اور چیانگ

کائی شیک نے کومنتانگ کی حکومت کو مکمل کرنے کے لیے چند کمیونسٹوں کو حکومت میں شمولیت کی دعوت دی لیکن اپنے تلخ تجربات کو دیکھتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کی ساتویں قومی کانگریس 24 اپریل 1945ء کو ینان میں منعقد ہوئی اس میں 544 مندوبین اور 208 متبادل مندوبین نے شرکت کی۔ یہ دو لاکھ دس ہزار پارٹی ممبران کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس کانگریس میں یہ رپورٹ دی گئی کہ کمیونسٹ پارٹی کا 19 آزاد علاقوں پر قبضہ تھا اور ان میں کل آبادی 9 کروڑ 55 لاکھ تھی۔ سرخ فوج کا نام پیپلز لبریشن آرمی PLA میں تبدیل کر دیا گیا جس کی تعداد 9 لاکھ دس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ 22 لاکھ افراد کی ملیشیا ملک کے مختلف حصوں میں کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ تھی۔ 19 اگست 1945ء کو ماؤ نے جاپان کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کر دیا۔ جاپان کی شکست کی وجہ سے اس کی فوج کا اعتماد ٹوٹ چکا تھا اور وہ پسپا ہونا شروع ہو چکے تھے۔ PLA کے کمانڈر انچیف ژیوڈے نے جاپانی فوجوں کو غیر مسلح کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد شہروں اور جاپانی سپلائی لائنوں کی جانب PLA کی پیش قدمی شروع کر دی گئی۔ 14 اگست 1945ء کو جاپان نے دوسری عالمی جنگ میں شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈال دیے۔ اس معاہدے پر 3 ستمبر کو دستخط ہوئے۔ ایک لمبے عرصے اور طویل جدوجہد کے بعد چین کے عوام کو اس مزاحمتی جنگ میں فتح ہوئی۔

لیکن اس دورانیے میں امریکہ کی ہوائی اور بری مدد کے ساتھ کومنتانگ کی فوجوں نے شہروں اور ذرائع مواصلات پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اسی امریکی امداد کے ساتھ PLA پر کومنتانگ دوبارہ حملہ آور ہو گئی اور ایک نئی خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔

باب 7

1945-49ء کا انقلاب

جاپان کی دوسری عالمی جنگ میں شکست کے بعد امریکہ نے چین کی منڈیوں پر قبضہ کرنے اور اس کو امریکی کالونی بنانے کے لیے کومنتانگ سے مل کر منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس وقت برطانوی سامراج کی چین میں سرمایہ کاری 450 ملین پاؤنڈ تھی اور امریکی سامراج کومنتانگ حکومت کو امداد میں تین ارب ڈالر دے چکا تھا۔ ان مالی مفادات کے تحفظ اور مستقبل میں چین کی لوٹ مار کو جاری رکھنے کے لیے یہ سامراجی قوتیں کسی صورت بھی چین میں کسی انقلابی تبدیلی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چیانگ اور کومنتانگ پوری طرح سامراج کی مٹھی میں تھے اس کیفیت میں انقلابی تبدیلی کے لیے تصادم اور انقلابی جدوجہد ناگزیر تھی۔

ادھر ماؤزے تنگ اور چین کی کمیونسٹ پارٹی چونکہ سٹالنسٹ نظریات کے تحت مرحلہ وار انقلاب کے نظریے پر کاربند تھے اس لیے ان کا مقصد چین میں ایک سرمایہ دارانہ قومی جمہوری انقلاب کا حصول تھا۔ ماؤ کی کتاب نیو ڈیموکریسی (نئی جمہوریت) میں اس نے واضح لکھا تھا کہ ''سرخ فوج کی فتح کے بعد بھی ہمیں چین میں 50 سے 100 سال تک سرمایہ دارانہ نظام میں سے گزرنا پڑے گا''۔

ان نظریات کے تحت جو لائحہ عمل اور طریقہ کار بنتا تھا وہ مذاکرات اور حکمرانوں سے مصالحت کا تھا۔ 28 اگست 1945ء کو ماؤ چونگ کوئنگ (Chong Quing) گیا جہاں کومنتانگ حکومت تھی۔ ایک ماہ مسلسل مذاکرات کے بعد دس اکتوبر کو ماؤزے تنگ اور کومنتانگ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت ''امن اور جمہوریت'' کے اصولوں کو تسلیم کر لیا گیا اور ''خانہ جنگی کو ہر صورت روکنے'' پر اتفاق کیا گیا۔ اس معاہدے کی اشاعت کے بعد اس کی شرائط کے تحت کمیونسٹ پارٹی نے مشرقی ژی ژیانگ (Zhe jiang) جنوبی جیانگ سو (Jiangso) اور جنوبی آنہوئی (Anhui) سے اپنی فوجیں نکال لیں۔

لیکن جب مذاکرات جاری تھے اس وقت بھی کومنتانگ کی فوجوں کی خفیہ نقل و حرکت جاری تھی۔ وہ سرخ فوج کے کنٹرول میں علاقوں پر پانچ اطراف سے حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ابھی معاہدے کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ کومنتانگ نے ایک بڑی فوج شانکسی صوبے میں سرخ فوج کے مرکز شینگ ڈانگ (Shangdong) پر حملے کے لیے روانہ کر دی۔ یہی صورت حال ہیبئی (Hebei) صوبے کے ہان وان علاقے میں ہوئی۔

پھر جنگ بھڑک اٹھی اس خانہ جنگی میں دس سے تیس اکتوبر کے بیس دنوں میں کومنتانگ کو ایک لاکھ دس ہزار فوجیوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس واقعہ کے بعد بھی ایک شکست خوردہ کومنتانگ حکومت کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی نے پھر امن معاہدہ کیا جس پر 10 جنوری 1946ء کو دستخط کیے گئے۔ دونوں اطراف نے جنگ بندی کے احکامات جاری کر دیے۔ ان مذاکرات میں امریکی صدر کے خصوصی نمائندے جنرل جارج سی مارشل نے ثالثی کا کردار ادا کیا۔ یہ معاہدہ کروا کے امریکی سامراج کے اس فوجی جرنیل نے کومنتانگ کو یہ موقع فراہم کروایا کہ وہ اپنی فوجوں کی صف بندی اور تنظیم نو کر کے پھر حملہ آور ہو سکے۔ کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کا کومنتانگ سے بار بار معاہدے کرنا اس معذرت خواہانہ رویے کی غمازی کرتا ہے جو مرحلہ وار انقلاب کے منشویک

نظریے کے تحت ان نوآبادیاتی ممالک کے فرسودہ رجعتی اور مفلوج سرمایہ دار طبقے کے مختلف حصوں پر انحصار اور امیدیں پیدا کرواتا ہے کہ یہ ان ممالک میں کوئی قومی جمہوری انقلاب برپا کر سکیں گے۔ اب اس نظریے کا اجرا سٹالن اپنی گرفت میں مختلف ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں سے کروا رہا تھا۔ اس پالیسی کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلا کہ چین کے انقلاب کے برپا ہونے میں تاخیر ہوتی گئی اور کومنتانگ اور چین کے قومی سرمایہ داروں کے ہاتھوں چین کے لاکھوں مزدوروں اور کسانوں کا ناحق خون بہتا رہا۔

جس دن اس معاہدے پر دستخط ہوئے اسی روز چین کی کمیونسٹ پارٹی نے 'جمہوری' قوتوں کی ایک سیاسی مشاورتی کانفرنس چونگ کوئینگ میں بلائی۔ اس میں شریک 'جمہوری' قوتوں میں کومنتانگ بھی شامل تھی! اس میں منظور ہونے والی قراردادیں پھر ایک طبقاتی جدوجہد اور سوشلسٹ انقلاب کی بجائے ''امن، جمہوریت اور قومی یکجہتی'' پر مبنی تھیں۔

اس کانفرنس کے اجلاس ابھی جاری تھے کہ کومنتانگ حکومت نے بڑے فوجی دستے خانہ جنگی کے مختلف محاذوں پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کر دیئے۔ ان حملوں نے سمجھوتے کے کچھ عرصے بعد ہی اس کے پرخچے اڑانے شروع کر دیے۔ اپریل اور مئی 1946ء میں ان میں زیادہ شدت آ گئی۔ جنرل مارشل اور دوسرے امریکی نمائندے جو ان سمجھوتوں میں ثالث کا کردار ادا کرنے آئے تھے وہ دراصل کومنتانگ کے فوجی مشیروں کا کردار ادا کر رہے تھے اور فوجوں کی تمام نقل و حرکت، حملوں اور دوسری فوجی کاروائیوں کی بھی نگرانی کر رہے تھے۔ امریکہ کے فضائی اور بحری بیڑوں نے کومنتانگ حکومت کی فوجوں کو اس سول جنگ میں ایک سے دوسرے مقام پر پہنچانے، فوجی ساز و سامان سپلائی کرنے اور جنگی اسلحہ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے چیانگ کائی شیک کے افسران اور سپاہیوں کو تربیت دی اور اس کی فوجوں کو مسلح بھی کیا۔ چیانگ کائی شیک یہ خانہ جنگی امریکہ کی آشیر باد اور حمایت کے زور پر لڑ رہا تھا۔

26 جون 1946ء کو چیانگ کائی شیک نے ہوبئی-ہینان کے وسیع میدانی علاقے (سرخ فوج کے زیر انتظام) پر حملے کے لیے تین لاکھ فوجوں کا اجتماع کر کے محاصرہ کرنا شروع کر دیا۔ وسطی میدانی علاقوں کی 'PLA' نے لی ژیانیان (Li Xinanian)، ژینگ وی سان (Zheng Weisan) اور وانگ ژین (Wang Zhen) کی قیادت میں 60 ہزار فوج کے ذریعے یہ حصار توڑ کر نئی پوزیشنیں سنبھال لیں۔

اس کے بعد جولائی میں چیانگ کائی شیک نے امریکی مشیروں کی رہنمائی اور مشوروں کے ذریعے 16 لاکھ باقاعدہ فوج کے ساتھ بڑا حملہ کر دیا۔ یہ حملہ چین میں سرخ فوج کے زیر انتظام تقریباً تمام علاقوں پر کیا گیا۔ یہ چین کی تاریخ کی سب سے بڑی سول جنگ تھی۔ اس جنگ کے آغاز پر چیانگ کائی شیک کی فوج کی کُل تعداد 43 لاکھ تھی جبکہ اس وقت PLA کی تعداد 12 لاکھ 80 ہزار تھی۔

کومنتانگ حکومت کی یہ جارح حملہ آور فوج تیزی سے مختلف شہروں اور علاقوں پر قبضہ کر کے امریکی امداد کے ساتھ ایک تیز فتح حاصل کرنے کی حکمت عملی پر کاربند تھی۔ 1947ء کے پہلے حصے میں یہ حملہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

اس لانگ مارچ کے دوران ماؤزے تنگ اور چُو تہہ (Chu Teh) بہت ہی ذہین اور قابل فوجی حکمت عملی استوار کرنے والے کمانڈر بن کر ابھرے تھے۔ متحرک دفاع کے طریقہ کار کے مطابق کومنتانگ کی فوجوں پر حملوں کے ذریعے کاری ضربیں لگنا شروع ہو گئیں۔ چُو تہہ نے 1922ء میں چین کی کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کی کمان میں فوجی قوتوں نے 1928ء میں ماؤ کی فوجوں میں شمولیت اختیار کی تھی۔ چُو نے لانگ مارچ اور جاپان کے خلاف سول جنگ میں کمیونسٹ پارٹی کے اہم فوجی کمانڈر کا کردار ادا کیا تھا۔

اس متحرک دفاع کی پالیسی کے تحت PLA نے رضا کارانہ طور پر اپنے کچھ زیر انتظام علاقوں سے انخلا کر کے متحرک حملوں کے ذریعے دشمن کے 7 لاکھ سے زیادہ فوجیوں کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ PLA نے اپنے آپ کو زیادہ تر دشمن سے چھینے ہوئے ہتھیاروں سے لیس کر کے یہ جنگ لڑی۔ بہت سے جنگی قیدیوں نے PLA میں شامل ہونا شروع کر دیا جس سے اس فوج کی تعداد تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئی۔ اس جنگ کے دوران PLA آرمی بڑی مضبوط اور دلیر ہوتی گئی جبکہ کومنتانگ کی فوجیں بزدل، کمزور اور بدظن ہوتی گئیں۔ اس وجہ سے مارچ 1947ء کے بعد کومنتانگ نے ملک گیر جنگ بند کر کے مخصوص علاقوں پر حملوں کو مرکوز کر دیا۔ ان میں شین ڈونگ اور شانکسی کے شمالی علاقہ جات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد شمال مشرقی اور شمالی چین کے علاقوں میں PLA نے جوابی حملہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک سال کی اس خانہ جنگی میں چیانگ کائی شیک کے 11 لاکھ 20 ہزار فوجیوں کو ناکارہ کر دیا گیا تھا اور PLA کی فوجوں کی تعداد 12 لاکھ 80 ہزار سے بڑھ کر 20 لاکھ ہو گئی تھی۔ جولائی سے ستمبر 1947ء میں PLA نے ملک

گیر جوابی حملے شروع کر دیئے۔ جنگ میں بازی کا یوں الٹ جانا تاریخ کے ایک اہم موڑ کو جنم دے رہا تھا۔

اس جنگ کا پانسہ پلٹنے میں فوجی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ سیاسی پروگرام اور لائحہ عمل نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ 13 ستمبر 1947ء کو کمیونسٹ پارٹی نے ایک قومی زرعی کانفرنس منعقد کی جس میں ایک زرعی قانون پاس کیا گیا۔ جو مندرجہ ذیل نکات پر مبنی تھا۔

آرٹیکل 1: جاگیردارانہ اور نیم جاگیردارانہ استحصال کے نظام پر مبنی زرعی نظام کا خاتمہ اور زمین کی کاشتکار کو ملکیت

آرٹیکل 2: جاگیرداروں کے تمام مالکانہ حقوق کا خاتمہ

آرٹیکل 3: تمام مزارعوں، درسگاہوں، عبادت گاہوں، سکولوں، اداروں اور تنظیموں کی زمین کی وراثتی، خاندانی اور انفرادی ملکیت کا خاتمہ

آرٹیکل 4: ان اصلاحات سے پیشتر دیہی علاقوں میں کسانوں کو دیے گئے تمام قرضوں کا خاتمہ اور عام معافی

اس زرعی قانون کے آرٹیکل دس کی مختلف شقوں کا اطلاق کومنتانگ کے فوجی سپاہیوں پر ہوتا تھا جس کے تحت،

سیکشن سی: PLA جمہوری حکومتوں اور تمام عوامی تنظیموں کے افراد کو جو دیہی علاقوں کے رہنے والے ہیں اور ان کے خاندانوں کو مزارعوں کے برابر زمینیں اور جائدادیں دیہی علاقے میں دی جائیں گی۔

سیکشن ڈی: جاگیرداروں اور ان کے خاندانوں کو کسانوں کے برابر زمینیں دی جائیں گی۔

سیکشن ای: کومنتانگ کے افسروں اور سپاہیوں اور اس پارٹی کے ممبران کے خاندانوں (جن کے گھر دیہی علاقوں میں ہیں) کو کسانوں کے برابر زمین اور جائیداد دی جائے گی۔ یہ پالیسی اور پروگرام نہ صرف عام غریب کسانوں کی سرخ فوج میں شمولیت اور حمایت کا باعث بنے تھے بلکہ کومنتانگ فوج کے بہت سے سپاہی اور کچھ افسران اس پروگرام کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ شریک تھے۔ یہ اصلاحات PLA کے زیر انتظام علاقوں میں تیزی سے نافذ کی گئی تھیں۔ اس قانون کے تحت ان علاقوں کے دس کروڑ کسانوں میں زمین تقسیم کی گئی جو وسیع عوامی حمایت کے حصول اور عوامی پھیلاؤ میں بہت ہی اہم اقدام ثابت ہوا۔

اس کے برعکس کومنتانگ کے زیرانتظام علاقوں میں بدعنوانی کی انتہا ہوچکی تھی۔ امریکہ سے آئے ہوئے ڈالر زیادہ تر ریاستی افسران کی جیبوں میں جارہے تھے۔ بدعنوانی کی انتہا یہ تھی کہ اسلحہ اور دوسری اشیا سرکاری فوجی کمیونسٹوں کو سونے اور دوسری چیزوں کے عوض ردی کے بھاؤ فروخت کردیتے تھے۔

ان علاقوں میں کسانوں پر ریاستی اہلکاروں کی بربریت کا یہ عالم تھا کہ کئی علاقوں میں کومنتانگ کے افسران غریب مزارعوں سے اسی سال تک کے ایڈوانس ٹیکس وصول کررہے تھے۔ چار خاندان چین کی دولت لوٹ رہے تھے اور امریکہ کے تابع تھے۔ کومنتانگ کے زیرانتظام علاقے دراصل ایک امریکی کالونی بن چکے تھے۔

جولائی 1947ء میں امریکہ اور کومنتانگ کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کے تحت چیانگ نے چین کے علاقائی، فوجی، داخلی، سفارتی اور معاشی حقوق امریکہ کو فروخت کردیئے۔ جولائی 1947ء کے بعد چیانگ امریکہ سے 4 ہزار ملین ڈالر مزید حاصل کرچکا تھا۔ معاشی، صنعتی اور زرعی بحران کی شدت نے زندگی اجیرن کردی تھی۔ عام استعمال کی اشیا قبل از جنگ کی قیمتوں کے مقابلے میں اب 18000 گنا بڑھ چکی تھی۔ اپریل 1947ء تک یہ قیمتیں 60 ہزار گنا بڑھ گئی تھیں۔ مزاحمت کی جنگ کے آغاز پر چیانگ کائی شیک حکومت نے 1400 ملین یوان کے نوٹ جاری کیے۔ جاپان کی شکست کے وقت یہ کرنسی بڑھ کر 5 لاکھ ملین یوان ہوچکی تھی اور اپریل 1947ء میں نوٹوں کی تعداد بڑھ کر ایک کروڑ 60 لاکھ ملین یوان تک پہنچ گئی تھی۔

دیہی تحریک کے ساتھ ساتھ شہروں میں بھی بغاوت اس بحران کے خلاف ابھر رہی تھی۔ دسمبر 1946ء میں بیجنگ یونیورسٹی کی ایک طالبہ کے ساتھ جنسی زیادتی کے خلاف پانچ لاکھ طلبا کا مظاہرہ ہوا۔

10 اکتوبر 1947ء کو PLA نے ایک منشور جاری کیا جس کے تحت چیانگ کائی شیک حکومت کو اکھاڑ کر ایک مخلوط جمہوری حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ حکومت مزدوروں، کسانوں، سپاہیوں، دانشوروں اور کاروباریوں پر مبنی ہونا تھی۔ اس میں تمام محکوم طبقات، تمام عوامی تنظیموں، اقلیتوں، بیرون ملک چینیوں اور دوسرے 'محبِ وطن' عناصر کی یکجہتی کی بات کی گئی تھی۔ اس منشور نے کمیونسٹ پارٹی کی سربراہی میں ایک عوامی جمہوری متحدہ محاذ بنانے کی اپیل بھی کی تھی۔

اس اپیل کے تحت کومنتانگ کی ڈوبتی کشتی کو دیکھتے ہوئے بہت سے سرمایہ دار اور اس طبقے کے دانشور اور سیاسی لیڈر اس چھتری تلے کمیونسٹ پارٹی کی جانب راغب ہونا شروع ہوئے۔ 1948ء کے موسم بہار میں مختلف بورژوا سیاست دانوں نے ہانگ کانگ میں ڈیموکریٹک لیگ بنا کر کمیونسٹ پارٹی سے الحاق کر لیا۔ اسی طرح کومنتانگ کے بہت سے دوسرے لیڈر بھی کمیونسٹ پارٹی میں آنا شروع ہو گئے۔ یکم مئی 1948ء کو کمیونسٹ پارٹی نے ان تمام جمہوری عناصر کے ساتھ الحاق بنانے کے لیے پھر نئی عوامی سیاسی مشاورتی کانفرنس کی کال دی اور ان عناصر کو ساتھ ملانا شروع کر دیا۔

لیکن دوسری جانب جنگ کا پانسہ مکمل طور پر پلٹ چکا تھا اور 1948ء کے موسم بہار میں PLA نے اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے شہروں اور دیہی علاقوں کی بڑی تعداد پر قبضہ کر کے کومنتانگ کے تسلط سے ان کو آزاد کروانا شروع کر دیا۔

ستمبر 1948ء میں PLA نے تین بڑی فوجی مہمات شروع کیں۔ یہ لیا کژائی شینیانگ (Liooxi-Shenyang)، ہوائی ہائی (Huai-hai) اور بیپنگ تیانجن (Beiping-Tian jin) کی مہمات تھیں۔

پہلی مہم میں شمال مشرق میں PLA نے 47 ہزار کومنتانگ فوجوں کا صفایا کر دیا اور پورے شمالی چین کو آزاد کروا لیا۔ اس وقت کومنتانگ کی فوجوں کی کل تعداد 29 لاکھ افراد تک رہ گئی تھی جبکہ PLA کی تعداد بڑھ کر 30 لاکھ ہو گئی تھی۔ ہوا ہائی مہم 7 نومبر 1948ء سے دس جنوری 1949ء تک چلی گئی جس میں مشرقی چین میں کومنتانگ کی 5 لاکھ 50 ہزار فوج کو شکست دے کر پورے خطے کو آزاد کروایا گیا۔ اس مشرقی فوجی کمان اور فوج کا سیاسی سیکرٹری ڈینگ ژیاؤ پنگ تھا۔ اس طرح تا کجنگ (جو کومنتانگ کا دارالحکومت تھا) اور شنگھائی PLA کی زد میں آ گئے۔

بیپنگ، تیانجنگ فوجی مہم کی پیش قدمی پانچ دسمبر 1948ء کو شروع ہوئی اور 31 جنوری 1949ء کو اس کا خاتمہ ہوا۔ اس حملے میں کومنتانگ کی 5 لاکھ 20 ہزار افراد پر مبنی فوج کو مکمل شکست اور خاتمے سے دوچار کیا گیا۔ اس طرح چین کا انقلاب بڑی حد تک فتح مند ہو چکا تھا۔

مارچ 1949ء میں کمیونسٹ پارٹی کی ساتویں مرکزی کمیٹی کے دوسرے پلینری سیشن کا اجلاس بلایا گیا۔ پارٹی کے کام کو دیہاتوں سے شہروں کی جانب منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس میں کمیونسٹ پارٹی اور PLA کے مراکز کو بیجنگ منتقل کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

کومنتانگ کا زوال اور سقوط قریب آ رہا تھا۔ اس شکست سے بچنے کے لئے کومنتانگ نے امن کا ڈھونگ رچانا شروع کر دیا۔ یکم جنوری 1949ء کو چیانگ کائی شیک نے امن کی اپیل کر دی۔ لیکن جواب نہ آنے اور شکست کے آثار واضح ہو جانے کی صورت میں اس نے ریٹائرڈ ہونے کا اعلان کر دیا اور نائب صدر کو عہدہ سونپ دیا۔ اس اپیل کا جواب ماؤزے تنگ نے آٹھ شرائط عائد کر کے دیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے نمائندوں اور کومنتانگ کی نئی صدر لی زنگرین کی حکومت کے مابین پندرہ روزہ مذاکرات کے بعد 'داخلی امن' کا ایک اور سمجھوتہ طے پایا لیکن 20 اپریل کو یہ معاہدہ بھی ٹوٹ گیا۔

21 اپریل کو PLA کے دستوں نے دریائے چانگ جیانگ کو عبور کرنا شروع کر دیا۔ 23 اپریل 1949ء کو کومنتانگ حکومت کے مرکز نانجنگ میں یہ فوجیں داخل ہوئیں اور اس حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد کومنتانگ کے زیر انتظام دوسرے علاقوں کی جانب پیش قدمی شروع کی گئی اور مختلف جنگوں اور جھڑپوں کے بعد تبت کے علاوہ باقی تقریباً سارے چین کو آزاد کروا لیا گیا۔ جولائی 1946ء اور جون 1950ء کے درمیان PLA نے کومنتانگ کے 80 لاکھ 70 ہزار افراد کو ناکارہ بنا دیا۔ توپخانے کے 54400 ہتھیاروں پر قبضہ کیا۔ 319900 مشین گنوں، 1000 ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں 20 ہزار فوجی گاڑیوں اور بے پناہ دوسرے ہتھیاروں اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا گیا۔

21 ستمبر 1949ء کو چین کی عوامی سیاسی مشاورتی کانفرنس بیجنگ میں بلائی گئی۔ چین کا نام عوامی جمہوریہ چین رکھا گیا اور ماؤزے تنگ کو حکومت کی مرکزی کونسل کا چیئرمین چنا گیا۔ ژوڈے، لیوشاؤچی، سونگ چنگ لنگ، لی جی شین، ژانگ لان اور گوا گانگ کو نائب چیئرمین مقرر کیا گیا۔ چواین لائی سمیت 55 دوسرے ممبران کی مرکزی حکومت کی کونسل تشکیل دی گئی۔ عوامی جمہوریہ چین کی فتح کا جشن یکم اکتوبر 1949ء کو منایا گیا اور بیجنگ کے تیانامن اسکوائر سے ماؤ نے اس کا اعلامیہ جاری کیا۔ اس وقت چین کی آبادی ساٹھ کروڑ تھی۔

تجزیہ

1949ء کے انقلاب میں چین کی تاریخ میں پہلی دفعہ کروڑوں عوام جو سامراج کے مظالم اور جاگیردارانہ جبر و استحصال کا شکار تھے تاریخ کے میدان میں اپنی تاریخ مرتب کرنے کے لیے

نکلے۔ 27-1925ء کے انقلاب کے برعکس 1949ء کا انقلاب

1917ء کے انقلاب کی کلاسیکی طرز پر مبنی نہیں تھا۔ وہ مزدور طبقے کی شعوری مداخلت کی بجائے کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں کسانوں کی ایک تحریک تھی۔ اس انقلاب کی کامیابی کی عمومی وجوہات کو دیکھا جائے تو وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ چین کی قومی بورژوازی اتنی کمزور، بدعنوان، پراگندہ، بزدل اور ظالم تھی کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر گر رہی تھی۔ امریکی برطانوی اور دیگر سامراجیوں کی حمایت اور فوجی امداد بھی انہیں نہیں بچا سکی۔

2۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سامراجی قوتیں اپنے باہمی تصادم میں ٹکرا کر اتنی کمزور اور بحران کا شکار ہو چکی تھیں کہ ان میں انقلابی تحریک اور PLA کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی اہلیت ہی نہیں رہی تھی۔ سامراجی فوجیں جنگ میں تھک چکی تھیں اور امریکی اور برطانوی فوجوں میں بغاوت کے رجحانات ابھر رہے تھے۔ ان کو چین میں ابھرنے والی انقلابی تحریک کے خلاف استعمال کرنے سے سامراج کے اپنے تسلط اور فوجی جبر کے وجود کو شدید خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ امریکی جرنیلوں کی سخت ضد کے باوجود امریکہ کے سیاسی حکمرانوں نے اس انقلاب کو روکنے اور چین میں فوجی جارحیت کی حکمت عملی کو مسترد کر دیا تھا۔

3۔ چین میں گوریلا جنگ اور کسان تحریکوں کی روایات اور تاریخی بنیادیں موجود تھیں جن میں یہ کسان جنگ اس دفعہ بالکل مختلف قسم کے انجام کو پہنچی۔

4۔ کمیونسٹ پارٹی میں ایسے افراد موجود تھے جنہوں نے اس جنگ کے دوران فوجی حکمت عملی اور ہنر میں کمال مہارت حاصل کیا اور کمیونسٹ پارٹی کے زرعی انقلاب کی پالیسی نے وسیع پیمانے پر کمیونسٹ پارٹی کو حمایت دلوائی جس سے سرخ فوج نے بہت تیزی سے بڑھنا شروع کر دیا اور اس کی پیش قدمی کے آگے کومنتانگ حکومت کاریت کی دیوار کی طرح گر جانا نہ صرف امریکہ اور چیانگ کائی شیک کے لیے حیران کن تھا بلکہ چین کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت اور ماسکو میں سٹالنسٹ قیادت بھی حیران رہ گئی تھی۔

لیکن اس انقلاب کا یکطرفہ تجزیہ نہ صرف تاریخ کے اہم واقعات کو چھپا دے گا بلکہ حکمران پارٹی کی مرتب کردہ تاریخ کی طرح اس انقلاب کا سب سے منفرد پہلو یہ ہے کہ اس انقلاب کے نتائج اور اس کا لائحہ عمل اس کی قیادت کے تناظر اور نظریات کے برعکس تھا۔ ماؤ اور کمیونسٹ پارٹی کی حاوی قیادت کا 27-1925ء کے انقلاب کی خونی شکست کے بعد زوال پذیری کا عمل زیادہ تیز ہو

گیا تھا۔ سٹالن کی قیادت میں کومنٹرن کی زوال پذیری کے بعد جو بنیادی مرحلہ وار انقلاب کی پالیسی اپنائی گئی تھی وہ 50-1949ء کے انقلاب میں اور اس کے بعد بھی جاری رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

ماؤزے تنگ نے 1940ء میں بنیادی نظریاتی لائحہ عمل اپنی مشہور کتاب ''نئی جمہوریت'' میں وضع کیا تھا۔

''۔۔۔آج کے وقت کے چینی سماج کے نوآبادیاتی، نیم نوآبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ کردار سے چین کے انقلاب کو لازماً دو مرحلوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلا قدم نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ سماج کی کیفیت کو آزادانہ اور جمہوری سماج میں تبدیل کرنا ہے۔ دوسرا مرحلہ (جن کے درمیان اس کتاب میں پچاس سے سو سال کے وقفے کا ذکر کیا گیا ہے) اس انقلاب کو آگے بڑھا کر چین میں ایک سوشلسٹ سماج استوار کرنے کی ضرورت ہے۔'' (ماؤزے تنگ منتخب تصانیف، بیجنگ 1975ء، جلد نمبر 2، صفحہ 342)

لیکن سرخ فوج کے اقتدار پر قبضے کے بعد بھی جب سرمایہ داری کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی اور مختلف سرمایہ دار پارٹیوں سے الحاق کر کے سرمایہ دارانہ بنیادوں پر عوامی جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو ماؤ اور قیادت کو ان کی توقعات اور ان کے پیش نظر اور پیش گوئی کے برعکس انقلاب کی اپنی حرکت، جدوجہد اور عمل کے مختلف پہلوؤں اور گرمائش نے صورتحال کو انتہا ریڈیکل بنا دیا تھا کہ محنت کش طبقہ قیادت کی تمام رکاوٹوں کو توڑتا ہوا ان کے مصنوعی نظریاتی مراحل کو پاش پاش کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ قیادت کو محنت کشوں کی اس تحریک، جستجو اور جدوجہد کی شدت اور عمل کی پیروی کرنی پڑی۔ انقلابی فتح حاصل کرنے کے بعد سرخ فوج اور اس کی انقلابی تبدیلی سے چین کے محنت کشوں کو جس آزادی اور زنجیروں کے ٹوٹنے کا احساس ہوا تھا وہ چین کی قومی یکجہتی اور فرسودہ قومی جمہوری مرحلے کے لیے قومی سرمایہ داروں کی بیڑیاں پہننے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ دیہاتوں میں تو زمینوں کی تقسیم اور زرعی انقلاب کو کمیونسٹ پارٹی کی قیادت نے قومی جمہوری انقلاب کے مرحلے کے حوالے سے کیا تھا۔ لیکن تحریک کی یہ شدت شہروں میں سرمایہ داری کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی اور چین میں بہت تیزی سے سرمایہ داری کا خاتمہ ہونا شروع ہو گیا۔ ماؤ اور دوسری پارٹی قیادت نے اس صورت حال کو پھر اپنے رنگ میں موڑ لیا کیونکہ مزدوروں کی جمہوری شراکت کی بجائے یہ انقلاب کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں کسانوں کی تحریک کے

بلبوتے پر ابھرا تھا اس لیے اس قیادت نے اس سرمایہ داری کے خاتمے پر چین میں نئی حکومت کو جس بنیاد پر تشکیل دیا وہ سوویت یونین اور ماسکو کے ماڈل پر مبنی تھی لیکن المیہ یہ تھا کہ یہ 1917ء کا لینن کا ماسکو نہیں تھا بلکہ 1949ء کے سٹالن کے ماسکو کا ماڈل تھا جس میں یہ انقلاب ابتدا ہی سے ایک مسخ شدہ بیوروکریٹک شکل میں رونما ہوا تھا۔ ماؤ نے جس سٹالنسٹ ڈھانچے کو چین میں ابتدا ہی سے استوار کیا تھا وہ عمل شعوری تھا اور ماؤ، لی شاؤ چی، چواین لائی، ڈینگ ژیاؤ پنگ سمیت تمام لیڈران کو اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ایک کسان فوج پر کنٹرول آسان ہوتا ہے چونکہ اس کا ڈھانچہ مختلف ہوتا ہے جبکہ کسی صنعتی مزدوروں کی تحریک، تنظیم، پارٹی، جدوجہد اور انقلاب کا ڈھانچہ، طریقہ کار، سوچ، شعور، لائحہ عمل، قیادت کا کردار اور قیادت پر کنٹرول بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کینٹن، شنگھائی، ناجنگ اور دوسرے بڑے صنعتی شہروں میں جب کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں سرخ فوج کے دستے پہنچے تو لال جھنڈے اٹھائے ہوئے استقبال کرنے والے صنعتی مزدوروں کے جلوسوں پر کئی شہروں میں گولیاں برسائی گئیں کیونکہ مزدوروں کا انقلابی عمل اور نیا سماجی ڈھانچہ ابتدا ہی میں چین کی کمیونسٹ پارٹی کی بیوروکریٹک قیادت کے تسلط اور سٹالنسٹ ڈھانچے کے کنٹرول کے لیے خطرہ بن سکتا تھا لیکن ہڑتالوں اور فیکٹریوں پر مزدوروں کے قبضے اور سرمایہ داروں کو بھگانے کے اس سارے عمل کو واپس پلٹانا ماؤ کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا اقدام اس کی ساکھ اور بنیادیں منہدم کر سکتا تھا۔ سٹالنزم کا طریقہ کار جس کو چین کے اس انقلاب کی قیادت نے اپنایا بنیادی طور پر مزدور جمہوریت کے فقدان پر مبنی تھا۔ اس انقلاب نے اس پس منظر میں جو راستہ اپنایا اور جو شکل اختیار کی وہ پرولتاری بونا پارٹزم کی شکل تھی۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جب ایک طبقہ کسی دوسرے طبقے کے تاریخی فرائض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم نے یہ صورتحال کلاسیکی بورژوا جمہوری انقلابات میں دیکھی تھی جہاں جرمنی میں پرانی اشرافیہ اور بادشاہت کے نمائندے بسمارک کی سربراہی میں جنکروں نے اس انقلاب کے ذریعے جرمن قوم کو یکتا کر کے حقیقی معنوں میں جنم دیا۔ اسی طرح جاپان میں زیادہ ترقی یافتہ سامراجی ریاستوں کی ترقی کے دباؤ کی وجہ سے یہاں کے جاگیردار طبقے نے ہی صنعت کاری کی اور سماج کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا فریضہ ادا کیا۔ لیکن جاگیرداری کا خاتمہ اور سرمایہ دارانہ انقلاب کے دوسرے فرائض کسی قومی جمہوری حکومت کے تحت تکمیل تک نہیں پہنچے تھے بلکہ امریکی سامراجی جرنیل ڈگلس میکارتھر نے فوجی بوٹوں کے جبر تلے جاپان کے جاگیرداروں کو سرمایہ دارانہ انقلاب

کرنے پر مجبور کیا تھا۔لیکن جن مقامات پر بھی یہ ہوتا ہے وہاں سماج کو ایک قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

تاریخی ارتقا کا دھارا پیچیدہ، گھمبیر اور مسخ شدہ شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔اس کی وہی شکل بن جاتی ہے جس طرح کوئی بچہ پیدائشی اپاہج ہوتا ہے۔اس قسم کے پرولتاری بونا پارٹسٹ انقلابات کی صورت میں جہاں سٹالنسٹ افسر شاہی یا گوریلا لیڈر محنت کش طبقے کے اجتماعی کنٹرول اور لائحہ عمل سے ادا کیے جانے والے فرائض ان پر ایک نئی طرز کی بونا پارٹسٹ اشرافیہ کا گروہ ہو کر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں پھر محنت کش طبقے کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔اسی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو پرولتاری بونا پارٹسٹ حکومتیں وہ طرزِ حاکمیت ہوتی ہیں جہاں محنت کش طبقے کا سہارا لے کر اور ان پر انحصار کر کے گوریلا لیڈر، فوجی افسران یا درمیانے طبقے کے افراد کے گروہ ایک گوریلا جنگ یا فوجی بغاوت کے ذریعے سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ کرتے ہیں اور بیوروکریسی کے کنٹرول میں منصوبہ بندی پر مبنی سوشلسٹ معیشت کا اجرا ایک مسخ شدہ شکل میں کرتے ہیں لیکن اس انقلاب کے عمل میں محنت کش طبقے کی شعوری شراکت اور تحریک وجدوجہد پر مشتمل کہ جمہوری کنٹرول نہیں ہوتا۔اس پس منظر میں یک نئے انقلاب کی ضرورت پھر پیدا ہو جاتی ہے۔مزدور جمہوریت پر مبنی یہ سوشلسٹ انقلاب مزدوروں کی نئی حکمرانی کو جنم دیتا ہے وہ جس ریاست کی تشکیل کرتا ہے وہ ریاست سوشلزم کی جانب سماج کے سفر کا آغاز کرتی ہے۔

مارکس اور اینگلز نے اس امر کی تفصیلاً وضاحت کی تھی کہ محنت کشوں کو استحصال کرنے والے طبقات کی مزاحمت کو ختم کرنے اور اس پر قابو پانے کے لیے اپنی ریاست درکار ہوتی ہے۔یہ ریاست پورے مزدور طبقے کے انتظام اور کنٹرول میں پیداوار کو جمہوری بنیادوں پر منظم کرتی ہے۔لیکن یہ ریاست اپنے آغاز سے ہی نیم ریاست ہوتی ہے جس کا مقصد اپنے وجود کو پیداوار میں مسلسل اضافے اور انقلاب کو پورے خطے اور عالمی سطح پر پھیلانے کے عمل کے ساتھ بتدریج ختم کرنا ہوتا ہے۔اس کے بکھرنے کا عمل اس کے وجود میں آنے کے پہلے دن سے شروع ہو جاتا ہے۔اس قسم کی ریاست پیرس کمیون (1871ء) یا بالشویک انقلاب کے بعد جنم لینے والی روس کی ریاست تھی۔

روس (1917ء) اور چین (1949ء) کے انقلابات میں بنیادی فرق یہی تھا کہ روس کے انقلاب کی قیادت محنت کش طبقہ پورے عمل میں شعوری شراکت اور اجتماعی جدوجہد کے

ذریعے کر رہا تھا۔ اس میں قیادت پرولتاریہ کے پاس تھی اور پرولتاریہ ہراول دستے کے طور پر غریب کسانوں اور سماج کے دوسرے طبقات کو اپنی قیادت میں اپنے ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ مزدور طبقے کی اجتماعی تحریک اور کسان جنگوں اور تحریکوں کا فرق صاف ظاہر ہے۔ دونوں طبقات تاریخ کے مختلف عہدوں کے طبقات ہیں جن کے انہی عہدوں اور آلات کار کی کیفیت کے مطابق ہی سماجی کردار بنتے ہیں۔ اس لیے جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو ابتدا میں حقیقی بنیادوں پر مزدور جمہوریت پر مبنی نیم ریاست ابھری جو پانچ سے سات سال کے عرصے کے بعد زوال پذیر ہونا شروع ہوئی۔ یہ ریاست لینن کے چار بنیادی اصولوں پر مبنی تھی۔

1۔ تمام ریاستی اہلکاروں کے سوویتوں کے ذریعے مکمل طور پر آزادانہ اور جمہوری انتخابات اور ان افسران کو واپس بلائے جانے اور جواب طلبی کا ان سوویتوں کو حق

2۔ کسی سرکاری افسر کو ایک ہنرمند مزدور سے زیادہ اجرت اور مراعات نہ مل سکنا

3۔ علیحدہ فوج کا نہ ہونا بلکہ محنت کش عوام کا سوویتوں کے ذریعے مسلح ہونا

4۔ ریاست کے تمام فرائض کی ادائیگی میں مسلسل تبدیلی جس میں باورچی وزیراعظم بن سکے اور وزیراعظم باورچی

یہ نکات لینن نے انقلاب کے دوران لکھی جانے والی عظیم تصنیف ''ریاست اور انقلاب'' میں وضع کیے تھے۔

لیکن 1949ء میں چین میں ایسا نہیں ہوا۔ چین کے انقلاب نے اپنے آغاز سے ہی سٹالنسٹ شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کا تعین پہلے سے ہی اس کی سرحدوں پر موجود روس کی دیوہیکل مسخ شدہ مزدور ریاست کے وجود سے ہی ہو گیا تھا۔ 27-1925ء کے برعکس اس میں پرولتاریہ نے ہراول کردار ادا نہیں کیا۔ دراصل سٹالنسٹ قیادت نے کسان طبقے کو ایک دیوہیکل ہتھوڑے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے بورژوازی کو کچلا۔ انہوں نے قیادت محنت کش طبقے کے نام پر حاصل کی تھی لیکن یہ محنت کش طبقہ اس عمل میں شعوری شراکت نہیں کر سکا تھا۔ ماؤ محنت کش طبقے کی آزادانہ طبقاتی تحریک سے خوفزدہ تھا اور اس نے اس کو ابھرنے سے روکنے کے لیے ہر ممکنہ اقدام کیا تھا۔

یہ کمیونسٹ پارٹی جو سٹالن زدہ ہو چکی تھی اس کا 1949ء کے قریب شہروں اور بڑے قصبوں میں بہت ہی کم وجود تھا۔ مارشل نی رونگ ژین (Nie Rongzhen) شمالی سرخ فوج کے

کمانڈر کے مطابق جب 1949ء میں وہ اپنی فوجیں لے کر بیجنگ میں داخل ہوا تو اس وقت پورے شہر میں کمیونسٹ پارٹی کے کل 3 ہزار ممبران تھے، اسی طرح چین کے پرولتاریہ کے گڑھ شنگھائی جہاں کی آبادی 90 لاکھ تھی وہاں کمیونسٹ پارٹی کے صرف 8 ہزار ممبران تھے۔ محنت کش طبقے کی اس 49-1945ء کی انقلابی تحریک میں عدم شرکت کی وجوہات میں جہاں کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کی پالیسیوں، لائحہ عمل اور حکمت عملی کا بہت دخل ہے وہاں 27-1925ء کے انقلاب کی خونی شکست کے اثرات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ 30 مئی 1925ء کو مزدور تحریک تیزی سے ابھری تھی۔ 1927ء کے موسم بہار میں یہ تحریک اپنی انتہا کو پہنچی تھی جب شنگھائی کی مشہور تین سرکشیاں برپا ہوئیں۔ لیکن یہ اپنے منطقی انجام، سوشلسٹ انقلاب تک نہیں پہنچ سکیں۔

تحریک کی اس پسپائی کی وجہ سے، پہلے حالات کی مجبوری اور دباؤ اور بعد میں شعوری پالیسی کے تحت 1933ء کے دوران کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی شنگھائی سے نکال لی گئی اور دور دراز دیہی علاقوں میں اس کا پڑاؤ ڈالا گیا۔

اس انقلابی تحریک کا دوسرا اہم منفی پہلو بین الاقوامیت کا نہ ہونا تھا۔ طبقاتی مفاہمت کے مرحلہ وار انقلاب کے نظریئے اور سٹالنزم کی ''ایک ملک میں سوشلزم'' کی قومی تنگ نظری کی سوچ میں یہ ہونا ناگزیر تھا۔ دوسری جانب سٹالنسٹ طرز کی بین الاقوامیت ''سوشلسٹ ممالک'' کی ''سوشلسٹ ممالک'' کی امداد پر مبنی تھی جس کا مارکس اور لینن کی پرولتاری بین الاقوامیت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ یہ اس کی ضد تھی کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ جب کسی قوم کا مفاد پورا ہوتا ہے تو محنت کش طبقے کا مفاد قتل ہوتا ہے اور جب طبقاتی مفادات ابھرتے ہیں تو ان کی تکمیل سے قومی مفادات پر کاری ضرب لگتی ہے کیونکہ کسی بھی قوم میں تمام طبقات ہوتے ہیں اور اس قومی ڈھانچے یا کیفیت میں غلبہ حکمران طبقے کا ہوتا ہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ قومی مفادات کی جدوجہد آخری تجزیئے میں اس قوم کے حکمران طبقات کی جدوجہد ہوتی ہے۔ لیکن کوئی طبقاتی جدوجہد اس وقت ہی تشکیل پا سکتی ہے جب وہ قوم سمیت ماضی کے تمام تعصّبات کا خاتمہ کر کے ایک عظیم اور بلند ترین طبقاتی یکجہتی کو جنم دیتی ہے جس کی سیاست، ثقافت اور معیشت ماضی کی تمام کیفیتوں سے مختلف، جدید اور ترقی پسند ہوتی ہے۔ یہی مارکسزم کا بنیادی مؤقف ہے جس کو سٹالنزم نے مسخ کر کے ہمارے سامنے حقیقی سوشلزم کے نظریات کو اس بھیانک انجام سے دوچار کیا جو اس نظریاتی انحراف

اور ترمیم پسندی کا نتیجہ ہے۔

اس 'ملکی' 'سوشلسٹ' 'بین الاقوامیت' میں قومی تعصّبات اور تضادات کا ابھرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ اسی لیے تیسری انٹرنیشنل کی زوال پذیری جو 1927ء کے بعد بہت دور تک آگے جا چکی تھی اس کا براہِ راست نتیجہ روسی افسر شاہی کے قومی مفادات کے لیے دنیا بھر کے مختلف سوشلسٹ ممالک، کمیونسٹ پارٹیوں اور ان کے کنٹرول میں مزدوروں کی تحریکوں کا استعمال تھا۔ جہاں دنیا کے ہر خطے میں سٹالنزم نے اپنے قومی مفادات کے حصول کے لیے سامراجی قوتوں سے لین دین کے طور پر کمیونسٹ پارٹیوں اور محنت کشوں کی تحریکوں کو استعمال کیا وہاں انقلاب چین کے پورے عمل میں ہمیں یہ روش بہت واضح انداز میں نظر آتی ہے۔ مثلاً جرمن، امریکی، برطانوی اور جاپانی سامراج کے ساتھ لین دین اور معاہدوں میں سٹالنزم نے چین کی کمیونسٹ پارٹی کو ان مفادات کے حصول کے لیے متعدد بار پالیسیاں، وفاداریاں اور لائحہ عمل تبدیل کرنے پر مجبور کیا اور ان کو اپنے قومی مفادات کا آلہ کار بنانے کی کوشش کی۔ ان میں 1939ء کا سٹالن ہٹلر معاہدہ، 1941ء کا روس جاپان سمجھوتہ اور 1943ء کا یالٹا میں سٹالن، روس ویلٹ اور چرچل کا سمجھوتہ تھا۔ جس میں امریکی اور برطانوی سامراج کو چین اور دیگر ممالک میں روسی افسر شاہی کے زیر اختیار کمیونسٹ پارٹیوں کی بدولت سامراجیوں کو رعایتیں دے کر ان پارٹیوں کی پالیسیوں کو ان معاہدوں کے مفادات کے لیے استعمال کیا۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کے چین ڈوشو جیسے لیڈروں نے کئی بار ان پالیسیوں کے خلاف ابتدا میں مزاحمت کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن پھر ان پالیسیوں سے ہونے والی بربادی کا انہی لیڈروں کو ذمہ دار اور قربانی کا بکرا بنا کر روسی افسر شاہی کی ہائی کمان نے سٹالن کی قیادت میں پالیسیوں کو ٹھونسنے اور اپنی سنگین غلطیوں کو چھپانے کے جواز اور حیلے بہانے تراش لیے۔ پہلے اس کا شکار کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری چین ڈوشو بنا اور اس کو پارٹی سے 1929ء میں نکال دیا گیا اور پھر وفادار سٹالنسٹ چواین لائی، چو چیا پائی، لی لی سان کو اسی عمل میں 1931ء میں پارٹی قیادت سے ہٹا دیا گیا۔ یہاں تک کہ سٹالن نے اپنے جرائم کی پردہ پوشی کے لیے اپنے براہ راست بھیجے گئے قریبی نمائندوں بوروڈن اور ایم این رائے کو بھی معاف نہیں کیا۔

لیکن ان لیڈروں میں ٹراٹسکی کا ساتھ دینے کی جرأت اس لیے بھی نہیں تھی کہ پہلے وہ خود سٹالن کی ''حقیقت پرستانہ'' سیاست پر کاربند تھے لیکن دوسری جانب مارکسی بین الاقوامیت کی زوال

پذیری کی وجہ سے 1927ء کے بعد چین کی کمیونسٹ پارٹی کے وجود کا دارومدار سوویت یونین کی امداد پر تھا۔ یہ وہ عملی وجہ تھی جس کی بنیاد پر ماؤ اور دوسرے لیڈر سٹالن کی حمایت کر رہے تھے۔

اسی بنیاد پر وہ سٹالن کے وانگ منگ جیسے غنڈوں کے ہاتھوں مسلسل تذلیل کے باوجود سٹالن کی حمایت جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان کا یہی کردار ہی چین کی کمیونسٹ پارٹی میں مارکسی حزب اختلاف کی جانب دشمنانہ رویئے کا باعث تھا جوں جوں وقت گزرتا گیا پارٹی کے اندر کا جبر ان ٹراٹسکائٹوں کی تطہیر اور سزاؤں کا موجب بننا شروع ہو گیا۔ چین ڈوشو کبھی بھی ٹراٹسکی کے مؤقف سے مکمل طور پر متفق نہیں رہا تھا لیکن اس کے اختلافات اٹھانے اور کمیونسٹ پارٹی میں اس کے ٹراٹسکائٹ حزب اختلاف سے مل جانے کی وجہ سے اس کو پارٹی کی قیادت کے جبر کا نشانہ بننا پڑا۔ یہی سلوک دوسرے بہت سے افراد کے ساتھ ہوا۔ 24-1923ء میں جب کومنٹرن میں بالشویک لینن اسٹ حزب اختلاف ابھری اور اس نے سٹالن کی بیوروکریٹائزیشن اور جبر کے خلاف مارکسزم کا علم بلند کیا تو اس بائیں بازو کی حزب اختلاف کو بہت سے ممالک میں پذیرائی ملی۔ چین کے انقلاب (27-1925ء)، برطانوی عام ہڑتال 1926ء، جرمنی، فرانس اور کئی دوسرے انقلابات میں سٹالن کی تباہ کن اور غلط پالیسیوں کی وجہ سے شکستوں کی بدولت بائیں بازو کی یہ اپوزیشن مضبوط ہونا شروع ہو گئی۔ ماسکو کی سن یاٹ سین یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبا میں بھی یہ تحریک تیزی سے اس لیے پھیلنا شروع ہو گئی کیونکہ سٹالن کی کمان میں حکمران ٹولے کی پالیسیوں کے بارے میں ٹراٹسکی کا لائحہ عمل اور پیش گوئیاں بار بار سچ ثابت ہو رہی تھیں۔ لیکن دوسری جانب انہی شکستوں کی بدولت محنت کش طبقے میں پھیلنے والی مایوسی نے سٹالن کی افسر شاہی اور ریاست پر اس کی گرفت کو مزید مضبوط کیا۔ جس سے جہاں ٹراٹسکی کی کمیونسٹ کیڈروں میں حمایت بڑھ رہی تھی وہاں سٹالنسٹ افسر شاہی کی بربریت بھی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ان ٹراٹسکائٹوں کو مسلسل ریاستی جبر کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

سیاسی بحث، اختلاف رائے اور سیاسی تنقید کو جبر سے مٹانے اور دبانے سے چینی اور دوسری کمیونسٹ پارٹیوں کا سیاسی اور نظریاتی تربیت کا معیار گرتا جا رہا تھا جس سے سٹالنسٹ بیوروکریٹ ٹراٹسکائٹوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان پارٹیوں میں نظریات اور تھیوری کی جانب ایک حقارت آمیز رویئے کی روایت ڈال دی گئی۔ پارٹی میں داخلی جمہوریت کے

فقدان سے ایک لیڈر کے تجزیوں اور لائحہ عمل کو بغیر کسی سوال و جواب یا تنقید کے تسلیم کر کے اس پر 'عمل' کرنے کی ریت بڑھ رہی تھی۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی میں یہی رویئے کارفرما تھے۔ جس سے روایتی پسماندگی عود کر آئی۔

دوسری جانب ٹراٹسکائٹوں کو ہر طرف سے حملے کا خطرہ تھا۔ تمام سامراجی قوتیں اور ان کے ایجنٹ ان کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چیانگ کائی شیک کو ماسکو نہ بلانے اور کومنتانگ کو تیسری انٹرنیشنل کے ہمدرد یا مبصر کا رتبہ دینے کے خلاف تیسری انٹرنیشنل کی مرکزی کمیٹی میں اکلوتا ووٹ ٹراٹسکی کا تھا۔ اس کے حمایتیوں کی چیانگ کے ساتھ ہر قسم کے الحاق اور مصالحت کی کوشش کے خلاف کمیونسٹ پارٹی میں جدوجہد کرنے کی پاداش میں وہ چیانگ اور کومنتانگ کے عذاب کا شکار تھے۔ چیانگ نے سینکڑوں ٹراٹسکائٹوں کا قتل عام کروایا۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی نے جہاں لانگ مارچ کے دوران علاقوں پر قبضہ کیا وہاں ٹراٹسکی کے پیروکاروں کا صفایا کرنا اپنی ڈیوٹی سمجھا۔

چین میں ٹراٹسکائٹوں کا سب سے بڑا گروپ جریدے 'جدوجہد' کے گرد منظم تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے بہت سے رسالے بھی نکلتے تھے۔ جدوجہد کے گرد ٹراٹسکائٹ نہ صرف کمیونسٹ پارٹی میں کام کرتے رہے بلکہ بہت سے PLA میں مارکسی نظریات کا پرچار کرتے رہے۔ انقلاب کے فوری بعد کے سالوں میں ان کی قوت بڑھنے لگی جس سے گھبرا کر چین کی افسر شاہی نے دسمبر 1952ء میں ان کے خلاف ایک بہت بڑا آپریشن کر کے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ سینکڑوں مارے گئے یا قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے۔ ماؤاسٹ پولیس کے مظالم کا شکار ہونے والوں میں بہت سے اہم ٹراٹسکائٹ بھی شامل تھے۔ ان میں بہت سے جبر کا شکار ہو کر مارے گئے یا جیلوں میں مر گئے۔

اس نظریاتی انحراف کی بنیاد پر جو ریاست کمیونسٹ پارٹی کے تحت وجود میں آئی اس کو محنت کش طبقہ نہیں چلا رہا تھا بلکہ پرانے چین کی سول سروس چلانے والے اس اشرافیہ کے افراد تھے جنہیں 'مینڈرن' کہا جاتا تھا۔ انقلاب کے برپا ہونے کے بعد ان کا لباس اور آداب تو بدل گئے لیکن ان کی مراعات، رتبہ اور ریاست کا کنٹرول نئے انداز میں قائم رہا۔ سرخ فوج کے جرنیلوں کو ان مینڈرنوں نے اپنے اندر سمونا شروع کر دیا جو چین پر ہزار سال سے حکمرانی کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ صحت مند مزدور ریاست نہیں بلکہ اس کی بگڑی ہوئی مسخ شدہ شکل تھی۔

لیکن اس تمام مسخ شدہ ریاست کے باوجود چین میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کا خاتمہ تاریخی اعتبار سے ایک بہت بڑا آگے کا قدم تھا۔ اس سے چین کی معیشت میں موجود بے پناہ امکانات اور اہلیت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ چند دہائیوں میں چین ایک پسماندہ ملک کی کیفیت سے نکل کر منصوبہ بندی پر مبنی معیشت کی بدولت ایک بہت ہی طاقتور صنعتی ملک بن گیا اور پوری دنیا میں ابھرنے والی انقلابی تحریکوں کو ایک نیا مرکز ملا۔

باب 8

بعد از انقلاب چین کا ارتقا

انقلاب چین نے وہ تمام مسائل حل کرنے شروع کر دیئے جو سرمایہ دارانہ بنیادوں پر ممکن نہیں تھے۔ چیانگ کائی شیک کی 30 سالہ حکمرانی اور مالیاتی سرمائے اور سامراجی حمایت کے

باوجود چین میں سرمایہ دارانہ بنیادوں پر سماج کو اس ذلت آمیز کیفیت سے نکالنا ممکن نہیں تھا۔ چین کی بورژوازی نے اس عرصے میں یہ ثابت کیا کہ نہ تو وہ سامراج کا طوق اتار پھینک سکتی تھی اور نہ ہی زرعی انقلاب کو مکمل کر سکتی تھی اور نہ ہی کسی صورت بھی چین کو قومی یکجہتی فراہم کر کے اس کو ایک جدید قومی ریاست بنا سکتی تھی۔ یہ وہ بنیادیں تھیں جن کو کسان فوجوں کے لیڈروں نے حالات و واقعات اور تجربات سے پرکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ روس کی طرز پر ایک سٹالنسٹ ماڈل چین میں استوار کیا جائے۔

اس قیادت کے پاس مارکسی بین الاقوامیت پر مبنی پیش منظر اور لائحہ عمل نہیں تھا اور پرولتاریہ کے شعوری قیادت کے کردار، جو سوشلزم کے حصول کے لیے ناگزیر تھا، کا چین میں فقدان تھا۔ لیکن اس کے باوجود معاشی و سیاسی ڈھانچے کی جو شکل بن رہی تھی وہ تاریخ میں منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ بکھرے ہوئے صوبوں اور علاقوں کو ایک جدید ریاست میں یکجا کرنے میں آگے بڑھ رہی تھی۔

اس نئی ریاست نے زرعی انقلاب برپا کیا۔ ذرائع پیداوار کو قومی و ریاستی تحویل میں لیا۔ ان اقدامات نے چین میں ذرائع پیداوار کو بے پناہ ترقی دی۔ چین نے جس طرح ترقی کی کوئی دوسرا نوآبادیاتی ملک تاریخ میں اتنی تیز ترقی نہیں کر سکا تھا۔

منصوبہ بندی پر مبنی معیشت اور سرمایہ یعنی منڈی کی معیشت میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں طرز کی معیشتوں میں پیداوار کی وجہ اور مقاصد بدل جاتے ہیں۔ سرمایہ داری یا منڈی کی معیشت کی پیداوار کے طریقہ کار کا بنیادی مقصد منافع اور شرح منافع کا حصول ہوتا ہے۔ خواہ یہ قومی سرمایہ داری کے تحت ہو یا سامراجی مالیاتی سرمائے کی بنیاد پر ہو اس پیداواری نظام میں ہر مرحلے پر پیداوار کا، اشیا بنانے کا واحد مقصد ہی دولت کمانا ہوتا ہے۔ 1949ء میں جب سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کیا گیا تو ریاستی تحویل میں آنے والی صنعت اور معیشت کی بنیادیں بدل گئیں۔ 1952ء تک چین کی تقریباً تمام حاوی صنعت اور معیشت ریاستی ملکیت میں آ چکی تھی۔ سرمایہ دار اس انقلابی طوفان کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ان کو افسر شاہی کے کچھ حصوں کی حمایت بھی ملتی تو پھر بھی اس بپھرے ہوئے محنت کش طبقے کا استحصال جاری رکھ کر وہ اپنے منافع کے حصول کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ انقلاب کے ذریعے سامراجی ادارے و اثاثے، بینک اور مالیاتی ادارے بھی قومی تحویل میں لے لیے گئے۔ روس کے ماڈل کے مطابق ان کو سرکاری تحویل میں لینے سے مالیاتی اداروں، صنعت و معیشت

اور تجارت پر ریاستی اجارہ داری کے ذریعے مالیاتی سرمائے اور منافع خوری کی زنجیریں ٹوٹنا شروع ہوگئیں۔ اس سرمایہ دارانہ جکڑ سے آزاد ہونے کے بعد معیشت میں تیز ترقی کا ہونا ناگزیر تھا۔ نئے نظام کے تحت اس معیشت کو چلائے جانے کا طریقہ کار منڈی کے اتار چڑھاؤ سے مطابقت رکھنے کی بجائے ضروریات اور سہولیات کی منصوبہ بند فراہمی کی بنیاد پر رکھا گیا۔ اس کے تحت منصوبہ بندی کی گئی کہ کل پیداواری صلاحیت کیا تھی اور ضروریات کیا تھیں اور ان ضروریات کی تکمیل کے لیے معاشی و صنعتی پیداوار کو بڑھانے کے لیے کیا طریقہ کار استعمال کیا جائے۔ اس معاشی نظام میں جہاں سرمایہ دارانہ منافع خوری کا خاتمہ ہوگیا وہاں معیشت میں اتنا وافر مقدار میں سرمایہ اور دیگر وسائل پیدا ہونے شروع ہوئے جس سے نہ صرف صنعت و حرفت میں تیز ترقی ہونا شروع ہوئی بلکہ سماجی ترقی میں تیز اضافہ ہوا۔ اس نئے سماجی نظام میں ان اقدامات سے غذا، رہائش، صحت اور علاج کی سہولیات، تعلیم، ملازمتوں کا تحفظ، مستحکم قیمتیں اور سماجی استحکام پیدا ہوا۔ دوسری جانب بہت سی سماجی ذلتیں اور برائیاں مثلاً بدعنوانی، جسم فروشی اور خواتین کے خلاف تعصب کا بہت حد تک خاتمہ ہوا۔ چین کی تاریخ میں اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ زمینوں کی تقسیم کا عمل بہت حد تک لانگ مارچ کے دوران غریب کسانوں نے قبضے کر کے ہی مکمل کر لیا تھا۔ انقلاب کے پہلے دس سالوں میں بہت سی اہم سماجی فتوحات حاصل ہوئیں۔ ان شہروں میں مکمل روزگار کے حصول کا آغاز ہوا اور آمدن عمومی سماج میں تقریباً برابر ہوگئی۔ بنیادی سہولیات کسی حد تک پوری کی گئیں۔

لیکن یہ منصوبہ بندی محنت کش طبقے کی اجتماعی شراکت، منسلکیت اور جمہوری کنٹرول میں ہونے کی بجائے سٹالن کے ماسکو کی طرز پر گوریلا فوجوں کے لیڈر اور پرانی افسر شاہی کی باقیات کے ایک بیوروکریٹک ڈھانچے کے ذریعے کی جا رہی تھی۔ اکتوبر 1917ء میں روس میں لینن کے اصولوں کے مطابق ہونے والے سوویتوں کے اس عمل پر جمہوری کنٹرول کی بجائے چین میں اس کی مسخ شدہ بیوروکریٹک شکل سامنے آئی۔

اس پس منظر میں چین کی افسر شاہی تمام دوسری بیوروکریسیوں کی طرح زیادہ دلچسپی اپنی طاقت، مراعات، آمدن اور عزت و مرتبت کے لیے لیتی تھی۔ جس سے چین کی معیشت اور سماجی ارتقا کے عمل کا چند سال بعد ہی دم گھٹنے لگا۔ منصوبہ بندی پر مبنی معیشت کے لیے محنت کشوں کا جمہوری کنٹرول اس طرح ضروری ہوتا ہے جس طرح زندہ جسم کے لیے آکسیجن۔ سوشلزم انسانی سماج کی وہ معراج ہے جہاں مانگ اور ضرورت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کی بنیاد ٹھوس صنعتی

پیداواری اور مادی وسائل کی پیداوار میں بے پناہ اضافے اور ان کی مساوی تقسیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ مارکس نے سوشلزم کا جو نظریہ پیش کیا اس کی بنیاد انہی ذرائع پیداوار کی بے پناہ ترقی سے انسانی ضروریات کی تکمیل اور مانگ کے خاتمے پر مبنی تھی۔

چین میں قائم ہونے والی قیادت نے جس نظام کو جنم دیا تھا وہاں معیشت کی بنیادیں منصوبہ بندی پر استوار تھیں لیکن ایک ملک میں سوشلزم کی قومی تنگ نظری کے نظریے کے تحت حقیقی مارکسی بین الاقوامیت کا فقدان تھا۔ اس کے علاوہ مزدور جمہوریت ناپید تھی۔ اس مسخ شدہ کیفیت کے باعث داخلی اور خارجی طور پر بحرانوں کا جنم لینا ناگزیر تھا۔ منصوبہ بند معیشت پر بیوروکریسی کی جکڑ کی وجہ سے ترقی کی شرح لڑکھڑانے لگی تھی۔ مثلاً 1966ء سے 1968ء کے دوران زرعی اور صنعتی پیداوار میں 13 فیصد کمی ہوئی۔ چین کی معیشت بحران میں داخل ہو رہی تھی۔ معیارِ زندگی بڑھنے کی بجائے گرنا شروع ہو گیا تھا۔ اناج، پکانے کے تیل، کپڑے، صابن کی قلت کی وجہ سے ان کی راشن بندی چین کی معاشی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ چین کی ترقی کی شرح ترقی یافتہ ممالک تو درکنار اپنے قریبی ہمسایہ ممالک کوریا، تائیوان کی نسبت بھی کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ایک ملک میں سوشلزم کے قومی نظریئے کے تحت خارجی میدان میں بھی تمام پالیسیاں مارکسزم کی طبقاتی بنیادوں کی بجائے چین کی افسر شاہی اور ''چین کے قومی'' مفادات کے تحت استوار ہو رہی تھیں۔

ان غیر مارکسی نظریات کے تحت قومی مفادات میں تصادم ناگزیر تھا۔ ٹیڈ گرانٹ اور دوسرے مارکسیوں نے انقلاب سے کہیں پہلے نہ صرف چین کے انقلاب کے کردار کو واضح کر دیا تھا بلکہ اس کے انجام کا منظر پیش کرتے ہوئے انہوں نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ چین کی قیادت کی ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی اور مارکسی بین الاقوامیت سے انحراف ناگزیر طور پر چینی اور روسی افسر شاہیوں کے درمیان ''قومی'' تصادم کا باعث بنے گی۔

روسی افسر شاہی نے روس کے ملکی اور قومی مفادات کے تحت چین کے انقلاب کو اپنے زیر اثر رکھنے کے لیے جو طریقے اپنائے تھے ان کے تحت چین کی افسر شاہی اس ماتحتی کو لمبے عرصے تک قبول نہیں کر سکتی تھی۔ ابتدا میں چین کو زیر اثر کرنے اور امریکی سامراج کے ساتھ اس کے اپنے عالمی طاقت کے توازن میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے روسی افسر شاہی نے چینی انقلاب کے فوری بعد کے عرصے میں فوجی اور اقتصادی امداد دی تھی لیکن جب روسی افسر شاہی نے 50 کی دہائی کے دوران چینی افسر شاہی کے قومی مفادات کی پروا کیے بغیر اور ان کی ضروریات کو مدنظر

رکھے بغیر امریکی سامراج سے کچھ مزید سمجھوتے کیے تو سٹالنزم کے ان دو رجحانات میں پھوٹ پڑ گئی جس نے نہ صرف اس خطے میں بلکہ پورے عالم میں بائیں بازو کی تحریک پر نہایت ہی منفی اثرات مرتب کیے۔ اس پھوٹ کو ''نظریاتی'' بنیادیں فراہم کر کے چینی اور روسی افسر شاہی نے دنیا کے مختلف علاقوں میں کام کرنے والی کمیونسٹ پارٹیوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا شروع کر دیا۔

چینی افسر شاہی نے زیادہ ریڈیکل نعرے استعمال کیے اور سامراج دشمنی میں زیادہ واضح مؤقف اپنا کر دنیا بھر کی اسٹالنسٹ پارٹیوں میں زیادہ حمایت حاصل کرنا شروع کر دی۔ نوآبادیاتی ممالک کے عوام میں خصوصاً روسیوں کے خلاف چینیوں کا پراپیگنڈا اور حمایت زیادی تیزی سے بڑھی۔ لیکن سٹالنسٹ قوم پرستی پر مبنی روسی افسر شاہی کی خارجہ پالیسی جہاں مفاد پرستی پر مبنی تھی وہاں اس تنگ نظر پالیسی کے تحت چینی افسر شاہی کی روش بھی کم مفاد پرستی پر مبنی نہیں تھی۔ انہوں نے تیسری دنیا میں خصوصی طور پر، بہت ہی ظالم، رجعتی اور جابر آمروں اور حکمرانوں کی حمایت کی تھی۔ 50ء اور 60ء کی دہائیوں میں انہوں نے افغانستان، سری لنکا، پاکستان، یمن اور کئی دوسرے ممالک میں ان حکمرانوں کی حمایت کر کے ان ممالک میں انقلابات کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان میں ایک اہم مثال پاکستان کی ہے۔

روسی افسر شاہی کی طرح چینی سٹالنسٹ بھی ملکی اور قومی بنیادوں پر جاری خارجہ پالیسی کے تحت اس بین الاقوامی سفارت کاری کی کھائی میں گرتے چلے جا رہے تھے جو مختلف قسم کی حکمرانیوں کے درمیان رابطے اور ریاستی ڈھانچوں کو سامراجی خولوں میں ڈھالنے کا کام کرتی ہے۔ چینی افسر شاہی کی قومی پالیسی اس کو ناگزیر طور پر اس راستے پر لے جا رہی تھی۔ اقوام متحدہ کا ممبر بننے کی خواہش اور سٹالنزم اور سامراج کے درمیان مصالحت کے اس رجعتی ادارے کا حصہ بننے کی پالیسی کے تحت چینی افسر شاہی نے دنیا کے مختلف حکمرانوں کو ان کے طبقاتی جبر و استحصال اور سماجی کردار کو خاطر میں لائے بغیر ان کی اندھی حمایت کر دی تا کہ عالمی سفارتی کھیل میں ان کی حمایت حاصل کی جا سکے۔ ''تیسری دنیا'' کے مختلف حکمران اپنی معیشتوں اور حکمرانیوں کو قائم رکھنے کے لیے جہاں داخلی طور پر مختلف طبقات اور سماج کے متضاد حصوں کے درمیان توازن قائم کرتے رہے تھے اسی طرح یہ حکمران خارجی طور پر بھی متضاد اور متحارب طاقتوں کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے اپنے اقتدار کو استحکام دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دور میں سامراج کے خلاف خصوصاً تیسری

دنیا میں بہت بڑی انقلابی لہر اور سوچ ابھر رہی تھی۔ اس سے تیسری دنیا میں ان تحریکوں کو پاپولسٹ لیڈروں کے ذریعے انقلابی سوشلزم کے راستوں اور منازل سے ہٹا دیا گیا۔ ان پاپولسٹ لیڈروں کے ابھرنے کی وجہ سٹالنسٹ مرحلہ وار انقلاب کے نظریئے سے آگے بڑھ کر انقلاب، سوشلزم اور سامراج دشمنی کی نعرہ بازی تھی جبکہ ان کا کردار اور مارکسی پارٹی کا فقدان ان کی مقبولیت پر مبنی تحریکوں کو سرمایہ داری کے خاتمے تک نہیں لے جا رہی تھیں اور انقلابات زائل ہو رہے تھے۔

انڈونیشیا، پاکستان، ہندوستان سمیت بہت سے ممالک میں چینی اور روسی افسر شاہی کے اختلافات کے باعث تحریکوں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ویت نام میں چین اور ویت نام کی سٹالنسٹ پارٹیوں کے درمیان ''قومی'' اور ''سرحدی'' تنازعوں کے دوران چین نے لمبا عرصہ امریکی سامراج کے خلاف ویت نامی عوام کی جنگ آزادی میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔ دوسری جانب ویت نام کی کمیونسٹ پارٹی چونکہ روسی افسر شاہی کے زیر اثر تھی اس لیے اس کی حمایت چین کی کمیونسٹ پارٹی بھلا کیسے کر سکتی تھی۔ اس طرح الجزائر میں چینی افسر شاہی نے وہاں کی انقلابی تحریک کو زیادہ آہستہ چلانے کی ہدایت کی کیونکہ فرانسیسی حکومت کے ساتھ ان کا معاہدہ ہونے والا تھا۔

لیکن افسر شاہی کی ان تمام ریشہ دوانیوں کے باوجود جہاں داخلی طور پر ابتدا میں بے پناہ ترقی ہوئی وہاں خارجی طور پر اس انقلاب کے خصوصاً تیسری دنیا کی بائیں بازو کی تحریکوں پر بے پناہ اثرات مرتب ہوئے۔ 50ء، 60ء اور کسی حد تک 1970ء کی دہائیوں میں پوری تیسری دنیا میں انقلابی طوفان چلتا رہا اور بہت سے ممالک، جن میں ویت نام، کیوبا، کمبوچیا، لاؤس، برما، شام، شمالی کوریا، ایتھوپیا، یمن موزمبیق، انگولا اور دوسرے کئی ممالک شامل ہیں، میں ایسے انقلابات برپا ہوئے جن کے ذریعے سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ ہوا اور سامراج کو کاری ضربوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان انقلابات کا بکھرنا بنیادی طور پر سٹالنسٹ زوال پذیری یعنی ایک ملک میں سوشلزم کے نظریئے کی ناپائیداری، محنت کش طبقے کا ہراول کردار ادا نہ کرنا اور ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں انقلاب کی تاخیر کی وجہ سے ہے۔ چینی اور روسی افسر شاہی کے تضادات نے مشرقی یورپ کے ممالک پر بھی منفی اثرات مرتب کیے جن کے نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔

لیکن قومی سوشلزم کی اس سٹالنسٹ پالیسی کا گہرائی میں جائزہ لیا جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس پالیسی سے ہی ایک جانب چین اور دوسری جانب مشرقی یورپ کے ''سوشلسٹ'' ممالک

ایک سوشلسٹ فیڈریشن میں یکجا نہیں ہو سکے۔ لینن کے بت اور اس کی تصویریں شائع کرنے والے اس کے سوویت یونین کی تشکیل کے طریقہ کار کو فراموش کرتے رہے۔ لینن نے جب سوویت یونین کی بنیاد رکھی تھی تو اس میں 80 سے زیادہ فرقے، علاقے اور سماجی وقومی گروہ شامل تھے۔ لینن کا مقصد سوویت یونین کو کوئی ملک بنانا نہیں تھا بلکہ اس کی سوچ اور نظریات کے مطابق ایک دن پوری دنیا کا نام یو ایس ایس آر ہونا تھا۔ اگر چین سوویت یونین، مشرقی یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دیگر ''سوشلسٹ'' ممالک اس قسم کی ایک سوشلسٹ فیڈریشن کا حصہ بن جاتے تو نہ صرف سامراجی حکمرانی کے خاتمے کے امکانات بہت قریب آ جاتے بلکہ ان بے پناہ وسائل، صنعت اور تکنیک کے اشتراک سے منصوبہ بندی پر مبنی معیشت کے تحت کہیں زیادہ تیز ترقی ہونی تھی۔ ایسی صورت حال میں عالمی انقلاب کسی خواب کی بجائے ایک ٹھوس حقیقت بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہوتا۔ اس لائحہ عمل اور کیفیت کے جنم لینے میں سب سے بڑی رکاوٹ سٹالنزم اور ماؤازم کی قومی بنیادوں پر سوشلزم کی پالیسی تھی۔ دوسرے لفظوں میں سٹالنزم کی قوم پرستی کی یہ سوچ، نظریہ اور لائحہ عمل نہ صرف عالمی انقلاب کے راستے میں رکاوٹ بنے بلکہ ان نام نہاد سوشلسٹ ممالک میں منصوبہ بندی پر مبنی معیشتوں کی تباہی کا موجب بھی بنے۔ مارکسزم اور لینن ازم کی نعرہ بازی کرتے ہوئے یہ کامریڈ قومی تعصب کے زہر آلود نظریات کے ساتھ آپس میں گولے بارود کی زبان میں مذاکرات کرتے رہے۔

اس پس منظر میں چین میں داخلی اور خارجی بحران بڑھنا شروع ہو گیا۔ 1960ء کی دہائی میں چین کو باقی دنیا سے کاٹ کر سوشلزم قائم کرنے کا ماؤاسٹ نظریہ اسی کے دور میں ناکام ہو گیا اور ماؤ کو اپنی زندگی میں ہی 1969ء میں دوسری انتہا پر جانا پڑا۔ کئی اہم منصوبوں کے ٹھیکے، جن میں کچھ ڈیم اور دوسرے سول انجینئرنگ کے بھاری کام تھے، اس نے امریکی تعمیراتی اجارہ داری اور جان ڈائر اینڈ کمپنی کو دے دیئے۔

لیکن اس عرصے میں ان متضاد اور قومی گھٹن کی پالیسی کی وجہ سے سماج میں بڑھنے والی بے چینی نے چینی بیوروکریسی میں نئے تضادات اور اختلافات کی صورت میں بڑھنا شروع کر دیا۔ بدعنوانی بڑھنے لگی۔ ریاستی جبر کے اثرات اور تضادات سے افسر شاہی کے ڈھانچے میں دراڑیں واضح ہونی شروع ہو گئیں اور افسر شاہی میں ایک نئی خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں ایک دھڑے نے اس ڈھانچے کو بچانے کے لیے دوسرے دھڑے پر حملہ کر دیا۔ اس عمل کو نئے ثقافتی انقلاب

کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ثقافتی انقلاب

چین کا انقلاب جن بنیادوں پر ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں جو ڈھانچہ استوار ہوا اس میں فرد اور شخصیت کا تسلط مبالغے کی حد سے زیادہ تھا۔ ماؤ کی شخصیت کا جو نفسیاتی تسلط قائم کیا گیا تھا وہ پہلے تو اس قسم کی کسان تحریکوں میں ناگزیر ہوتا ہے جہاں اس طبقے کا شعور صنعتی محنت کش طبقے سے بہت مختلف اور پسماندہ ہوتا ہے۔ اپنی معاشی اور سماجی محرومی کے علاوہ ان کے کام کاج اور رہن سہن کے طریقہ کار میں ان کا قدرتی اور دوسرے ایسے عناصر پر انحصار اتنا زیادہ ہوتا ہے جو ان کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ توہمات اور دوسرے مابعد الطبیعیاتی تصورات کے نفسیاتی غلام ہوتے ہیں۔ وہ ماورائی طاقتوں اور نجات دہندوں کی آس میں ایک ذہنی محکومی اور روحانی محرومی کا شکار ہو کر دیوتاؤں کی پرستش اور غلامی سے اپنی زندگی میں خوشحالی کی امید لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ماؤ کی شخصیت کا طلسم بھی انہی بنیادوں پر ابھرا۔ لیکن لینن اسٹ طریقہ کار کے برعکس ماؤ کے اس طلسم اور شخصیت پرستی کے عمل کو شعوری طور پر سٹالنسٹ طریقہ کار کے تحت نہ صرف ابھارا گیا بلکہ سرکاری ذرائع ابلاغ نے اس پر ایک مسلسل مہم جاری کر دی۔ پوری ریاستی مشینری اس پر کاربند تھی۔ سرکاری ادب اور شاعری میں ماؤ کو ابتدا سے ہی ''مشرق کا سرخ سورج'' گردانا گیا اور اس کو دیومالائی دیوتا بنا کر پیش کیا گیا۔ چین کی قدیم اور رجعتی روایات کے مطابق اس کو شہنشاہ کا تصور دے دیا گیا۔

ماؤ کو دیگر لیڈروں کے برعکس اقتدار کی ابتدا میں ہی ایسی لاامتناعی اور غیر متنازع سماجی حیثیت ملی جس سے اس نے شاید اپنے آپ کو ایک کمیونسٹ دیوتا سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ 17 مئی 1966ء کو شروع ہونے والے ثقافتی انقلاب کے عوامل اور اس کے تیزی سے بھڑکنے کے عمل میں ماؤ کی شخصیت کا فیصلہ کن کردار بنتا ہے۔

1949ء کے انقلاب کے چند ماہ بعد ہی پرانی افسر شاہی جو ایک بالا دست اشرافیہ (Mandarins) پر مبنی تھی اس نے اب کمیونسٹوں کا بھیس بدل کر اس ریاستی افسر شاہی کا دوبارہ کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا جو وہ کئی نسلوں سے کرتی آ رہی تھی۔ اس سے پھیلنے والی بدعنوانی سے سماجی تناؤ اور تضادات بڑھ رہے تھے۔ اس بدعنوانی اور افسر شاہی کا جبر اتنا بڑھ گیا کہ اس کی شدت سے ماؤ اور اس کے قریبی حواری بھی گھبرا اٹھے۔ اس سے افسر شاہی کی بلند ترین

صفوں میں تضادات ابھرنے شروع ہو گئے۔ یہ ثقافتی انقلاب بیجنگ میں طاقت کی کشمکش سے شروع ہوا تھا۔ ماؤ کا مخالف دھڑا 1960ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں مضبوط ہو رہا تھا۔ 1965ء کی پارٹی کانگریس میں ماؤ کی ''سوچ اور افکار'' جواب تک قوم کے لیے مشعل راہ کے طور پر پیش کیے جا رہے تھے ان کی اہمیت اس کانگریس میں کم کر دی گئی تھی۔ یہ ماؤ کی قیادت کے لیے ایک براہ راست چیلنج تھا۔

مئی 1966ء میں ماؤ نے جوابی حملہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے معتدل افسران پر یہ حملہ کیا کیونکہ ان کے اندر اتنی انقلابی جرات اور جذبہ نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے وہ عوام سے دور ہو گئے تھے۔ اس کے بعد اس نے پارٹی قیادت میں اپنے اہم حریفوں کے خلاف اس مہم کو پھیلانا شروع کر دیا۔ اس نے سرمایہ دارانہ راستے پر گامزن ہونے والے اہم مصلحت پسندوں سمیت پارٹی کے جنرل سیکرٹری ڈینگ زیاؤ پنگ کی مذمت کھلے عام کرنی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ماؤ زے تنگ نے کروڑوں نوجوانوں کو یہ اپیل کی کہ وہ سرخ گارڈ کے دستے تشکیل دیں، حکومتی ہیڈ کوارٹروں اور اہم اداروں پر حملہ کر دیں اور ماؤ کے مخالفین کو نکال باہر کریں۔ اس کے بعد ایک طوفان برپا ہو گیا اور کئی مؤرخین نے اس ثقافتی انقلاب کو نیا سرخ طوفان بھی قرار دیا۔ یہ مہم 1966ء کے پورے موسم گرما میں بہت تیزی سے پھیلی۔ ان سرخ سپاہیوں نے بہت سے بدعنوان افسران کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ بدھ مت کے مندروں کو مسمار کر دیا۔ بہت سی جاگیردارانہ باقیات کے نشانات کو مٹانا شروع کر دیا اور بہت حد تک چین کی حکومت کو مفلوج کر دیا اور پورا ملک ایک قسم کی خانہ جنگی میں پھر داخل ہو گیا۔ بہت سے مقامات پر ان سرخ سپاہیوں کے مختلف دھڑوں کے درمیان آپس میں ہی جھڑپیں اور تصادم بھی سامنے آئے۔ ان جھڑپوں سے پیپلز لبریشن آرمی سے چھینی ہوئی بھاری توپیں، راکٹ اور ٹینک بھی استعمال ہو رہے تھے۔ جنوبی گوانگ ژی اور گوانگ ڈونگ کے صوبوں میں یہ سرخ سپاہی سب سے زیادہ متحرک تھے۔ یہاں ان نوجوانوں نے بہت سے سرکاری اہلکاروں کی نہ صرف تذلیل کی بلکہ ان کو قتل بھی کیا۔ ہر شہر میں ''ریڈیکل انقلابی کمیٹیوں'' کے ناموں سے تنظیمیں بنانی شروع کر دی گئیں جو جنونی حد تک ماؤ کی وفادار اور تابع تھیں۔ ان انقلابی کمیٹیوں نے مختلف شہروں اور علاقوں میں حکومت کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ جنون اتنا شدید تھا کہ ان نوجوانوں نے گوانگ ژی کے تجزیہ نگار لوژیوژیان (Luxiuyunan) کے مطابق اپنے شکار دشمن کو قتل کر کے ان کا گوشت نوچ کر کھایا تھا۔

سکول، یونیورسٹیاں اور فیکٹریاں بند ہونے سے معیشت جامد ہونا شروع ہو گئی۔ ماؤ کو آخر کار ان سرخ سپاہیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے سرکاری فوج استعمال کرنا پڑی تھی۔ ان سپاہیوں کے بڑے بڑے جتھوں کو دیہاتوں میں بھیجنا شروع کیا گیا جہاں وہ کسانوں سے سیکھ سکیں۔

ان سرخ سپاہیوں میں کمبوچیا کا ایک طالب علم اور مستقبل میں خمیر روگ (Khmer Rogue) کا لیڈر پول پاٹ بھی تھا جس نے اس ثقافتی انقلاب سے جو تجربات اور اسباق حاصل کیے وہ کئی سال بعد اپنے ملک میں کمبوچیا میں آزمائے اور اس انقلاب میں شہروں کے شہر خالی کروا کر آبادی کو دیہی علاقوں میں زبردستی بھیج دیا۔ کمبوچیا کا 1970ء کی دہائی میں جنم لینے والا انقلاب ماؤ کے اس ''ثقافتی انقلاب'' کی طرز اور طریقہ کار پر مبنی تھا۔ چین میں ماؤ کا یہ ''ثقافتی انقلاب'' ماؤ کی 1976ء میں وفات تک کسی نہ کسی شکل یا کیفیت میں جاری رہا۔

المیہ یہ ہے کہ اس 'ثقافتی انقلاب' کے برپا ہونے کی بڑی وجہ ایک موسیقی کا تھیٹر بنا۔ 1960ء میں بیجنگ میں ایک موسیقی کا رقص پر مبنی ڈرامہ (Opera) لکھا گیا۔ اس کھیل کا نام ''ہائے روئی (Hai Rui) کی دفتر سے برطرفی'' تھا۔ اس کی کہانی وسط سولہویں صدی کی مِنگ بادشاہت کے عہد میں ایک سرکاری ملازم ہائے روئی کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں ہائے روئی کو ایک دیانتدار مگر خوددار سرکاری ملازم دکھایا گیا۔ جو عیاش اور بگڑے ہوئے شہنشاہ عالی کی بیہودہ پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتا تھا۔ اس کی پاداش میں اس کی تذلیل کی گئی اور اس کو پابند سلاسل کیا گیا۔ بیجنگ کے محلات میں چلنے والی کشمکش اور ماؤ کی کچھ پالیسیوں کی اس کھیل میں عکاسی ہوتی تھی۔ اس طرح جو طوفان اٹھا اس کو اجاگر کرنے اور بھڑکانے میں اس تھیٹر کا اہم کردار تھا۔

1950ء کی دہائی کے اواخر میں ماؤ کی ''آگے کی جانب عظیم پھلانگ'' (Great Leap Forward) کی کوتاہیاں اور خامیاں بہت واضح ہو کر 60ء کی دہائی میں سامنے آ رہی تھیں۔ 1958ء سے 1961ء کے دورانیے میں اپنائی گئی تیز صنعت کاری جو زیادہ تر گھریلو دستکاری کی صنعت کو فروغ دینے پر مبنی تھی کے کریش پروگرام کو جس بیوروکریٹک اور پسماندہ انداز میں کیا گیا وہ بڑی تباہ کاریوں کا باعث بنا۔ اس مہم جوئی سے معاشی بحران ناگزیر ہو گیا اور اس سے پورے چین میں شدید قسم کو قحط پڑ گیا جس کے باعث لاکھوں افراد بھوک اور شدید قسم کے قحط کا شکار ہو کر مر گئے۔ مختلف اعداد و شمار کے مطابق 20 سے 43 لاکھ کے درمیان افراد مارے گئے۔ 1960ء تک چین

کی آبادی اس وسیع پیمانے پر موت کی وجہ سے سکڑ کر کم ہوگئی تھی۔

1956ء میں ماؤ نے یہ نعرہ دیا کہ ''سو پھولوں کو کھلنے دو، سوچ کے سو سکولوں کو ابھرنے دو۔'' بہت سے دانشوروں نے اس کی اس پکار کے جواب میں مختلف سوچوں کو اجاگر کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہی دانشوروں میں شنگھائی کا مِنگ تاریخ کا ماہر ووہان (Wu han) بھی تھا جس نے بیجنگ کے تھیٹر گروپ کے لیے ''ہائے روئی کی دفتر سے برطرفی'' لکھا تھا۔ یہ کھیل بیجنگ میں پہلی دفعہ 1961ء میں پیش کیا گیا۔ لیکن جب ''گریٹ لیپ فارورڈ'' کے بھیانک نتائج سامنے آئے تو ماؤ کی ساکھ کو بہت بڑا دھچکا لگا۔ ماؤ کی طاقت اور کنٹرول کو آہستہ آہستہ ڈینگ زیاؤ پنگ (جو اس وقت پارٹی کا جنرل سیکرٹری تھا) اور لیو شاؤ چی (Liu shaogi)، جو ملک کا صدر تھا، نے پرے کرنا شروع کر دیا۔ یہ دونوں لیڈر اپنے آپ کو زیادہ ''عملی پالیسی ساز'' سمجھتے تھے۔ 1960ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں ہی ماؤ کے قریبی حواریوں کو ماؤ کی اس اتھارٹی اور ساکھ کے سرکنے کا شدید خوف پیدا ہونا شروع ہوا۔ انہوں نے ماؤ کے خلاف افسر شاہی کے دھڑے کو چت کرنے کے لیے سب سے پہلے ووہان کے اس کھیل کو ہی نشانہ بنایا۔ انہوں نے اس کو سرمایہ دارانہ رجحانات کے پھیلاؤ کا ذریعہ قرار دیا اور پارٹی دشمن گروہ کی تخلیق قرار دیا۔ یہ دراصل ان پارٹی لیڈروں کی جانب اشارہ تھا جو ماؤ کو پارٹی کی قیادت سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

1965ء میں ماؤ کی بیوی ژیانگ کوئنگ (Jiang Qing) اور اس کے قریبی ساتھی کانگ شینگ (Kang Sheng) نے شنگھائی کے ایک اور دانشور یاؤ وینیوان (Yao Wenyuan) کو ووہان کے اس تھیٹر کھیل کو مسترد کرنے اور اخباری تجزیئے میں اس کی تضحیک کرنے کے لیے استعمال کیا۔ یہی یاؤ بعد میں ابھرنے والے ''چار کے ٹولے'' میں سے ایک تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پارٹی کے اعلیٰ اداروں، کونسلوں اور ریاست کے اہم ڈھانچوں نے ہائے روئی کے بارے میں وہ فیصلہ دینا شروع کر دیا جو ماؤ کے حق میں جاتا تھا۔ لیکن جب اس مہم کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے تو ماؤ نے ریاستی اور پارٹی کے تمام اداروں اور ضابطوں سے نکل کر نوجوانوں کی باغیانہ حسیات کو ابھار کر استعمال کیا۔

16 مئی 1966ء کو پولٹ بیورو سے ایک سرکاری سرکلر جاری کیا گیا جس میں ماؤ کے خلاف پارٹی ہائی کمان میں ابھرنے والے افراد کی مذمت کی گئی۔ پولٹ بیورو کے اس سرکلر میں یہ اعلان کیا گیا کہ ''ہماری حکومت، ہماری مسلح افواج اور مختلف ثقافتی گروپوں کے نمائندے دراصل

ردانقلابی ترمیم پرستوں کا ایک گروہ ہیں۔ جب بھی ان کو درست موقع ملے گا وہ طاقت پر مکمل قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور پرولتاریہ کی آمریت کو سرمایہ دارانہ طبقے کی آمریت میں تبدیل کردیں گے۔''

یہ بات درست ہے کہ ڈینگ ذیاؤ پنگ اور اس کے حواری جو اس وقت ماؤ کا تختہ الٹنے کی سازش کررہے تھے سرمایہ دارانہ راستے پر چلنا چاہتے تھے۔ بعد کے واقعات نے اس کو ثابت کیا ہے۔ لیکن پھر افسر شاہی کے ماڈل پر استوار ریاستی ڈھانچوں میں سماجی بحران کی شدت بڑھ جانے سے یہ ٹوٹ پھوٹ اور خانہ جنگی ناگزیر ہوجاتی ہے۔ اس پولٹ بیورو کے سرکلر کے بعد وہ سٹیج سج گیا جس پر دیوہیکل گروہی لڑائیاں، سازشیں اور نوجوانوں کا ایک بھونچال آنا تھا۔ اس تاریخ کے بہت بڑے ڈرامے میں ہر واقعہ اس دور کے دوسرے واقعات کو ماند کررہا تھا۔ صدر لیوشاؤچی کی پہلے تذلیل اور پھر موت، وزیر دفاع لن بیاؤ (Lin Biao) کی ماؤ کو قتل کرنے کی سازش اور پھر بھاگتے ہوئے اس کے جہاز کا حادثہ، جس میں اس کی موت واقع ہوئی۔ یہ واقعات جدید تاریخ میں افسر شاہی کے دھڑوں کی سب سے بڑی خانہ جنگی کی غمازی کرتے ہیں۔ 16 مئی کے سرکلر کے بعد بیجنگ کے کچھ اہم سکولوں میں پہلے ردعمل کے بعد اس ثقافتی انقلاب کی تحریک نے جنگل کی آگ کی طرح پھیلنا شروع کردیا۔ اس کی بڑی وجہ ان کے قومی ہیرو ماؤ کو لاحق خطرہ تھا جس کے خلاف طلبہ نے ماؤ کے دفاع میں اس مہم کو متحرک کرنا شروع کردیا تھا۔

انہوں نے اساتذہ اور والدین کو رجعتی اور پسماندہ ہونے کی نعرہ بازی کر کے مسترد کرنا شروع کردیا۔ سرخ سپاہیوں کے ریلے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کیمپوں سے بڑی بڑی گھنٹیاں بجاتے ہوئے نکلے اور بازوؤں پر سرخ رومال لپیٹتے ہوئے ہر طرف پھیل گئے۔

ماؤ نے ان کے اس مقصد اور عمل کو پوری طرح آشیر باد دی۔ اگست میں اس نے سرخ سپاہیوں کی تیانامین چوک (Tiananmen Square) پر ریلی کی صدارت کی۔ جب وہ ''آسمانی امن'' کے دروازے پر PLA کی وردی پہنے نمودار ہوئے تو پورے اجتماع میں ایک برق لہر دوڑ گئی۔ نوجوان خون شریانوں میں تیزی سے دوڑ رہا تھا اور سرخ سپاہیوں کی ایک طوفانی تحریک کا آغاز ہورہا تھا۔

نوجوانوں نے ماؤ کے مخالفین کے گھروں میں گھس کر مار دھاڑ کا بازار گرم کرنا شروع کردیا۔ ماؤ کے یہ سرخ جتھے ''چار پرانی برائیوں'' کو جڑ سے اکھاڑنے کے درپے تھے۔ یہ تھیں ''پرانی

ثقافت، پرانے ریت و رواج، پرانی عادات اور پرانی سوچیں۔'' یہی چار برائیاں 'ثقافتی انقلاب' کی بنیاد بنی تھیں۔اس دوران بہت سے تنقیدی سیشن ہوتے تھے جن میں اپنے والدین اور اساتذہ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا۔اس عمل میں جس فرد پر ردانقلاب کا الزام لگایا جاتا تھا اس کو سٹیج پر معذرت خواہانہ انداز میں جھک کر بیٹھنا پڑتا تھا اور اس کی جن غلط کاریوں پر تنقید ہوتی تھی ان سے سیاسی نظریات اور سوچوں سے لے کر یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ وہ کس برانڈ کے سگریٹ پیتا ہے۔ بیشتر مواقع پر ان ملزمان کی اولاد بھی تنقید کے اس کورس میں شامل ہوتی تھی۔ یہ واقعات کسی حد تک اس جنون کی عکاسی کرتے ہیں جو اس ثقافتی انقلاب نے ابھارا تھا۔

اس مہم کے دوران ڈینگ کا بیٹا پوفینگ (Pufing) بھی ایک واردات میں اپاہج ہو گیا۔ بعد کے دس سالوں میں ڈینگ کو دو مرتبہ پارٹی اور اقتدار سے معزول ہونا پڑا۔ 1969ء تک اس طوفان کی کرختگی میں کسی حد تک کمی آ چکی تھی۔سرخ سپاہیوں کو ریلوں اور بسوں پر مفت سفر کی اجازت تھی اور دیہی علاقوں میں بھی اس ثقافتی انقلاب کا پرچار بڑھ گیا تھا۔ان کو پورے ملک میں گھومنے اور انقلاب پھیلانے کی کھلی اجازت تھی۔ان سرخ سپاہیوں نے بہت سے حکومتی اداروں پر بھی قبضہ کر لیا جس میں وزارت خارجہ بھی تھی۔ انہوں نے اس وزارت کو سامراج اور سوویت ترمیم پرستی کے خلاف بھرپور پرچار کے لیے استعمال بھی کیا تھا۔

انہوں نے دکانوں، سڑکوں اور گلیوں کے نام بدلنا شروع کر دیئے۔ ہر اہم مقام پر چیئرمین ماؤ کے حوالوں کو منظر عام پر رکھنے اور چھوٹی سرخ کتاب کی ہر جگہ نمائش کرنے کے احکامات صادر کیے۔شہروں کی ٹریفک اس وقت جمود کا شکار ہونا شروع ہو گئی جب سرخ سپاہیوں نے اس قانون کو نافذ العمل کرانا شروع کر دیا کہ سرخ بتی کا مطلب ''جانا'' اور سبز بتی کا مطلب ''رکنا'' ہوگا۔

لیکن ثقافتی انقلاب کے سرخ طوفان کو قابو میں کرنے کے لیے ماؤ نے جب PLA کو استعمال کرنے کی کوشش کی تو اس کے لیے وزیر دفاع لن بیاؤ (Lin Biao) کی خدمات درکار تھیں۔اس آپریشن کے بعد جس میں سرکاری فوج نے نظم و نسق کو بحال کیا تو لن بیاؤ کے ماتھے پر ماؤ کے جانشین کا راج تلک لگا دیا گیا۔لیکن جب ماؤ کو اپنے اس وفادار میں بغاوت کی بو آنے لگی تو پھر مارشل لن بیاؤ اس کا نشانہ بنا۔

1971ء میں لن اور اس کے قریبی حواریوں کے گروہ نے ماؤ کی اس ریل گاڑی کو بم سے اڑانے کی کوشش کی تھی جو کچھ دیر پہلے شنگھائی ریلوے سٹیشن سے نکلی تھی لیکن جب یہ سازش اور

بغاوت ناکام ہوگئی تو مارشل لن بیاؤ نے اپنے حواریوں کو اکٹھا کر کے جنوب میں جا کر متحارب حکومت بنانے کی کوشش کی۔ اس کو ماسکو کی حمایت حاصل تھی اور وہ دو اطراف سے شمال پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ المیہ یہ ہے کہ اس وقت لن بیاؤ کی بیٹی اپنی منگنی کا جشن شمال میں سمندر کے کنارے ایک تفریحی مقام بیئی ڈاہی (Beidaihe) پر منا رہی تھی۔ جب اس کو اپنے والدین کی اس سازش کا علم ہوا تو اس نے اس کے خلاف جاسوسی کر کے اس سازش کو بے نقاب کر دیا۔ اس بھید کے کھل جانے سے لن بیاؤ کے لئے چین میں رہنا مشکل ہو گیا اور وہ ایک ہوائی جہاز کے ذریعے سوویت یونین کے لیے روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ اڑان سوویت یونین پہنچنے کی بجائے منگولیا میں ہی حادثے کا شکار ہوگئی اور لن بیاؤ اس فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔

ان واقعات کے پس منظر میں کمیونسٹ پارٹی کے چار اعلیٰ اہلکاروں پر مشتمل ''چار کا ٹولہ'' (Gang of Four) اقتدار پر پوری طرح قابض ہونا شروع ہو گیا۔ اس ٹولے کی سربراہ ماؤ کی بیوی تھی جبکہ دیگر تین میں ژینگ چن چیاؤ (Zhang Chunqiao)، یاؤ ون یوان (Yao Wenyuan) اور وانگ ہانگ وین (Wang Hongwen) شامل تھے۔

ماؤ کی نئی بیگم ژیانگ کوئینگ نے ماضی کی کسی شاہی ملکہ کا روپ دھار لیا۔ اس نے اپنے اصلی اور تصوراتی دشمنوں کے خلاف انتقامی کاروائیاں اور لڑائیاں تیز کر دیں تھیں۔ اس نے اپنا انقلابی مرکز شنگھائی کو ہی بنایا۔ یہاں وہ 1930ء کی دہائی میں ملکہ حسن چنی گئی تھی اور فلموں کی مشہور اداکارہ رہ چکی تھی۔ چار کے اس ٹولے نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر کے اس پر براجمان حکمرانوں (جن میں وزیراعظم چواین لائی بھی تھا) کو اپنے زیادہ سے زیادہ قابو میں کرنا شروع کر دیا۔ ڈینگ اور اس کے حواری بیوروکریٹک دھڑے کو شکست ہو چکی تھی اور ژیانگ کوئینگ کی سربراہی میں دوسرا دھڑا اپنا تسلط قائم رکھے ہوئے تھا۔ لیکن 1976ء میں چواین لائی کی وفات پر تیانامین چوک پر اس تسلط کے خلاف طلبا کا ایک بڑا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ مگر اس کو بھی بے دردی سے کچل دیا گیا۔ لیکن چند ماہ بعد ماؤ کی وفات پر پھر پانسہ پلٹ گیا اور 'چار کے ٹولے' کو گرفتار کر لیا گیا اور ثقافتی انقلاب اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس ثقافتی انقلاب میں 34,776 افراد کو ان کے جرائم یا انتقام میں قتل کیا گیا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اس خانہ جنگی کے دوران دس لاکھ سے زائد افراد جاں بحق ہوئے۔ اس ثقافتی انقلاب میں تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ سرخ سپاہیوں نے حصہ لیا تھا۔

اگر ہم اس ثقافتی انقلاب کا تجزیہ کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ ابتدا میں چینی سٹالنسٹوں کو ان کے روسی رفقا سے زیادہ استحکام حاصل تھا۔ بیوروکریٹک منصوبہ بندی ابتدا میں اہم نتائج حاصل کرسکتی ہے۔ یہ فریضہ زیادہ تر بھاری صنعت کی تعمیر پر مبنی ہوتا ہے جو نسبتاً ایک سیدھا سادہ فریضہ ہے۔ لیکن جونہی معیشت زیادہ ایڈوانس ہونے سے پیچیدہ ہو جاتی ہے تو افسر شاہی کے تحت منصوبہ بندی کی جکڑ کے ساتھ اس معیشت کا تضاد اور تصادم بننا شروع ہو جاتا ہے۔ اس بیوروکریٹک سوشلزم میں ہیرا پھیری، زیاں، سست روی، نا قابلیت اور بدعنوانی منصوبہ بندی کی فوقیت اور صلاحیت و اہمیت کی نفی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس سے منصوبہ بندی پر مبنی (سوشلسٹ) معیشت کی تمام حاصلات کے مکمل خاتمے اور تباہی کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ 1966ء سے 1976ء کے دورانیے میں ماؤ نے ریاستی افسران کی لوٹ مار اور لالچ کی انتہا کو ایک دہشت اور جبر کی مہم کے ذریعے حدود میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس عمل میں اس نے عوام اور نوجوانوں کا سہارا لے کر بدعنوان بیوروکریسی کو کاری ضربیں لگائی تھیں۔ لیکن اس ثقافتی انقلاب کی تمام تر نعرہ بازی کے باوجود طاقت مضبوطی سے ماؤاسٹ افسر شاہی کے ہاتھوں میں ہی رہی تھی۔

کسی بھی قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو بدعنوانی اور افسر شاہی کی تشکیل کی برائیوں سے بچانے کے لیے واحد طریقہ کار صنعت، سماج اور ریاست کی تمام سطحوں پر محنت کش طبقے کا جمہوری کنٹرول، شراکت اور انتظام ہوتا ہے۔ کسی بھی مزدور ریاست کو صحت مند رکھنے اور سوشلسٹ انقلاب کو آگے بڑھانے کے لیے آزادانہ ٹریڈ یونینوں کا وجود، حقیقی طور پر مالیاتی سرمائے کی آمریت سے آزاد صحافت، جس کی ملکیت ریاست کے پاس ہو اور کنٹرول محنت کش طبقے کے پاس ہو، تمام سطحوں پر تنقید کی آزادی ایسی بنیادی ضروریات ہیں جن کو پہلے دن سے رائج کرنا لازم ہے۔

ماؤ کی 'مینڈرینوں' پر جبر اور دہشت سے قابو پانے کی کوشش نہ تو مسئلے کو حل کرسکی اور نہ ہی کر سکتی تھی لیکن اس سے یہ ضرور ہوا کہ کئی سالوں کے لیے پیداوار میں خلل پڑا اور سماج میں انتشار پیدا ہوا۔ نام نہاد سرخ سپاہیوں کی غنڈہ گردی کی کاروائیاں جن میں انہوں نے دانشوروں کی مار پیٹ کی اور فن کے نادر نمونے تباہ کر دیئے، تبت کی عبادت گاہوں کو جلا دیا اور شیکسپیئر اور بیتھوون کو 'رجعتی سرمایہ دارانہ گماشتے' گردان کر ان کی مذمت کی کسی بلند انقلابی ثقافت کی غمازی نہیں کرتیں۔ اس

کے بدلے انہوں نے ماؤ کی شخصیت کو ایک دیوتا کی مانند پورے سماج پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔

ماؤ کے اس گروہ کی یہ انتہا پسندانہ مہم جوئی ایک مخصوص نکتے پر آ کر پوری افسر شاہی کے لیے نا قابل برداشت ہوگئی۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ ریاستی طاقت اور جاہ وجلال کے عروج پر ماؤ ذہنی توازن کھو چکا تھا۔ کسی بھی آمرانہ حکمرانی میں ایسا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان امکانات کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ ماؤ کو چینی افسر شاہی نے ہی قتل کروایا۔ یہی کچھ شاید روس میں سٹالن کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

ڈینگ ژیاؤ پنگ کا ابھرنا در حقیقت افسر شاہی کا اس ثقافتی انقلاب کے خلاف ایک رد عمل تھا۔ ''سرمایہ دارانہ راستے کا یہ داعی'' ثقافتی انقلاب کے طوفان اور ہلچل کو ختم اور دوبارہ سماج کو عام ڈگر پر استوار کر کے افسر شاہی کی مراعات اور جیبیں بھرنے کے لیے سازگار حالات بنانا چاہتا تھا۔ اس کا نعرہ تھا کہ ''امیر ہونا عظیم ہوتا ہے۔''

1981ء کی چین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں پارٹی کے یوم تاسیس پر جو ثقافتی انقلاب کے بارے میں قرارداد پاس کی گئی وہ یہ تھی:

''ثقافتی انقلاب جو مئی 1966ء سے اکتوبر 1976ء تک جاری رہا وہ پارٹی کے لیے سب سے سخت نقصان اور بھیانک پسپائی کا باعث بنا۔ اس کے یہ تباہ کن اثرات نہ صرف پارٹی بلکہ پیپلز ریپبلک کے جنم کے بعد عوام اور ریاست کے لیے سب سے زیادہ مضر تھے۔''

ڈینگ اور چینی افسر شاہی نے مغربی سامراج کی ترغیب کے باوجود نہ تو ماؤ کی شخصیت کے تسلط کو پوری طرح ختم کیا اور نہ ہی ثقافتی انقلاب پر کوئی تفصیلی تجزیہ یا اس کا گہرائی میں مطالعہ کیا۔ تحقیق سے یہ گریز ثقافتی انقلاب کی کسی نئی شکل اور عوامی طوفان کے ابھرنے کے خوف پر مبنی ہے۔

باب 9

سرمایہ دارانہ ردِ انقلاب

ماؤ کی وفات کے بعد ''سرمایہ داری کی راہ پر چلنے والا'' چینی بیوروکریسی کا یہ دھڑا اجارحیت پر اتر آیا اور اس نے منڈی کی معیشت کی ''کنٹرولڈ بحالی'' کا مسئلہ اٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈینگ ژیاؤ پنگ اور دیگر لوگوں کی یہ بات ایک لحاظ سے اہم تھی۔ چین کو عالمی معیشت سے الگ رکھنا ناممکن تھا۔ اس بندش کی وجہ سے چین میں پیداوار اور آلاتِ پیداوار کی جدت اور ترقی مسخ ہوگئی۔ مزدور جمہوریت نہ ہونے کی صورت میں عالمی منڈی بدانتظامی اور کج روی پر ایک قدرے ڈھیلے کنٹرول کا کام سرانجام دے سکتی ہے اور جدید ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔

1970ء کی دہائی کے اواخر میں چین کے اندر جو حالات تھے ان میں ایک طرح کی نئی معاشی پالیسی (New Economic Policy) کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا تھا حتیٰ کہ اگر ایک حقیقی مارکسی پارٹی بھی اقتدار میں ہوتی جیسا کہ بالشویکوں نے 1920ء کے عشرے کے اوائل میں کیا تھا۔ جب تک معیشت کی اہم بنیادیں ریاستی کنٹرول میں ہوں تو منصوبہ بندی سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے ان طریقوں کو ایک الگ تھلگ تنہا مزدور ریاست کے اندر معیشت کو ترقی دینے کیلئے ایک محرک کے طور پر ایک حد اور ایک وقت تک استعمال کیا جاسکتا ہے۔

لینن اسی طرح چیزوں پر غور کر رہا تھا جب اس نے مغربی سرمایہ داروں کو سائبیریا کے ضمن میں رعائتیں دینے کی پیش کش کی تھی جہاں بہت زیادہ خام مال موجود تھا لیکن معیشت غیر ترقی یافتہ تھی۔ کمزور نوخیز مزدور ریاست کے پاس سائبیریا کو ترقی دینے کے وسائل موجود نہیں تھے۔ یوں ان حالات میں لینن اصرار کر رہا تھا کہ پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کیلئے درکار سرمایہ کاری اور ٹیکنالوجی کے حصول کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ غیر ملکی سرمائے کو رعائتیں دی جائیں۔ اس کے پیچھے یہ خیال کارفرما تھا کہ وہ سرمایہ داروں کو منافعوں کی ضمانت فراہم کر کے اس علاقے کو ترقی دیں گے، نئے ذرائع پیداوار، تکنیک اور اس طرح کی دوسری چیزیں حاصل کریں گے اور اس سے انقلاب کو فائدہ پہنچے گا۔

1918ء میں اپنی کتاب ''بایاں بازو طفلانہ پن اور پیٹی بورژوا ذہنیت'' میں لینن نشاندہی کرتا ہے کہ ''ہمارے یعنی پرولتاریہ کی پارٹی کے پاس ٹرسٹوں کی طرز پر بڑے پیمانے کی

پیداوار منظم کرنے' جیسا کہ ٹرسٹوں کو منظم کیا جاتا ہے' کی اہلیت حاصل کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے کہ ہم اسے اول درجے کے سرمایہ دارانہ ماہرین سے حاصل کریں۔'' اگلے سال 4 فروری کو اس نے عوامی کمیساروں کی کونسل کے سامنے ایک قرارداد پیش کی جس میں اس نے کہا کہ ''عوامی کمیساروں کی کونسل ملکی پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کیلئے عمومی طور پر غیر ملکی سرمائے کو رعایت دینا اصولی طور پر درست خیال کرتی ہے۔'' بلاشبہ فرق یہ تھا کہ 19-1918ء میں سوویت یونین کا کردار شک وشبہ سے بالاتر تھا۔ یہ ایک صحت مند مزدور ریاست تھی-- یا کم از کم نسبتاً ایک صحت مند مزدور ریاست تھی-- جہاں اس طرح کی رعایتیں مزدور ریاست کو تقویت دینے نہ کہ کمزور کرنے کیلئے استعمال کی جاسکتی تھیں۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بالشویکوں کو اس طرح کے سمجھوتے عالمی اور خصوصاً یورپی انقلاب میں تاخیر کی وجہ سے کرنا پڑے تھے۔ یہ سمجھوتے اس حد تک قابلِ قبول تھے جب تک ریاستی طاقت مزدور طبقے کے ہاتھوں میں تھی اور معیشت کے اعلیٰ ترین ادارے مکمل ریاستی قبضے میں تھے۔ تاہم مسئلہ یہ تھا کہ 1921ء میں غیر ملکی سرمایہ دار روس کے ساتھ معاشی سمجھوتے کرنے کے برعکس اس کو تہس نہس کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن لینن کی یہ پالیسی انقلاب کے پھیلاؤ اور ترقی یافتہ ممالک خصوصاً جرمنی کے انقلاب سے منسوب تھی۔ لیکن لینن تمام تجارت اور ریاستی اجارہ داری اور معیشت کے حاوی اور بھاری شعبوں اور صنعتوں کو مزدور ریاست کے مکمل کنٹرول میں قائم رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھا۔ چینی بیوروکریسی کا مسئلہ کچھ مختلف تھا۔ اس مراعات یافتہ پرت کے ساتھ وہ (سامراجی) سمجھوتے کرنے پر آمادہ تھے۔ حتیٰ کہ کٹر رجعتی نکسن کو بھی چینی بیوروکریسی کے ساتھ سمجھوتے کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

ماؤ کی موت کے بعد بیوروکریسی کے اندر ملک کو بیرونی سرمایہ کاری کیلئے کھولنے کا خیال تقویت پکڑتا گیا اور اس خیال کا اظہار ڈینگ ژیاؤ پنگ کی شخصیت کے ذریعے ہو رہا تھا۔ ''ایک ملک میں سوشلزم'' کی پالیسی کی ناکامی اس امر سے ثابت ہو رہی تھی کہ بیوروکریسی کا زیادہ تر حصہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ علیحدگی کی پالیسی ناکامی سے دوچار ہو چکی ہے یعنی چین الگ تھلگ، تنہا رہ کر ترقی نہیں کر سکتا۔

ڈینگ پارٹی کا جنرل سیکرٹری رہ چکا تھا لیکن ثقافتی انقلاب کے دوران اسے قیادت سے ہٹا دیا گیا تھا۔ لیکن جنوری 1974ء میں وہ ایک بار پھر پولٹ بیورو کا رکن بن گیا۔ جب دوبارہ اس

سے تمام عہدے چھینے گئے اس وقت ڈینگ نہ صرف وزیر اعظم بلکہ پارٹی کا نائب صدر اور سپریم ملٹری سٹاف کا سربراہ بھی رہ چکا تھا۔ ان تمام انتہائی اعلیٰ عہدوں کے باوجود اسے ایک ''عفریت'' اور ایک ردِ انقلابی سازشی لیڈر قرار دیا جا رہا تھا جو ''سرمایہ دارانہ استواری کی پالیسی'' پر کاربند تھا۔ تاہم اہم بات یہ تھی کہ وہ اپنا پارٹی کارڈ اپنے پاس رکھنے میں کامیاب رہا۔ عام طور پر تو یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی ''عظیم رہنما'' کا منظورِ نظر نہیں رہتا تھا اسے پارٹی سے نکال دیا جاتا تھا یا پھر اس کا مقدر اس سے بھی بدتر ہوتا تھا۔ ڈینگ کا انجام یہ نہ ہوا کیونکہ اسے بیوروکریسی کے اندر بڑے پیمانے پر حمایت حاصل تھی۔ ماضی کی بصیرت سے ہم ایک اندازہ لگانے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں، وہ یہ کہ بیوروکریسی کی اکثریت، کم از کم بالائی سطحوں پر، ڈینگ کی حامی تھی لیکن ماؤ کو جو مقام حاصل تھا اس کے باعث وہ حرکت میں نہیں آ سکتی تھی۔

ماؤ کی موت کے بعد بیوروکریسی کے اندر ڈینگ کی اس وسیع حمایت کی تصدیق ہوگئی۔ ''چار کا ٹولہ'' جس میں ماؤ کی بیوہ بھی شامل تھی، اس خیال کو آگے بڑھا رہا تھا کہ ''ثقافتی انقلاب'' جاری رکھا جائے۔ تاہم بیوروکریسی کے غالب دھڑے کے خیالات بالکل واضح تھے۔ 6 اکتوبر 1976ء کو ''چار کے ٹولے'' کو گرفتار کر لیا گیا اور پھر انہیں کبھی بھی اقتدار نصیب نہ ہوا اور 1978ء میں ڈینگ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔

موجودہ صورتحال کی جڑیں اسی عہد میں پیوست ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے اندر بیرونی سرمایہ کاری کیلئے معیشت کو کھولنے کی بحث کا آغاز 78-1977ء میں ہوا۔ ڈینگ کا دھڑا جو کچھ تجویز کر رہا تھا اسے اس نے ''منڈی کا سوشلزم'' کا نام دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ماؤ کے عہد میں معیشت ایک دلدل میں دھنس گئی تھی۔ یہ بات سچ نہیں تھی کیونکہ کئی ایک ہچکولوں کے باوجود 25 سال تک معیشت اچھی خاصی تیزی کے ساتھ ترقی کرتی رہی۔

لیکن جوں جوں معیشت میں جدت آتی گئی بیوروکریٹک کمان سسٹم کی حدود و قیود نمایاں ہونے لگیں۔ سوویت یونین کی طرح معیشت کے مختلف شعبوں میں باہمی تعاون کا فقدان تھا جس کے نتیجے میں مختلف شعبوں میں سرمایہ کاری عدم توازن کا شکار ہوگئی اور کچھ اشیاء کی پیداوار ضرورت سے زائد اور کچھ کی ضرورت سے کم ہونے لگی۔ گھپلے، بدعنوانی، وسائل کا ضیاع اور بدنظمی بڑے پیمانے پر پھیل گئی۔ صنعت کی پیداواری صلاحیت گر رہی تھی۔ افراطِ زر کے رجحانات، اشیائے صرف کی قلت اور سماجی اضطراب کی بہتات تھی۔

اس سے مزدوروں اور کسانوں کی ضروریات پر اثرات مرتب ہونے لگے اور وہ اضطراب کا شکار ہو گئے۔ ان تمام چیزوں کا حل یہ تھا کہ معیشت پر مزدوروں کا جمہوری کنٹرول اور انتظام وانصرام قائم کیا جائے لیکن ایسا ہونے کیلئے ضروری تھا کہ ایک سیاسی انقلاب برپا کیا جائے۔ بیوروکریسی کو اقتدار سے الگ کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن بیوروکریسی نے اقتدار اتنی آسانی کے ساتھ ترک نہیں کر دینا تھا۔ ڈینگ اور بیوروکریسی کے جس دھڑے کی وہ نمائندگی کر رہا تھا، کا خیال یہ تھا کہ پیداواری قوتوں کی تعمیر کا کام جاری رکھنے اور پیداوار میں اضافے کیلئے منڈی کی قوتِ محرکہ کی ضرورت ہے۔

اگرچہ مطلق پیداوار کے اعتبار سے چین اور روس برطانیہ جیسے ملکوں سے آگے نکل گئے تھے لیکن محنت کی پیداوار کے حوالے سے وہ دونوں سرمایہ دارانہ ملکوں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ روس میں تو بحران پہلے ہی نمایاں ہو چکا تھا جس سے شرحِ نمو میں اچھی خاصی سست روی پیدا ہو چکی تھی۔ چین کے اندر ڈینگ کے دھڑے کو احساس تھا کہ چینی معیشت میں جدید ترین تکنیک متعارف کروانے کی ضرورت ہے۔ اس کا واحد طریقہ یہ تھا کہ چین کو غیر ملکی سرمایہ کاری کیلئے کھول دیا جائے اور عالمی منڈی میں حصہ داری اختیار کی جائے۔

اگر اقتدار مزدوروں کے پاس ہوتا تو وہ سرمایہ دارانہ بحالی کے رجحانات پر روک لگا سکتے تھے۔ لیکن ریاستی طاقت بیوروکریسی کے ہاتھوں میں تھی اور ان حالات میں سرمایہ دارانہ ترغیبات متعارف کروانے سے یہ خطرہ حقیقی معنوں میں لاحق تھا کہ آنے والے عہد میں منصوبہ بند معیشت کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

تاہم اس مسئلے پر ہمیں ایک میکانکی نقطہ نظر اپنانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ماضی کی بصیرت کے سہارے یہ کہنا آسان ہے کہ جب (1978ء) سے ڈینگ اقتدار میں آیا تھا تب سے بیوروکریسی واضح طور پر سرمایہ داری متعارف کروانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ لیکن یہ غلط ہوگا۔ بیوروکریسی تجربیت کی بنیاد پر چلتی ہے اور اس کا انحصار کسی بھی مخصوص وقت کی ضرورت پر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ سٹالنسٹ روس کے اندر بھی ایسے ادوار آئے جہاں منڈی کی طاقتوں کو زیادہ کھلا چھوڑا گیا اور عدم مرکزیت کی گئی اور اس کے بعد نئے سرے سے مرکزیت کے ادوار آئے۔ اس سے بیوروکریسی کی ان کاوشوں کی عکاسی ہو رہی تھی جو وہ معیشت کو چلتا دیکھنے کیلئے کر رہی تھی۔ بیوروکریسی اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ اگر انہوں نے ذرائع پیداوار کو ترقی نہ دی تو ان کی مراعات یافتہ حیثیت خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔

1978ء کا موڑ اور ڈینگ

یہ وہ احساس تھا جس سے چین کی کمیونسٹ پارٹی 1970ء کی دہائی کے آخر میں اس نتیجے پر جا پہنچی کہ ملک کو غیر ملکی سرمایہ کاری کیلئے کھولنا ضروری ہو گیا ہے۔ دسمبر 1978ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی نے انقلاب کی تیسری دہائی کے مکمل ہونے پر تقریبات کا انعقاد کیا۔ یہاں ایک نئے موڑ کو زیر بحث لایا گیا۔ اگرچہ کہا گیا کہ مرکزیت پر مبنی منصوبہ بند معیشت کی شکل غالب رہے گی لیکن انہوں نے عدم مرکزیت کے عناصر متعارف کروائے اور نجی فرموں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے پیچھے یہ خیال کارفرما تھا کہ منڈی کی قوتوں کو ایک ایسے ذریعے کے طور پر استعمال کیا جائے جس سے معیشت کی ضروریات کو یقینی طور پر پورا کیا جا سکے۔ تاریخی اعتبار سے پہلی مرتبہ اس پالیسی کو پیش کرنے والا روس کی کمیونسٹ پارٹی کا اہم رہنما نکولائی بخارن تھا۔ 1920-21ء میں سوویت یونین کی معاشی مشکلات کے حل کی بحث میں جب NEP کا طریقہ کار اختیار کرنے پر دلائل دیئے گئے تو بخارن نے اس پالیسی کو پیش کیا تھا۔

اس پر بالآخر ڈینگ نے 1979ء میں یہ تجویز دی کہ ہانگ کانگ اور مکاؤ کے گرد گانگ ڈانگ اور فیوجی آن کے صوبوں میں جنوبی ساحل پر مخصوص اکنامک زون تشکیل دیئے جائیں۔ یہ وہ زون تھے جو غیر ملکی سرمایہ کاری کیلئے کھلے تھے۔ ابتدا میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی سطح اور طرز پر کافی سخت پابندیاں تھیں۔ وہ یہ کہ ڈینگ بھی ان اقدامات کو پیداواری قوتوں میں جدت لانے کا ذریعہ خیال کر رہا تھا جبکہ وہ مرکزیت پر مبنی منصوبہ بند اور ریاستی کنٹرول کی حامل معیشت کو غالب رکھنا چاہتا تھا۔ ابتدا میں وہ خاصے محتاط تھے اور محض محدود رعایتیں دے رہے تھے۔

تاہم ٹھیک انہی پابندیوں کی وجہ سے یہ چار خصوصی زون فوری طور پر وہ کامیابی حاصل نہ کر پائے جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے 1983ء میں یہ پابندیاں اٹھا لی گئیں۔ مثلاً اس کے بعد مکمل طور پر غیر ملکیوں کی ملکیت میں چلنے والی کمپنیوں کو کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہاں ہمیں بیوروکریسی کی تجربیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ کوئی طے شدہ ''منصوبہ'' نہیں تھا۔ لیکن جب ایک بار بیوروکریسی اس راہ پر چل نکلی تو پھر خود اس کی اپنی ہی منطق تشکیل پانے لگی۔ بیوروکریسی نے محسوس کیا کہ منڈی کی قوتوں کو لگام دینا ان کیلئے زیادہ سے زیادہ دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اگر وہ یہ چاہتے تھے کہ سرمایہ دار سرمایہ کاری کریں تو پھر ان کیلئے سازگار حالات پیدا کرنے ضروری تھے۔

جب یہ مخصوص زون تشکیل دیئے جا رہے تھے تو زراعت کے شعبے میں ایک متوازی عمل

جاری تھا۔ زمین کے پرانے اجتماعی نظام میں اکھاڑ پچھاڑ کی گئی اور نجی پیداوار کی منطق متعارف کروائی گئی۔ یہ کام خاندانوں کو زمین ''پٹے پر دے کر'' کیا گیا۔ قانونی اعتبار سے زمین ریاستی ملکیت میں رہی لیکن عملاً یہ نجی ملکیت کی شکل اختیار کر گئی۔ مثلاً پٹے پر لی گئی زمین آدمی اپنی آئندہ نسل کو منتقل کر سکتا تھا۔ اس تبدیلی سے اس صورتحال نے جنم لیا جہاں 1980ء کے عشرے کے آخر میں پٹے پر لی گئی زمین فروخت کی جا سکتی تھی یا وراثت میں چھوڑی جا سکتی تھی۔

اس سے کسانوں کے اندر تفریق نے جنم لیا جس سے کچھ امیر ہوتے گئے جبکہ اکثریت اپنی روزی روٹی سے محروم ہو کر شہروں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئی۔ ایک طرف زمین کی پیداواریت میں اضافہ ہونے لگا جبکہ دوسری جانب بہت بڑی پرتیں غربت کی نذر ہو گئیں۔ اس سے شہروں کی طرف سستی محنت کا وہ بہاؤ شروع ہو گیا جس نے وہاں سرمایہ داری کی ترقی کی بنیاد فراہم کی۔

یہ اسی طرح کا عمل تھا جو 1861ء میں روس کے اندر پرانے زرعی کمیون 'میر' کو تحلیل کرنے کے بعد ہوا تھا۔ جب کمیون ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تو کسان شہروں کی طرف جانے لگے اور یوں انہوں نے 1880ء اور 1912ء کے درمیان کے عرصے میں سرمایہ داری کی ترقی کیلئے درکار افرادی قوت فراہم کی۔ لیکن اس وقت کے روس کی نسبت چین میں یہ عمل آج کل بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اس کا موازنہ برطانوی سرمایہ داری کے ابتدائی دنوں کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے جب کسانوں کو بے رحمی کے ساتھ زمینیں چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور انہیں انتہائی ظالمانہ حالات میں شہروں کی طرف جانے اور وہاں رہنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا موازنہ امریکہ میں سرمایہ داری کی وسعت کے وقت وائلڈ ویسٹ کے دور کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ چین میں اس وقت جو مظہر ہمارے سامنے ہے اس میں دراصل ان تمام تاریخی مثالوں کے عناصر موجود ہیں۔ تاہم اپنے دائرہِ اثر اور رفتار کے حوالے سے یہ عمل اپنی مثال آپ ہے۔

غیر ملکی سرمایہ کاری کو اپنی طرف مائل کرنے کیلئے چین کی حکومت نے جو اولین اقدامات کیے ان میں سے ایک ''مزدوروں کی منڈی'' کی تخلیق تھا۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے ''اصلاحات'' کا ایک پورا سلسلہ متعارف کروایا جن سے مخصوص ریاستی صنعتوں کے مینیجروں کو یہ اختیار ملا کہ وہ نام نہاد ''عمر بھر کے'' روزگار کا خاتمہ کر دیں۔ یہ خیال متعارف کروایا گیا کہ مزدوروں کو برطرف کیا جا سکتا ہے۔

چند سال بعد 1983ء میں ریاست مزید ایک قدم آگے بڑھی۔ اب ریاستی صنعتی ادارے

ٹھیکے کی بنیاد پر محدود وقت کیلئے مزدوروں کی خدمات حاصل کر سکتے تھے۔اس نئے نظام کا مطلب یہ تھا کہ جن نئے مزدوروں کی خدمات حاصل کی جائیں گی انہیں ویلفیئر کی وہ مراعات حاصل نہیں ہوں گی جو سابقہ ریاستی مزدوروں کو حاصل تھیں۔1987ء تک ریاستی فرموں میں 75 لاکھ مزدوروں کو ٹھیکے کی بنیاد پر ملازمت دی جا چکی تھی اور اس برس مزید 60 لاکھ کی زندگی بھر کی ملازمت کی حیثیت کو بدل کر ٹھیکے (Contract) کی طرز پر کر دیا گیا تھا۔

اس عرصے میں نجی شعبے کی ورک فورس میں اضافہ ہونے لگا۔1979ء میں یہ تعداد تقریباً ڈھائی لاکھ تھی۔1984ء میں یہ بڑھ کر 34 لاکھ ہوگئی وہ بھی زیادہ تر انتہائی چھوٹے صنعتی اداروں میں۔ابتدا میں نجی فرموں میں ملازمین کی تعداد رکھنے کی ایک حد مقرر تھی لیکن 1987ء میں اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔اس کے اوپر ڈھکے چھپے انداز میں ایک طرح کی نجی صنعت کو نام نہاد ''شہری اجتماعی صنعتوں'' یا ٹاؤن اینڈ ویلج انٹر پرائزز (ٹی وی ایز) کی شکل میں پروان چڑھنے کی اجازت دی گئی،ان کا کنٹرول مقامی شہری حکومتوں کے پاس تھا اور ان کا انحصار بھی انہی پر تھا لیکن یہ ''منافع کی طرف مائل'' تھیں یعنی یہ سرمایہ دارانہ صنعتی اداروں کی طرح کام کر رہی تھیں۔

ان تمام تر پیش رفتوں کے باوجود اس تمام تر عرصے میں ریاستی شعبے کو غلبہ حاصل رہا اور مجموعی معاشی عمل کی لگام اسی کے ہاتھ میں تھی۔1980ء کے عشرے کے وسط تک بھی ریاستی شعبے میں شہری ورک فورس کا تقریباً 70% کام کر رہا تھا۔تاہم ان مزدوروں کی حیثیت بدل رہی تھی۔ان کی بہت بھاری تعداد محدود مدت کے ٹھیکے پر کام کر رہی تھی۔

ریاستی کنٹرول میں کام کرنے والی کمپنیوں کی بندش سے بیروزگاری کے مظہر نے جنم لیا جسے پہلے کوئی جانتا تک بھی نہیں تھا۔جیسے ہی منڈی کی اصلاحات متعارف کروائی گئیں افراطِ زر میں اضافہ ہونے لگا جس سے سماجی اضطراب جنم لینے لگا۔اس کے سیاسی اثرات سے خوفزدہ ہو کر حکومت نے 1981ء میں اس عمل کو آہستہ کر دیا۔یہ وہ چیز تھی جسے اس عمل کے دوران آنے والے ہر بحران کے موقع پر دہرایا گیا۔لیکن ہر بار جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے ابتدائی سست روی اور صورتحال میں دوبارہ استحکام پیدا ہونے کے بعد بیوروکریسی پھر سے اس عمل کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھاتی تھی۔

1982ء میں پارٹی نے سرکاری طور پر اعلان کیا تھا کہ ریاستی شعبے کو اب بھی غلبہ حاصل ہے۔اس مرحلے پر بھی ہمیں مسخ شدہ مزدور ریاست میں ایک بیوروکریسی کی حکومت نظر آتی ہے جو

مجموعی معیشت کو ترقی دینے کیلئے سرمایہ دارانہ طریقہ ہائے کار استعمال کر رہی تھی۔ تاہم 1984ء میں وہ ایک بار پھر سرمایہ دارانہ طرز کی ترقی کی خاطر زیادہ آزادی کے لیے متحرک ہو گئے۔ نجی پیداوار اور منڈی پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جانے لگا۔ زیادہ تر اشیائے صرف اور زرعی اجناس کی قیمتوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ اب منڈی وہ جگہ تھی جہاں قیمتوں کی سطح کا تعین ہونا تھا۔

اسی سال پارٹی کی جب بارہویں کانگریس منعقد کی گئی تو اس میں ''منصوبہ بندی اور اجناس پر مبنی معیشت'' کے خیال کو متعارف کروایا گیا۔ منصوبہ بند معیشت اور سرمایہ داری کے درمیان جو تضادات شروع ہو چکے تھے ان کا اظہار ہمیں حکومت کی طرف سے استعمال کی جانے والی اصطلاحات میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مخصوص معاشی زونوں کے زیر اثر علاقوں کو وسعت دی گئی اور ساحل کے ساتھ مزید 14 شہروں کو ان میں شامل کر دیا گیا۔ ایک سال بعد دریائے پرل کے ڈیلٹا' اور دریائے یانگتزی (Yangtze) کے ڈیلٹا کا علاقہ بھی ان علاقوں میں شامل کر دیا گیا۔ عملاً طویل ساحلِ سمندر پر واقع چین کے تمام تر علاقے کو غیر ملکی سرمایہ کاری کیلئے کھول دیا گیا۔

1986ء میں اس عمل میں تیزی جاری رہی جب کچھ نئے اقدامات اٹھائے گئے جن سے غیر ملکی سرمایہ کاری کیلئے مزید سہولت پیدا ہو گئی۔ ان اقدامات میں سرمائے پر ٹیکسوں کی شرح میں کمی' ملازمین کو نوکری پر رکھنے اور نکالنے کے قوانین میں مزید چھوٹ اور غیر ملکی زرِ مبادلہ تک آسان رسائی اور ترسیل شامل تھی۔ اس عمل کے تحت انہوں نے کئی ایک تبدیلیاں متعارف کروائیں۔ ان تبدیلیوں میں برابری کی سطح پر اجرت کا خاتمہ' عمر بھر کے روزگار کا خاتمہ' پیداوار سے اجرت کا منسلک کیا جانا اور چھوٹی مدت کے ٹھیکے کے تحت نوکری دیا جانا شامل تھے۔ یہ تمام وہ اقدامات ہیں جن سے مغربی ممالک کے مزدور بخوبی واقف ہیں۔

1987ء میں پارٹی کی تیرہویں کانگریس میں ''برآمدات کی طرف مائل معیشت'' کو رائج کرنے کیلئے مزید تجاویز دی گئیں۔ صنعتی صلاحیت میں نمو کا تقاضا تھا کہ مشینری اور دیگر اشیاء درآمد کی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1980ء کی دہائی کے وسط میں چین کے تجارتی خسارے میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی افراط زر کا دباؤ دھماکہ خیز شکل اختیار کر گیا۔ 1988ء اور 1989ء کے دو سالوں میں افراطِ زر کی سالانہ شرح 18% تھی۔ اس سے محنت کش طبقے کے خاندانوں کی حقیقی قوتِ خرید بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

اس کیفیت سے جس سماجی اضطراب نے جنم لیا اس سے حکومت کو مجبوراً اس عمل کو آہستہ کرنا پڑا۔ دباؤ کے پیش نظر 1988ء کے آخر میں حکومت نے نام نہاد ''اصلاحات'' کو روک دیا۔ اور افراطِ زر کو قابو میں رکھنے کیلئے اس نے زر کی سپلائی کو سخت کر دیا۔ اس سے چین کی معیشت میں ایک نیا مظہر سامنے آیا۔ یہ 1989ء کی کساد بازاری تھی۔ ان تمام چیزوں کے نتیجے میں سماجی اضطراب میں اضافہ ہو گیا اور ہڑتالوں کی ایک لہر امنڈ آئی۔ یہ وہ پیش منظر تھا جس میں بیجنگ کے اندر تیانامین سکوائر کے گرد احتجاجی تحریک چلی۔ تیانامین سکوائر کی تحریک کس چیز کی غمازی کر رہی تھی؟ یہ بات واضح ہے کہ 1989ء میں سیاسی انقلاب کے عناصر موجود تھے۔ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ بہت بڑی تعداد میں طلباء سڑکوں پر نکل آئے۔ نوجوان مزدوروں کا بین الاقوامی ترانہ ''انٹرنیشنل'' گا رہے تھے جیسا کہ وہ حکومت اور عالمی رائے عامہ کو کہہ رہے ہوں ''دیکھو ہم سرمایہ داری کے حق میں نہیں ہیں ہم ردِ انقلابی نہیں ہیں۔''

لیکن جس چیز کا آغاز طلباء اور نوجوانوں سے ہوا وہ مزدوروں تک پھیلنے لگی۔ اس سے حکومت خوفزدہ ہو گئی اور ایک دھڑا اس بات پر قائل ہو گیا کہ تحریک کو خون میں ڈبو دیا جائے۔ اس وحشیانہ تشدد کے ذریعے حکومت اس بات کو یقینی بنا رہی تھی کہ سماج پر اس کی گرفت برقرار رہے۔ یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل بحالی کا فیصلہ کب آیا؟ چونکہ ہم ایک ایسے عمل پر بحث کر رہے ہیں جس کا آغاز تقریباً 30 سال قبل ہوا تھا اس لئے اس طرح کے کسی لمحے کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ایسے واقعات ہوئے ہیں جن سے اس عمل میں تیز رفتاری آئی ہے۔ یوں اس ضمن میں فیصلہ کن مراحل کا ایک پورا تسلسل ہے اور تیانامین کا واقعہ ان میں سے ایک ہے۔

تیانامین کے احتجاج کو کچلنے کے بعد طاقت کا توازن دائیں طرف مڑ گیا۔ اس تحریک نے مزدوروں اور نوجوانوں کی امیدوں کو جلا بخشی لیکن عوام خونریز شکست سے دوچار ہو گئے۔ تیانامین کے واقعے کے بعد حکومت نے تمام کلیدی لیڈروں کا پیچھا کیا اور ان میں سے کئی ایک یا تو غائب ہو گئے یا پھر کئی سال جیل میں رہے۔ اس کے ساتھ ہی بیوروکریسی نے وقتی طور پر منڈی کی اصلاحات کے عمل کو آہستہ کر دیا تاکہ صورتحال کو دوبارہ استحکام دیا جا سکے۔ جب اس کا اپنے اوپر اعتماد بحال ہو گیا تو سرمایہ داری کی حامی تحریک میں شدت آ گئی۔

اسی دوران ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مشرقی یورپ اور سوویت یونین میں کیا ہو رہا تھا۔ 1989ء میں مشرقی یورپ کی تمام سٹالنسٹ ریاستیں یکے بعد دیگر منہدم ہوتی گئیں۔ صورتحال پر

بیوروکریسی کا کنٹرول قائم نہ رہ سکا اور سرمایہ داری کی طرف سفر کے دور کا آغاز ہوگیا۔ کچھ وقت تک سوویت یونین نے مزاحمت کی لیکن بالآخر یہ بھی اس عمل کا شکار ہوگیا اور 1991ء میں سابقہ سٹالنسٹ حکومت انہدام کا شکار ہوگئی۔ یہ ریاستیں اتنی بوسیدہ ہو چکی تھیں کہ وہ بیوروکریسی کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر ہی گر گئیں۔ روس کے اندر خانہ جنگی کا حقیقی خطرہ موجود تھا لیکن سخت گیر سٹالنسٹ دھڑا اتنا دیوالیہ ثابت ہوا کہ وہ کوئی سنجیدہ مزاحمت کرنے سے قاصر رہا۔ جس سٹالنسٹ نظام کی وہ نمائندگی کر رہے تھے وہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

یقیناً ان واقعات کے چین کے سٹالنسٹوں پر اثرات مرتب ہوئے۔ اس وقت تک وہ منڈی کی اصلاحات متعارف کراتے چلے آئے تھے اور چین کے تمام تر علاقوں کو سرمایہ دارانہ سرمایہ کاری کیلئے کھول رہے تھے۔ لیکن ریاستی شعبہ اب بھی معیشت پر تھا۔ اور پارٹی کا موقف بھی یہی تھا۔ معاشی کنٹرول کی کنجی اب بھی بیوروکریسی کے ہاتھوں میں تھی۔ اس عمل کو اب بھی الٹا جا سکتا تھا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ انہیں اسے الٹنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب کبھی انہیں عدم استحکام کا سامنا کرنا پڑا انہوں نے اس عمل کی رفتار کو کم کر دیا لیکن انہوں نے کبھی بھی واپسی کا رخ نہ کیا۔

1992ء کی ''چینی خدوخال کے ساتھ سوشلسٹ منڈی کی معیشت''

تیانا مین چوراہے کے احتجاج اور مشرقی یورپ اور سوویت یونین میں سٹالنزم کے انہدام کے چین کی بیوروکریسی پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان واقعات کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی قیادت نے ''منڈی کی اصلاحات'' میں تیزی لانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کے بحران کا حل سرمایہ دارانہ بحالی میں ہے لیکن انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ یہ سارا عمل بیوروکریسی کے کڑے کنٹرول میں ہوگا۔ دراصل اس کا مطلب یہ تھا کہ بیوروکریسی اپنے آپ کو ایک نیا سرمایہ دار طبقہ بنانے کیلئے زمین ہموار کر رہی تھی۔

اس حقیقت کا کہ بیوروکریسی سرمایہ دارانہ بحالی کی طرف بڑھ رہی تھی مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ناگزیر طور پر اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچا دے گی۔ کسی ارادے کا اظہار کرنا ایک بات ہوتی ہے اور اس کا حصول بالکل دوسری۔ اگر مغربی سرمایہ دارانہ ملکوں کے اندر 1929ء کی کساد بازاری کی طرز پر ایک سنجیدہ بحران آتا تو چیزیں ایک مختلف شکل اختیار کر سکتی تھیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ مغرب کے اندر عروج کئی ایک وجوہات کی بنا پر جاری رہا۔ اس سے نئے تضادات کے انبار لگتے گئے جو

مستقبل میں ایک دیوہیکل بحران کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔لیکن چین کی بیوروکریسی ان عوامل کو مارکسی بنیادوں پر سمجھنے سے قاصر ہے بلکہ وہ سرمایہ دارانہ ماہرین کی طرح تجربے کی بنیاد پر واقعات پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتی ہے۔عالمی سطح پر سرمایہ داری میں ابھار تھا اور سٹالنزم انہدام کا شکار تھا اور وہ بس یہی کچھ دیکھ سکتے تھے۔

ان تمام واقعات سے بیوروکریسی نے جو نتائج اخذ کیے ان کا واضح اظہار 1992ء میں ہوا۔اس سال پارٹی کی چودھویں کانگریس کا انعقاد ہوا،اور سرکاری طور پر انہوں نے یہ خیال ترک کر دیا کہ ریاستی شعبے کا غلبہ ہونا چاہیے۔انہوں نے ایک منصوبے کا اعلان کیا جس کے تحت نام نہاد ''چینی خدوخال والی سوشلسٹ منڈی کی معیشت'' قائم کی جانی تھی۔ اسی سال ڈینگ نے ''اصلاحات کے پروگرام'' میں، جیسا کہ وہ اسے گردانتے تھے ایک نئے مرحلے کا آغاز کیا۔وہ شین زن کے مخصوص زون کے دورے پر گیا اور ایک مشہور اعلان کیا ''جب تک یہ آمدن کا باعث ہے یہ چین کیلئے اچھا ہے۔'' یہ حکومت کے اندر ایک اور فیصلہ کن موڑ تھا۔

چین میں منڈی کا میکانزم پہلے ہی کچھ عرصے سے کام کر رہا تھا۔1992ء کی اہم بات یہ ہے کہ اس سال پارٹی نے سرکاری طور پر ریاستی ملکیت میں چلنے والی صنعتوں کو معیشت کا غالب حصہ رکھنے سے اپنی وابستگی کو ترک کر دیا۔ یوں انہوں نے ریاستی شعبے کو سکیڑنے کا فیصلہ کیا۔اس سے پہلے یہ ہوتا آیا تھا کہ نجی شعبہ ریاستی شعبے سے باہر باہر ترقی کر رہا تھا۔اب انہوں نے ریاستی ملکیت میں چلنے والی صنعتوں کی نجکاری کا فیصلہ کیا۔انہوں نے اس مقصد کیلئے مقامی سطح پر ریاستی ملکیت میں چلنے والی 2500 صنعتوں اور مرکزی سطح پر کام کرنے والی 100 کمپنیوں کا انتخاب کیا۔1998ء تک یہ عمل مکمل ہو گیا۔

1994ء میں انہوں نے اس پروگرام میں وسعت پیدا کی اور کہا کہ وہ ریاستی ملکیت والے 1000 بڑے صنعتی اداروں پر اپنا کنٹرول رکھیں گے جبکہ باقی ماندہ تمام ریاستی صنعتیں اور ادارے لیز پر پرائیویٹ ہاتھوں میں فروخت کر دیئے جائیں گے۔ 1990ء کے عشرے کے اختتام پر ریاستی ملکیت والی صنعتوں میں 8 کروڑ 30 لاکھ مزدور کام کر رہے تھے لیکن یہ تعداد برسرِ روزگار کل لوگوں کی تعداد کا محض 12 فیصد تھی اور حتیٰ کہ شہری علاقوں میں بھی یہ تعداد کل کا محض ایک تہائی تھی۔ہم دیکھتے ہیں 1978ء کے بعد سے ایک بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہو چکی تھی۔اس وقت شہروں میں برسرِ روزگار افراد کا 78 فیصد ریاستی شعبے میں کام کر رہا تھا۔

1990ء کی دہائی کے اختتام پر ریاستی کمپنیوں کا جی ڈی پی میں حصہ کم ہوکر 38 فیصد رہ گیا تھا۔ ستمبر 1999ء میں پارٹی کی پندرہویں کانگریس میں انہوں نے ایک اور قدم اٹھایا۔ انہوں نے اسے ''جانے دو کی پالیسی'' کا موقف قرار دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ڈھیل دیتی جائے گی اور اپنا کنٹرول ترک کرتی جائے گی۔ انہوں نے درمیانے اور چھوٹے ریاستی اداروں میں ڈھیل دینا شروع کی۔ مثال کے طور پر جولائی 2000ء میں بیجنگ کی شہری حکومت نے جو بہت بڑے علاقے پر محیط ہے یہ اعلان کیا کہ تین سالوں کے اندر تمام چھوٹے اور درمیانے ریاستی اداروں پر سے اجتماعی ملکیت مرحلہ وار ختم کردی جائے گی۔ 2001ء میں ریاستی صنعتوں میں مینوفیکچرنگ محض 15 فیصد تھی اور داخلی تجارت کے شعبے میں 10 فیصد سے بھی کم تھی۔

چین جنوب مشرقی ایشیا میں ہونے والی سٹاک ایکسچینج کی تباہی سے کسی حد تک اس لئے بچ گیا تھا کیونکہ غیر ملکی تجارت پر اب بھی اچھا خاصا ریاستی کنٹرول موجود تھا اور کرنسی غیر تغیر پذیر تھی۔ ان دو چیزوں نے اس بحران میں چین کو تحفظ فراہم کیا۔ درحقیقت اس بحران کے بعد چین زیادہ طاقتور ہوکر ابھرا اور علاقے کے اندر اس نے زیادہ غالب کردار ادا کرنا شروع کردیا۔ اس کے بعد اس دور میں جو تقریباً 1998ء سے 2001ء تک محیط ہے اس عمل میں مزید تیزی آ گئی۔ اب اس عمل کی سمت بالکل واضح تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کی حکمران پرت مکمل طور پر اس بات پر قائل تھی کہ ریاستی کمپنیوں کی نسبت نجی کارپوریشنوں کی کارگزاری زیادہ بہتر ہے۔ ان کے ہاں ریاستی صنعتوں کا واحد تصور ان صنعتوں کا تھا جو بیوروکریٹک منصوبہ بندی کے تحت چل رہی تھیں اور جو ہر طرح کی بدانتظامی کا شکار تھیں۔ ان کیلئے مزدوروں کے کنٹرول میں چلنے والی اچھی کارگزاری کی حامل ریاستی صنعتوں کا تصور محال تھا۔

ایک دستاویز جس کا نام ''چین میں ملکیت کی تبدیلی'' ہے اور جو 2005ء میں شائع ہوئی اس میں کچھ دلچسپ اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب روزگارنٹ، لیکنگ سانگ، سٹوئن ٹی نیف اور یانگ یاؤ نے لکھی ہے۔ جن کا تعلق انٹرنیشنل فنانس کارپوریشن، آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی، چائنا سینٹر فار اکنامک ریسرچ اور پیکنگ یونیورسٹی سے ہے۔ اس دستاویز کو انٹرنیشنل فنانس کارپوریشن نے شائع کیا جو عالمی بینک کی ایک شاخ ہے۔

مصنفین نے اس بات پر زور دیا کہ حقیقی معنوں میں نجکاری کا آغاز 1992ء میں ہوا۔ 1995ء کا حوالہ دیتے ہوئے اس دستاویز میں بتایا گیا ہے ''ریاست نے 500 سے 1000

بڑی ریاستی کمپنیاں اپنے پاس رکھنے کا اور چھوٹی فرموں کو لیز پر دینے یا بیچنے کا فیصلہ کیا'' اس میں وضاحت کی گئی ہے کہ ایسا کرنے کی معقول وجہ تھی کیونکہ 1997ء میں سب سے بڑی 500 فرموں میں، جن میں سے زیادہ تر مرکزی حکومت کے کنٹرول میں تھیں، ریاست کے صنعتی اثاثوں کا 37 فیصد حصہ تھا۔ وہ آمدن اور اس طرح کی دیگر چیزوں کا بہت بڑا ذریعہ تھیں۔

یہ دستاویز اس عہد کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں وہ اس عمل کو پھیلا رہے تھے وضاحت کرتی ہے کہ ''یہ رجحان اس یقین کا اظہار کر رہا تھا کہ کسی صنعت میں حقیقی تبدیلی لانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ حصص کا اکثریتی حصہ انتظامیہ کے پاس ہو'' اور اب چین میں یہ نعرہ بن گیا ''ریاست پسپا ہو رہی ہے اور نجی شعبہ آگے بڑھ رہا ہے'' انہوں نے یہ پیغام عوام تک پہنچانے کیلئے یہ نعرہ اختراع کیا۔

ایسے بے شمار اعداد و شمار ہیں جو اس عمل کے خدوخال اور اس کی بڑھتی ہوئی رفتار کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دستاویز میں وضاحت کی گئی ہے کہ ''(چھ مثالی شہروں کے حوالے سے) اگر یہ کارگزاری باقی ماندہ ملک کیلئے مثالی نمونہ پیش کرتی ہے تو پھر چین کے اندر نج کاری پہلے ہی مشرقی یورپ کے کئی ایک ملکوں اور سابقہ سوویت یونین سے کہیں آگے جا چکی ہے۔''

تاہم یہ ایک سیدھا سادہ عمل نہیں ہے جس میں محض ہر چیز کو بیچا جا رہا ہے۔ سوال محض یہ نہیں ہے کہ ریاستی اور نجی ملکیت کے فیصدی حصوں کو دیکھا جائے (اگرچہ آخری تجزیے میں یہ ایک فیصلہ کن عنصر ہے) سوال محض یہ بھی نہیں ہے کہ ریاست کا ملکیت میں کتنا حصہ ہے بلکہ سوال یہ بھی ہے کہ ریاستی ملکیت میں چلنے والا شعبہ کس طرح کام کر رہا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس عمل کی مجموعی سمت کا مشاہدہ کیا جائے اور یہ سمت بہت بڑی حد تک سرمایہ داری کی طرف رہی ہے۔

تاہم سرمایہ داری کی طرف عبور کے عمل میں وہ ابھی تک اس اہلیت کی مالک بورژوازی کو ترقی نہیں دے سکے تھے جو ریاستی امداد کے بغیر اور جاپانی اور امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرز پر بڑے پیمانے کی کارپوریشنوں کو چلا سکے۔

بیوروکریسی ابھی تک زیادہ تر چھوٹے اور درمیانے پیمانے کی کمپنیاں فروخت کرتی رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نجی کمپنیوں کی ترقی کی حوصلہ افزائی کرتی آئی ہے جو کبھی بھی ریاستی ملکیت میں نہیں رہی ہیں۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی 500 ملٹی نیشنل کمپنیوں میں سے 450

چین کے اندر کسی نہ کسی سطح پر دخل اندازی کر رہی ہیں۔ ریاستی شعبے کا جو حصہ باقی بچا ہے اس کی بھی نجکاری کی تیاری ہو رہی ہے۔ بڑی دیوہیکل ریاستی صنعتوں کو چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کی شکل میں توڑا جا رہا ہے جبکہ سوشلزم نہیں بلکہ سرمایہ داری کے اصولوں کے تحت ''غیر منافع بخش'' شعبوں کو بند کیا جا رہا ہے اور زیادہ منافع بخش شعبوں کو بیچا جا رہا ہے۔

ریاستی کمپنیوں کے مینیجر بڑے انہماک کے ساتھ اثاثہ جات کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہیں۔ نجی شعبے میں ان کے دوست موجود ہیں اور وہ انہیں بہترین قسم کی مشینیں اور پرزہ جات وغیرہ دیتے ہیں جبکہ وہ کمپنی کی مرمت نہیں کرتے اور اسے زوال پذیر کر دیتے ہیں۔ ان مینیجروں کے احساسات یہ ہیں کہ ''جلد یا بدیر اس فیکٹری کی نجکاری کر دی جائے گی اور مجھے اس کی پیش کش کی جائے گی۔'' یوں ارادہ یہ ہوتا ہے کہ کمپنی کی حالت اتنی خستہ کر دی جائے کہ اس کی قیمت کم از کم لگے اور اس کو سستے داموں خریدا جا سکے۔ کئی ایک چھوٹے شہروں میں مقامی ٹاؤن کونسلیں اس فیصلے پر پہنچتی ہیں کہ کسی کمپنی کو چالو رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے سستے داموں مینیجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے تاکہ اثاثہ جات کی کانٹ چھانٹ ختم ہو۔ اس کے پیچھے یہ خیال کارفرما ہوتا ہے کہ جب مینیجر مالک بن جائیں گے تو وہ اثاثہ جات کو کمپنی کی ترقی کیلئے استعمال کریں گے کیونکہ اس سے انہیں منافع حاصل ہوگا۔

اس سارے عمل کی مزدوروں کو بھاری قیمت چکانا پڑی جس میں لاکھوں مزدور نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 1990ء سے 2000ء کے درمیان ریاستی شعبے میں 3 کروڑ ملازمتیں تباہ و برباد کر کے رکھ دی گئیں۔ شمال مشرقی علاقے جو چین کے سابقہ ریاستی منصوبے کا گڑھ تھے، ان روایتی صنعتی علاقوں میں ایک نام نہاد ''زنگ کی پٹی'' (Rust Belt) نمودار ہوئی۔ جو لوگ آج بھی ملازمتوں پر ہیں ان کی تمام تر طویل المیعاد مراعات برباد ہو گئی ہیں۔ اس عرصے کے دوران 1949ء کے انقلاب کی حاصلات رفتہ رفتہ چھین لی گئیں۔ اس کے جواب میں مزدوروں کی طرف سے مزاحمت بھی ہوئی لیکن بیوروکریسی بے رحمی کے ساتھ آگے ہی بڑھتی چلی گئی۔

انہوں نے صحت، رہائش اور لیبر کے شعبوں میں آزاد منڈی کی اصلاحات متعارف کروائیں۔ حتیٰ کہ اب تعلیم کیلئے بھی پیسے دینے پڑتے تھے۔ 1990ء کی دہائی کے آغاز ہی میں مضبوط سرمایہ دارانہ عناصر موجود تھے۔ 1992ء میں سیل (Sales) کا 40 فیصد نجی شعبے کے پاس تھا۔ 1991ء میں ایک کروڑ تیس لاکھ نجی صنعتکار تھے جن کے ہاں 2 کروڑ 10 لاکھ مزدور کام

کر رہے تھے، یہ زیادہ تر چھوٹے کاروبار تھے۔ دیہات میں انہوں نے امیر کسانوں کو مراعات دینے کا عمل شروع کیا۔ زمین کو لیز پر دینے اور پیداواری اشیاء کی منڈی میں فروخت کی اجازت دینے سے اجتماعی زرعی کمیون ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے اور اس سے امیر اور غریب کسانوں کے درمیان تفریق مزید بڑھ گئی۔ 1998ء میں 2 لاکھ 38 ہزار ریاستی کنٹرول میں چلنے والے صنعتی ادارے موجود تھے لیکن 2003ء میں یہ تعداد کم ہو کر ایک لاکھ 50 ہزار رہ گئی۔

قصبوں اور دیہاتوں کی صنعتیں (TVEs)

سرمایہ داری کی ترویج میں ایک اور عنصر قصبوں اور دیہاتوں کی صنعتوں (ٹی وی ایز) کا تھا۔ 2006ء تک جی ڈی پی میں ٹی وی ایز کا حصہ 30 فیصد تھا لیکن وہ ہمیشہ متضاد کردار کی حامل تھیں۔ بیوروکریٹوں کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ ان صنعتوں کی نجکاری بھی کر دیں اور معاشی اور سیاسی افراتفری بھی جنم نہ لے۔ اگر وہ ایک ہی جھٹکے میں ہر ایک چیز کی نجکاری کر دیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ کئی ایک صنعتیں اور درحقیقت کئی ایک شعبے یا تو مکمل طور پر بند ہو جاتے یا پھر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے۔ اس کا نتیجہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنہ کی حکمرانی کے خاتمے کی صورت میں برآمد ہوتا۔

اس حوالے سے ٹی وی ایز کا اجرا مکمل نجکاری کی راہ پر چلنے سے پہلے محض ایک عبوری قدم تھا۔ اس سے مینیجروں اور سماج کی دیگر جونک نما پرتوں کو وہ وقت مل جاتا کہ وہ ان صنعتوں کی ملکیت حاصل کرنے کیلئے درکار سرمایہ جمع کر سکیں۔ یہ اس امر کی ایک انتہائی اعلیٰ مثال تھی کہ کس طرح ریاستی ملکیت میں چلنے والی پرانی صنعتیں اور شعبے اب چین کے اندر سرمایہ داری کے مفادات کی تکمیل کر رہے تھے۔ وہ سماج کے اندر موجود نوزائیدہ بورژوا عناصر کی پرورش اور حمایت کر رہے تھے تاکہ وہ براہِ راست مالک بننے کے اہل ہو جائیں۔ بعض صورتوں میں ''ٹی وی ایز'' میونسپل کمپنیاں ہیں اور بعض صورتوں میں وہ نجی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر کی جانے والی کاوش ہیں۔ بہرصورت وہ سرمایہ دارانہ طرز پر کام کرنے والے صنعتی یونٹ ہیں اور رفتہ رفتہ وہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جاتی رہی ہیں۔

بعض اوقات یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ معیشت کا غالب حصہ ریاستی ملکیت میں ہے ٹی وی ایز کو اعداد و شمار میں شامل کیا جاتا ہے اور بعض تو انہیں یہ دکھانے اور دعویٰ کرنے کیلئے استعمال کرتے

ہیں کہ یہ ایک طرح کا ''سوشلزم'' ہے۔لیکن قریبی مشاہدے سے ایک مختلف تصویر سامنے آتی ہے۔ٹی وی ایز کی تعداد 1987ء میں 15 لاکھ تھی۔1993ء میں یہ بڑھ کر 2 کروڑ 50 لاکھ ہوگئی جبکہ ان میں 12 کروڑ 30 لاکھ مزدور کام کر رہے تھے۔لیکن 1996ء سے ان کی تعداد مسلسل کم ہوتی گئی کیونکہ ان کی مکمل نجکاری کر دی گئی۔حتیٰ کہ جب وہ ریاستی یا میونسپل کمپنیوں کی حیثیت میں ہوتی ہیں تب بھی وہ سرمایہ دارانہ طرز پر کام کرتی ہیں اور انتظامیہ کو ملازمین کو نوکری پر رکھنے یا نکالنے کا اختیار ہوتا ہے۔

ہارٹ لینڈز برگ اور برکیٹ کے مطابق تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ''اوسطاً ٹی وی ایز کے مزدور محض بنیادی اجرت کما سکتے ہیں جو کم از کم اجرت سے کم ہے اور باقی کی اجرت انہیں اوورٹائم اور پیس ریٹ کوٹہ کے بونس کی شکل میں کمانا پڑتی ہے۔حتیٰ کہ بنیادی اجرت کی بھی کوئی ضمانت موجود نہیں کیونکہ کم از کم اجرت کا تعین مقامی قصبے کے حکام کرتے ہیں جن کے (ادارے سے متعلقہ اور ذاتی دونوں طرح کے) مفادات زیادہ سے زیادہ منافع کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔دراصل ٹی وی ایز کی 'مقابلہ بازی اور شرح منافع' کی بڑے پیمانے پر خفیہ ضمانت 'انتہائی کم قیمت پر دستیاب دیہی لیبر' کی شکل میں موجود ہے جو کمیون سسٹم کی تباہی اور کھیتوں پر کام کرنے والے خاندانوں کی غربت کی وجہ سے بڑے پیمانے پر دستیاب ہے۔'' (چین اور سوشلزم، منڈی کی اصلاحات اور طبقاتی جدوجہد صفحہ 45)

ٹی وی ایز کا مقدر بڑی مضبوطی کے ساتھ ان عوامل کے ساتھ جڑا ہوا تھا جو معاشی میدان میں وقوع پذیر ہو رہے تھے۔جیسے جیسے نجی شعبہ حاوی ہوتا گیا ٹی وی ایز کو اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنا پڑا۔جیسا کہ مذکورہ بالا مصنفین نے وضاحت کی ہے کہ ''نجی پیداوار کے منافع سے فیض یاب ہونے کے نئے مواقع ملنے کے ساتھ ٹی وی ایز کی طرف مینیجروں کا یہ طرزِ عمل انتہائی تباہ کن تھا جس کے تحت انہوں نے ٹی وی ایز کے اثاثہ جات یا پیداوار نجی صنعتوں کو غیر قانونی طور پر منتقل کرنے شروع کر دیئے جہاں سے ان کو زیادہ فوائد حاصل ہو رہے تھے۔اثاثہ جات کی یہ کانٹ چھانٹ 1990ء کی دہائی کے وسط میں زیادہ سرعت کے ساتھ شروع ہوئی جب پارٹی نے چھوٹی ریاستی صنعتوں کی نجکاری کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا--- جب چھوٹے شہروں اور دیہی سرکاری اہلکاروں کو گرتے ہوئے منافعوں اور صنعتوں کی تباہی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ ریاستی اہلکاروں کے اشارے پر چلنے لگے اور انہوں نے ٹی وی ایز کی فروخت میں تیزی پیدا کر دی۔اس

عمل کا آغاز 1996ء میں ہوا۔'' (ایضاً)

باب 10

سرمایہ دارانہ استواری اور ریاست کا کردار

چین کی بیوروکریسی سامراجی غلبے کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں سرمایہ داری کا ایک مضبوط چینی شعبہ برقرار رکھنے کی ضرورت ہے اور یہ کام انہوں نے کچھ ریاستی کمپنیوں کی تعمیر کر کے اور درحقیقت ان کو مضبوط کر کے کیا۔ اس کے لیے انہیں بہت بڑی مقدار میں سرمایہ میسر تھا۔ ان ریاستی کارپوریشنوں میں پیسے کا بہاؤ جاری رکھنے کیلئے ریاستی بینکوں کو استعمال کیا گیا۔

''چین میں ملکیت کی تبدیلی'' کے مصنفین کے بقول ''چین نے بہت سی کارپوریشنوں اور دیوہیکل کمپنیوں کو پروان چڑھایا ہے جنہوں نے عالمی منڈی میں اپنی فوقیت ثابت کی ہے۔ ان میں سے کچھ کمپنیاں ہزاروں لاکھوں مزدوروں کو نوکریوں سے برطرف کر رہی ہیں کیونکہ انہیں معاشی بحران کا سامنا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اہم بین الاقوامی کردار ادا کرنا چاہتی ہیں۔ مثلاً 2002ء میں چین کی سب سے بڑی 12 ملٹی نیشنل کارپوریشنیں وہ تھیں جو زیادہ تر ریاستی ملکیت میں تھیں جن کے پاس 30 ارب ڈالر سے زیادہ کے غیر ملکی اثاثہ جات تھے اور ان میں 20 ہزار کے لگ بھگ غیر ملکی ملازمین تھے اور جو غیر ملکی سیل کی شکل میں 33 ارب ڈالر حاصل کر رہی تھیں۔''

یوں اگرچہ یہ بھاری اجارہ داریاں ریاستی ملکیت میں ہیں لیکن انہیں سرمایہ دارانہ بنیادوں پر امریکہ اور جاپان وغیرہ کی کمپنیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کیلئے چین کی بڑی ریاستی کارپوریشنوں کی شکل میں پروان چڑھایا گیا۔ اس دستاویز میں ایک ٹیبل دیا گیا ہے جس کا نام ہے ''مختلف قسم کی ملکیت کے حوالے سے چین کے جی ڈی پی کی ہیئتِ ترکیبی'' اس میں ہمیں نظر آتا ہے کہ 1988ء ہی میں جی ڈی پی میں ریاستی شعبے کا حصہ کم ہو کر 41 فیصد رہ گیا تھا۔ 2003ء تک یہ مزید کم ہو کر 34 فیصد رہ گیا تھا۔ اور جس کو وہ ''حقیقی نجی شعبہ'' قرار دیتے ہیں، اس کا حصہ 1988ء س

ے 2003ء تک 31 فیصد سے بڑھ کر 44 فیصد ہو گیا۔ لیکن جہاں تک مجموعی غیر ریاستی شعبے کا تعلق ہے 2003ء میں جی ڈی پی میں اس کا حصہ 66 فیصد تھا۔ اور دستاویز کا حتمی نتیجہ یہ ہے کہ ''اب نجی شعبہ چین کی معیشت کا غالب حصہ ہے۔'' اس میں مزید کہا گیا ہے کہ ''نجی شعبے کا حصہ اور بھی بڑھ جاتا ہے اگر اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ اجتماعی کھیتوں کی اوسطاً اچھی خاصی تعداد درحقیقت نجی ہاتھوں میں ہے اور عمومی طور پر نجی شعبہ معیشت کے دیگر شعبوں کی نسبت زیادہ پیداوار دیتا ہے۔''

ہم نے پہلے بھی دنیا کے دیگر حصوں میں اس عمل کو چھوٹے پیمانے پر رونما ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ جنوبی کوریا میں بھی ریاست نے بڑی بڑی ریاستی کارپوریشنوں کو پروان چڑھایا تھا لیکن اس سبب سے اسے مزدوروں کی ایک مسخ شدہ ریاست یا ایک ایسی ریاست قرار نہیں دیا جا سکتا تھا جو منصوبہ بند معیشت پر مبنی عبوری دور سے گزر رہی ہو۔ یہ دراصل سرمایہ داری کی ایک کمزور شکل تھی جس کو صرف ریاستی سرمایہ کاری کی بنیاد پر ہی تعمیر کیا جا سکتا تھا کیونکہ بورژوازی اتنی قلیل اور کمزور تھی کہ وہ کام کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن چین کے اندر ہمیں یہی عمل بہت بڑے پیمانے پر جاری وساری نظر آتا ہے۔ اگرچہ چین کے اندر ایک بہت طاقتور بورژوازی کی تشکیل کی گئی لیکن اس کے پاس ان بڑی کارپوریشنوں کو چلانے اور انہیں ترقی دینے کیلئے وسائل نہیں تھے جن میں سے زیادہ تر اب بھی ریاستی ملکیت میں ہیں۔ اس لئے چین پر حکمرانی ریاست کی ہے اور یہ ریاست ہی ہے جو سرمایہ داری اور بورژوازی کو ابھار رہی ہے۔

اگر چین کے اندر قانونی ڈھانچے پر نظر دوڑائی جائے تو مشاہدے میں نظر آتا ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں قانونی ڈھانچے میں بہت سی اہم تبدیلیاں بروئے کار لائی گئیں تاکہ اس کو نئے ملکیتی رشتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے۔ 2004ء میں آئین کے اندر اہم تبدیلیاں کی گئیں جن میں ملک کے اندر معاشی سرگرمی کے حوالے سے غیر ریاستی شعبے کے امدادی کردار اور نجی ملکیت پر قبضے کے خلاف تحفظ فراہم کرنے پر زور دیا گیا۔

اسی دوران چین کے اندر ایسے قوانین تھے جو عوامی خدمات یا مالیاتی خدمات کے شعبوں میں نجی کمپنیوں کی مداخلت کو کنٹرول کرتے یا روکتے تھے۔ 2005ء میں یہ قوانین ختم کر دیئے گئے اور نجی کمپنیوں کو ان شعبوں میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ درحقیقت جب بورژوا تجزیہ نگار چین کے بارے میں لکھتے ہیں تو بہت حد تک قانونی ڈھانچے کی ان تفصیلات میں جاتے ہیں

جن کو نئے ملکیتی رشتوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ انہیں ماضی کی باقیات خیال کرتے ہیں جنہیں نجی کمپنیوں کی کارگزاری میں سہولت پیدا کرنے کیلئے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ چین میں ملکیتی رشتے بدل گئے ہیں اور اگرچہ قانونی ڈھانچے کو ان کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کیلئے پہلے ہی بہت کچھ کیا جا چکا ہے اب بھی پرانے قانونی نظام کی باقیات موجود ہیں۔ درحقیقت نئے ملکیتی رشتے اور پرانے قانونی ڈھانچے باہم متصادم ہو سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ فوری طور پر معاشی بنیادوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ تاہم جلد یا بدیر ناگزیر طور پر یہ ''بالائی ڈھانچہ'' معاشی بنیادوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گا۔ جیسا کہ مارکس نے 1859ء میں اپنی کتاب ''سیاسی معاشیات پر تنقید میں اضافہ'' میں اشارہ کیا تھا:

''ترقی کے ایک مخصوص مرحلے پر سماج کی مادی پیداواری قوتیں موجود پیداواری رشتوں یا ملکیتی رشتوں، جو محض قانونی حوالے سے اسی چیز کا اظہار ہے، کے ساتھ متصادم ہو جاتی ہیں جن کے اندر وہ اب تک کام کرتی رہی ہوتی ہیں۔ پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کی ہیئت کی بجائے یہ ان کی بیڑیاں بن جاتے ہیں۔ اس سے سماجی انقلاب کے عہد کا آغاز ہو جاتا ہے۔ معاشی بنیادوں میں رونما ہونے والی تبدیلیاں جلد یا بدیر تمام تر بھاری بھرکم بالائی ڈھانچے کی تبدیلی پر منتج ہوتی ہیں۔''

چین کے حوالے سے ہم سماجی انقلاب کی نہیں بلکہ ردِ انقلاب کی بات کر رہے ہیں۔ پھر بھی مارکس نے جو نقطہ اٹھایا تھا اس کا یہاں بھی اطلاق ہوتا ہے۔ جب ملکیتی رشتے تبدیل ہو جاتے ہیں تو قانون کے بالائی ڈھانچے کو ناگزیر طور پر اس تبدیل شدہ کردار کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اس حوالے سے توقع کی جا سکتی ہے کہ قانونی ''بالائی ڈھانچے'' میں بروئے کار لائی جانے والی تبدیلیوں کا یہ عمل جس کا مقصد اسے معاشی بنیاد کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے بڑی تیزی سے جاری رہے گا۔

ڈبلیو ٹی او (WTO) میں شمولیت کا عمل

ایک اور فیصلہ کن مرحلہ نومبر 2001ء میں اس وقت آیا جب چین نے عالمی تجارتی تنظیم میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ ڈبلیو ٹی او میں شمولیت کا مسئلہ خاصا اہمیت کا حامل ہے۔ ڈبلیو ٹی او میں شمولیت کے موقع پر چین نے بیرونی تجارت پر ہر طرح کا سرکاری کنٹرول ختم کرنے کا عہد کیا اور

تب سے اب تک وہ مرحلہ وار ایسا ہی کرتا آیا ہے۔ چین کے ڈبلیو ٹی او میں شامل ہونے کی وجوہات واضح ہیں۔ ڈبلیو ٹی او میں چین کی موجودہ معیشت کا وجود صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر اس کا عالمی معیشت کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ ہو۔ برآمدات پر اس کا انحصار بہت زیادہ ہے اور اس نے تجارت کے حوالے سے کئی ایک عالمی معاہدے کر رکھے ہیں۔ اس کو عالمی معیشت میں مکمل طور پر شریک ہونا تھا۔ نتیجتاً اس سے چین کے اندر سرمایہ داری کی طرف عبور کے عمل میں تیزی آ گئی۔

غیر ملکی تجارت پر ریاستی کنٹرول کا خاتمہ چین کو عالمی منڈی کیلئے کھولنے میں ایک اہم عنصر تھا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بالشویکوں کے پروگرام میں ایک کلیدی عنصر، جس کی سٹالن اور بخارن کے مقابلے میں لینن اور ٹراٹسکی زبردست حمایت کرتے تھے، یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ دنیا میں گھری ہوئی ایک مزدور ریاست کیلئے ضروری ہے کہ وہ غیر ملکی تجارت پر ریاستی اجارہ داری برقرار رکھے۔ خاص کر ایک غیر ترقی یافتہ ملک کیلئے یہ اور بھی ضروری تھا۔

بخارن کا خیال یہ تھا کہ معیشت کو ترقی دینے کیلئے کسانوں کی ایک پرت کو امیر بننے کی اجازت دینا ضروری ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مادی ترغیبات کے نتیجے میں کارگزاری اور پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ تاہم بخارن کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اس کے نظریات کے ممکنہ نتائج کیا نکلیں گے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے مؤقف پر کھڑا تھا جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کی واپسی کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے۔ بخارن کی 1919ء سے 1921ء کے دوران سوویت یونین میں NEP کے اجرا پر تجاویز بحث کے بعد پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے لینن کے دلائل کے تحت مسترد کر دی تھیں۔

اگر اس کے موقف پر عملدرآمد ہو جاتا تو سوویت یونین میں 1928ء ہی میں سرمایہ داری لوٹ آتی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی سرمایہ داری کا دباؤ بڑی شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ ڈینگ اور بخارن میں کئی ایک مماثلتیں ہیں حتیٰ کہ ان کے الفاظ میں بھی کافی مماثلت ہے۔ ڈینگ کا نعرہ تھا ''امیر ہونا شاندار بات ہے!'' جبکہ بخارن کا نعرہ تھا ''امیر بنو!''

غیر ملکی تجارت پر ریاستی اجارہ داری دراصل بیرونی دنیا سے سرمایہ داری کے اثرات کی یلغار کے خلاف ایک حفاظتی اقدام تھا۔ اگر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ملکوں کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ ایک وقت میں اپنی ملکی منڈی کا دفاع کرنے کیلئے وہ تحفظاتی پالیسیوں

(Protectionism) کا سہارا لیتے تھے اور آزاد تجارت محض بعد کے مراحل میں وہاں کی بورژوازی کی پسندیدہ پالیسی بنی۔ حتیٰ کہ جب برطانوی بورژوازی اپنی صنعت کو ترقی دے رہی تھی تو اس نے بھی اپنی منڈی کی حفاظت کی۔ جب انہوں نے جدید مقابلے کی صنعت تعمیر کر لی تو پھر انہیں تحفظاتی پالیسی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ان کی صنعت اتنی طاقتور ہوگئی کہ وہ عالمی منڈی پر غلبہ حاصل کر لے۔ جیسا کہ مارکس اور اینگلز نے بورژوازی کا حوالہ دیتے ہوئے ''کمیونسٹ مینی فسٹو'' میں لکھا تھا ''اجناس کی کم قیمتیں وہ بھاری توپ خانہ ہے جن کے ساتھ وہ تمام تر دیوار ہائے چین گرا دیتی ہیں۔''

سرد بدلاؤ؟ (Cold Transition)

اب یہ بات واضح ہے کہ سرمایہ داری کی طرف سفر جاری ہے لیکن یہ کس طرح ہوا ہے؟ اب تک کوئی مسلح ردِ انقلاب نہیں ہوا نہ ہی بیوروکریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان کوئی بڑا تصادم ہوا ہے۔ ٹراٹسکی نے ایک بار اصلاح پسندی کی ایسی فلم کا تصور پیش کیا تھا جو الٹی چلائی جا رہی ہو۔ اس نے وضاحت کی تھی کہ ایک ردِ انقلاب کے وقوع پذیر ہونے کیلئے کسی نہ کسی قسم کا پرتشدد تصادم ناگزیز ہوتا ہے۔ صرف اسی صورت میں سرمایہ داری کی طرف واپسی ممکن ہوگی۔ اس کی مراد یہ تھی کہ ''اصلاحات کر کے'' نظام کو سرمایہ داری میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔

ٹراٹسکی 1930ء کی دہائی کے روس کی بات کر رہا تھا جہاں ابھی تک انقلابی روایات کا تسلسل کسی حد تک جاری تھا۔ روس کے محنت کش طبقے نے انقلاب میں ایک کلیدی کردار ادا کیا تھا اور اسے اس بات کا شعور تھا کہ سرمایہ داری کی طرف واپسی کا مطلب کیا ہے اور یہ کہ محنت کش طبقہ سرمایہ دارانہ بحالی کی مزاحمت کرتا۔ خود بین الاقوامی صورتحال بھی سوویت یونین کے اندر طاقتوں کا ایک مختلف توازن پیش کر رہی تھی۔ بیوروکریسی کی ایک اچھی خاصی پرت کے مفادات ریاستی منصوبہ بند معیشت کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

تاہم سوویت یونین کے اندر سٹالنزم کئی دہائیوں تک چلتا رہا۔ غالباً اس سے کہیں زیادہ عرصہ تک جتنا خود ٹراٹسکی کا اندازہ تھا۔ یہ 70 سال پر محیط تھا۔ مقداری تبدیلیاں معیاری تبدیلیوں کو متعین کرتی ہیں۔ اس عرصے میں محنت کش طبقے اور انقلابی روایات کے درمیان دوریاں بڑھتی گئیں۔ جو نسل انقلاب کے تجربے سے گزری تھی اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ نئی نسلوں نے جو کچھ دیکھا

تھا وہ ایک مختلف قسم کی بیوروکریسی تھی جو خود کو عوام سے زیادہ سے زیادہ بلند کرتی جا رہی تھی۔ انہیں ہر سطح پر بدانتظامی، ضیاع اور بدعنوانی کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور بالآخر وہ محض ایک ایسے نظام کا سامنا کر رہے تھے جو زمین بوس ہو رہا تھا۔ بعض اوقات کوئی حکومت اتنی بوسیدہ ہو چکی ہوتی ہے کہ جب نیچے سے کسی معمولی تحریک کے پھٹنے سے معمولی سا دباؤ بھی پڑتا ہے تو حکمران طبقہ یا حکمران پرت اس کی مزاحمت کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔

سرمایہ داری کی بنیادیں استوار کرنے کیلئے بورژوا انقلاب ضروری ہوتا ہے۔ اس خیال کی جڑیں 1789ء کے فرانسیسی انقلاب اور کسی حد تک 1649ء کے انگلستانی کرامویل انقلاب کے تجربے میں پیوست ہیں۔ جاگیرداری کی حدود کے اندر رہتے ہوئے دولت ذخیرہ کر کے بورژوازی نے ترقی پائی تھی اور آخر کار اس کو ان حدود کو توڑنا پڑا۔ نوخیز بورژوا طبقے نے جاگیردار اشرافیہ کے مقابلے میں قوم کی قیادت کی اور جاگیرداری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اس سے ان حالات نے جنم لیا جن کی وجہ سے جدید سرمایہ داری نے ترقی پائی۔ لیکن جب ایک بار چند ایک کلیدی ممالک (برطانیہ، فرانس، امریکہ وغیرہ) میں سرمایہ داری نے ترقی کر لی تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ ان ممالک میں سرمایہ داری نے جس طرز پر ترقی کی تھی اس طرز کو اسی انداز میں کم ترقی یافتہ ملکوں میں دہرانا ناممکن ہو گیا۔ مارکس نے جرمنی کے ضمن میں اس چیز کو بھانپ لیا تھا جس کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ جرمن بورژوازی اقتدار حاصل کرنے سے پہلے ہی رجعتی ہو گئی تھی۔

منشویکوں کو اس مسئلے کی سمجھ نہیں تھی۔ انہیں توقع تھی کہ تمام ممالک انہی مراحل سے گزریں گے۔ روس ایک پسماندہ ملک تھا جہاں کسانوں کی بھاری تعداد اور جاگیرداری نظام تھا۔ یوں جو کچھ فرانس اور برطانیہ میں ہوا وہ میکانکی انداز میں اس کا اطلاق روس پر جبراً کر رہے تھے۔ اس لئے ان کے نزدیک روسی کمیونسٹوں کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ''ترقی پسند بورژوازی'' کی حمایت کریں۔ ان کو اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی جو ٹراٹسکی نے ''مسلسل انقلاب'' کے نظریہ میں کی تھی۔ سامراجیت کے عہد میں پسماندہ ملکوں میں بورژوازی وہ ترقی پسندانہ کردار ادا کرنے سے قاصر تھی جو اس نے فرانس، برطانیہ اور دوسرے یورپی اور ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں ادا کیا۔

اس سے یہ وضاحت بھی ہوتی ہے کہ دیگر ملکوں میں سرمایہ داری کی ترقی اس کلاسیکی میکانزم کے ذریعے کیوں نہ ہوئی جس کے تحت ایک بورژوا انقلاب میں بورژوازی نے قوم کی قیادت کرنا تھی۔ مثال کے طور پر جرمنی یا جاپان میں سرمایہ داری اس طریقے سے وجود میں نہیں آئی۔ آج

کے عہد میں ان دو ملکوں کا دنیا کے طاقتور ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔
جاپان میں جاگیردارانہ ریاست کی بیوروکریسی امریکی سرمایہ داری کے دباؤ کے زیر اثر تحریک کو سرمایہ داری کی طرف لے گئی۔ اس سے ہمیں اس وقت کی بورژوازی کی کمزوری اور لاغرپن کا پتہ چلتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ عالمی سطح پر ہونے والی پیش رفت کو تمام عوامل پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے جاپان کے مستقبل کی واضح ضمانت یہ تھی کہ وہ سرمایہ داری کو ترقی دیں۔ چونکہ جاپان کی بورژوازی اپنا تاریخی فریضہ ادا کرنے سے قاصر تھی اس لئے ایک دوسرے طبقے نے یہ فرائض سرانجام دیئے۔ جرمنی میں پرانی جاگیردارانہ ریاست کے جنکروں نے اسی طرز کے ایک عمل کی قیادت کی تھی۔ لیکن چونکہ کوئی انقلاب نہیں ہوا تھا اس لئے وہاں جاگیردارانہ نظام کی باقیات موجود تھیں۔ جرمنی میں آخر کار یہ تضادات اس وقت ختم ہوئے جب 1918ء میں وہاں ایک نامکمل اور خون میں ڈبو دیا جانے والا پرولتاری انقلاب ہوا جس نے کم از کم بورژوا انقلاب کے نامکمل فریضوں کی تکمیل کی تھی۔ یہی کام جاپان میں 1945ء کے بعد امریکہ کی قابض فوجوں نے کیا تھا۔ جنرل ڈگلس میکارتھر نے جاپان میں زرعی انقلاب فوجی طاقت کے جبر کے تحت کیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ چین کے انقلاب کے جاپانی عوام پر اثرات مرتب ہو سکتے ہیں اور یہ سرخ آندھی سارے مشرق کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

ان مثالوں میں کوئی بورژوا انقلاب نہیں بلکہ ایک نظام سے دوسرے کی طرف ایک ''سرد تبدیلی'' ہوئی۔ لینن اس بات پر زور دے رہا تھا کہ تاریخ میں ہر طرح کا تغیر اور تبدیلی ممکن ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ زندہ و جاوید حقیقی عوامل ہر لحاظ سے نصاب کی کتابوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ سماجی تبدیلی کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی کڑا قانون نہیں۔ مارکسزم ایسی ہی آگاہی اور ادراک فراہم کرتا ہے جو ایک میکانکی طرزِ فکر کی بجائے تمام اطراف اور زاویوں کے تناظر میں کسی عمل کا اس کی تبدیلی اور تغیر کی کیفیت میں تجزیہ پیش کر سکے۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ''سرد تبدیلی'' کے حوالے سے ٹراٹسکی کی طرف سے اٹھائے گئے خیالات کو ہم تاریخ کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھیں۔ ٹراٹسکی کے خیالات اس حوالے سے بصیرت افروز ہیں کہ کس طرح بیوروکریسی بڑی آسانی کے ساتھ سرمایہ دارانہ بحالی کے حق میں چلی جائے گی۔ اس نے وضاحت کی تھی کہ اگر سوویت یونین میں سرمایہ دارانہ استواری کا بورژوا ردانقلاب ہوا تو حکمران طبقے کو ریاست کے اندر سے اس سے کہیں زیادہ کم

عناصر کی تطہیر کرنا پڑے گی جتنی کہ ایک سیاسی انقلاب کی شکل میں ہوگی۔
جب یلسن اقتدار میں آیا تو پرانی سوویت بیوروکریسی کے ساتھ ٹھیک یہی ہوا اور چین کی بیوور کریسی کوئی مختلف چیز نہیں۔ ''انقلاب سے غداری'' میں ٹراٹسکی کے اصل الفاظ یہ تھے:

''اگر، ایک دوسرے مفروضے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے، ایک سرمایہ دارانہ پارٹی نے سوویت یونین کی حکمران پرت کا دھڑن تختہ کیا تو اسے موجودہ بیوروکریٹوں' ناظمین' ٹیکنیشنوں' ڈائریکٹروں' پارٹی کے سیکرٹریوں اور عمومی طور پر مراعات یافتہ بالائی پرتوں میں بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو پہلے ہی ان کو اپنی خدمات پیش کرنے پر تیار ہوں گے۔ اس صورت میں بھی بلاشبہ ریاستی اپریٹس کے اندر تطہیر کی ضرورت ہوگی۔ لیکن سرمایہ دارانہ بحالی کے نتیجے میں جن لوگوں کی تطہیر کی جائے گی وہ انقلابی پارٹی کی طرف سے کی جانے والی تطہیر کے مقابلے میں کم ہوں گے۔ نئی حکومت کا بڑا فریضہ یہ ہوگا کہ ذرائع پیداوار میں نجی ملکیت بحال کی جائے۔ سب سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ کمزور اجتماعی فارموں کے اندر سے طاقتور کسان پیدا کیے جائیں اور طاقتور اجتماعی فارموں کو بورژوا طرز کے پیداواری کوآپریٹوز میں بدل کر زرعی سٹاک کمپنیوں میں بدل دیا جائے۔ صنعت کے شعبے میں نجکاری کا آغاز ہلکی اور اشیائے خوردونوش کی صنعتوں سے ہوگا۔ عبوری دور میں منصوبہ بندی کے اصول کو ریاستی طاقت اور انفرادی ''کارپوریشنوں''، امکانی مالکان یعنی سوویت یونین کی صنعت کے کرتے دھرتے لوگوں' سابق جلاوطن مالکان اور غیر ملکی سرمایہ دار کے درمیان سمجھوتوں کے ایک پورے سلسلے سے بدل دیا جائے گا۔ قطع نظر اس بات کے کہ سوویت بیوروکریسی سرمایہ دارانہ بحالی کے راستے پر بہت آگے جا چکی ہے نئی حکومت کو ملکیت کی شکلوں اور صنعتی طریقوں میں اصلاحات متعارف کروانے کی نہیں بلکہ سماجی انقلاب کی ضرورت ہوگی۔''

سوویت یونین کی سماجی بنیادیں ایک مزدور ریاست کے کردار کی حامل تھیں جس میں مرکزیت اور ریاستی ملکیت پر مبنی منصوبہ بند معیشت تھی لیکن اگر یہ ریاست بھی اس وقت ایک سرمایہ دارانہ ریاست میں تبدیل ہو جاتی تو زیادہ لوگوں کی تطہیر کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ پہلے سے مراعات یافتہ لوگ تھے اور وہ ایک مزدور ریاست کے مراعات یافتہ بیوروکریٹوں سے سرمایہ داری کے مراعات یافتہ خادم بن جاتے۔ اس کے برعکس ایک سیاسی انقلاب کی صورت میں ان میں سے کئی ایک بیوروکریٹوں پر مزدور کی اجرت کا قانون لاگو کیا جاتا اور ان کی مراعات

ختم کر دی جاتیں۔اس کے نتیجے میں ایک بڑا تصادم سامنے آ سکتا تھا۔روس کے موجودہ حالات نے ٹراٹسکی کو درست ثابت کیا ہے۔

ٹراٹسکی کے سوویت یونین کے تجزیے میں ایسی اہم چیزیں موجود ہیں جن سے ہمیں آج کے چین کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔یہاں بھی ہمارا واسطہ ایک مراعات یافتہ پرت سے ہے جو، جیسا کہ ٹراٹسکی نے زور دیا تھا، کسی مخصوص لمحے اپنی مراعات کو ضمانت فراہم کرنے کیلئے ذرائع پیداوار کی مالک بن سکتی ہے۔

کئی ایک ایسے عوامل ہیں جو چینی بیوروکریسی کو اس سمت میں لے گئے ہیں۔دوسری عالمی جنگ کے بعد مغرب کے سرمایہ دارانہ ملکوں میں بہت بڑا معاشی ابھار تھا جس سے پیداواری قوتوں کو بے پناہ ترقی نصیب ہوئی۔اس کے بعد مشرقی یورپ اور سوویت یونین کے اندر انحطاط کا آغاز ہوا۔ٹیڈ گرانٹ نے 1970ء کی دہائی کے آغاز میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔چین کے بیوروکریٹوں نے بھی اس کو مدِ نظر رکھا۔سوویت یونین کی شرحِ نمو کم ہو کر 3% پھر 2% اور پھر صفر ہو گئی۔نظام جمود کا شکار ہو رہا تھا۔بالآخر مشرقی یورپ انہدام کا شکار ہو گیا اور دو سال بعد سوویت یونین بھی منہدم ہو گیا۔سوویت یونین اپنے بہت سے علاقوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

یہ طاقتور عوامل تھے جن سے چین کے بیوروکریٹوں کے افکار کا تعین ہوا۔بنیادی طور پر انہوں نے چینی طرز کی نئی معاشی پالیسی (NEP) سے آغاز کیا اور وہ معیشت کو زیادہ سے زیادہ کارگر اور زیادہ پیداوار کا حامل بنانا چاہتے تھے۔وہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کو دیکھ رہے تھے اور یہ واقعات انہیں ایک مخصوص سمت میں لے جا رہے تھے۔اپنی سرحد کے پار ہی انہیں سوویت یونین میں مکمل افراتفری اور بربادی نظر آ رہی تھی۔غالباً وہ سوچ رہے ہوں گے کہ ''ہم یہاں ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ہم یہاں منڈی کی اصلاحات متعارف کروائیں گے لیکن ہم خود اس عمل کو کنٹرول کریں گے۔'' یوں انہوں نے یہ کام رفتہ رفتہ قدم بہ قدم کیا لیکن جب ایک بار وہ اس راہ پر چل نکلے تو آگے اس عمل کی اپنی ہی ایک منطق تھی جس کا آخری نتیجہ موجودہ صورتحال کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

اس وقت چین میں انتہائی گہرے سرمایہ دارانہ مفادات ہیں۔نوزائیدہ سرمایہ دار طبقہ اپنے طبقاتی مفادات کے تحفظ کیلئے کمیونسٹ پارٹی کو استعمال کر رہا ہے۔یہ عمل اس حد سے آگے نکل گیا ہے جہاں سے اسے بغیر کسی بڑے تصادم کے واپس موڑا جا سکتا تھا۔

ہمیں ایک ''زوال پذیر مزدور ریاست'' اور ایک ''مسخ شدہ مزدو
ریاست'' کے درمیان فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یقیناً ایک زوال پذیر مزدور ریاست بھی ایک مسخ شدہ مزدور ریاست کی شکل میں وجود پذیر ہوتی ہے۔ لیکن تاریخ کی واحد ''زوال پذیر مزدور ریاست'' سوویت یونین تھی۔ اس کا آغاز نسبتاً ایک صحت مند مزدور ریاست کی حیثیت سے ہوا تھا اور انقلاب کے تنہا رہ جانے کی وجہ سے اس میں زوال پذیری کا آغاز ہوا جب بیوروکریسی نے اقتدار پر قبضہ جما لیا۔ اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے سٹالنسٹ بیوروکریسی کو ایسے ہزاروں لاکھوں کمیونسٹوں کا قلع قمع کرنا پڑا جو اس بات سے آگاہ تھے کہ بالشویکوں نے جو کچھ تعمیر کرنے کیلئے جدوجہد کی تھی اس میں اور اس بے ہودہ جعلسازی میں کتنا فرق تھا جو ایک پسماندہ ملک کے اندر انقلاب کے تنہا رہ جانے کے نتیجے میں پنپ کر سامنے آئی تھی۔

چین میں کوئی بھی دور ایسا نہیں آیا جب وہاں کی ریاست صحت مند مزدور ریاست رہی ہو۔ وہاں کبھی بھی حقیقی مزدور جمہوریت یا مزدور اقتدار قائم نہیں ہوا۔ جس دن کمیونسٹ پارٹی چین کے ریاستی اقتدار پر براجمان ہوئی اسی دن سے یہ ایک مسخ شدہ مزدور ریاست تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کو پرانی ''مینڈرین'' ریاست کا ڈھانچہ ورثے میں ملا تھا۔ حتیٰ کہ سوویت روس کے ابتدائی ایام میں لینن نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر آپ مزدور ریاست کی ظاہری سطح کو کھرچیں گے تو آپ کو وہی پرانا زار شاہی کا ریاستی ڈھانچہ نظر آئے گا کیونکہ خاص کر ایک پسماندہ ملک میں نئی ریاست کو پرانی ریاست کے بہت سے اہلکاروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ تاہم لینن کے دور میں مزدور اپنی طاقت کے آلہ ہائے کار یعنی سوویتوں کے ذریعے اس پرت کے رجعتی رجحانات پر کسی حد تک باڑ لگانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن چین میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

اس کے باوجود اگرچہ مسخ شدہ شکل ہی میں سہی پارٹی کے اندر ناگزیر طور پر ایسے عناصر ہوں گے جو چین کے اندر سرمایہ داری کی طرف سفر کو خوف کے عالم میں دیکھ رہے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح مزدوروں کے حقوق چھینے جا رہے ہیں اور انقلاب کی تمام تر آدرشوں کو پاؤں کے نیچے مسل دیا گیا ہے۔ وہ ماؤاسٹ چین کی طرف واپسی کے خواہشمند ہیں جو ان کے خیال میں کہیں زیادہ ''مساوات'' پر مبنی تھا۔ لیکن آج کے عہد میں ایک دیوہیکل پرولتاریہ پروان چڑھ چکا ہے اس لئے آج کے مزدوروں کیلئے ماؤ کے اس نظریے کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی کہ ہر چیز کیلئے کسانوں کو بنیاد بنایا جائے۔ آج چین کا پرولتاریہ ایک غالب قوت بن چکا ہے اس لئے شہروں کے مزدور جو

''ماؤ کی طرف واپسی'' کے ذریعے نجات کی کسی راہ کے متلاشی ہیں وہ مجبوراً مزدور اقتدار کا مسئلہ اٹھائیں گے۔ اس طرح کی پیش رفت کے پارٹی پر اثرات مرتب ہوں گے جو ناگزیر طور پر طبقاتی بنیادوں پر ٹوٹ جائے گی۔

تاہم اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ بیوروکریسی کی بالا پرتوں میں کسی ایسے دھڑے کا وجود ہے جو سابقہ دور کی ریاستی ملکیت والی مرکزیت پر مبنی منصوبہ بند معیشت کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہو۔ بیوروکریسی کے نقطہ نظر کے مطابق نظام ''کام کر رہا'' ہے۔ اور درحقیقت یہ بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ ہم نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے کہ ٹراٹسکی نے بیوروکریٹوں کی مراعات اپنی نسلوں کو منتقل کرنے کے بارے میں کیا کہا تھا۔ آج بیوروکریٹوں کے بہت سے بیٹے اور بیٹیاں ذرائع پیداوار کے مالک بن چکے ہیں۔ اس پرت کے اندر قومی منصوبہ بند معیشت کی طرف لوٹنے کی کوئی خواہش نہیں۔ ایسی کسی خواہش کی ان کے پاس کوئی مادی بنیادیں نہیں ہیں۔ وہ ایسی کسی بھی کوشش کی مزاحمت کریں گے اور انہیں ریاست کی آشیر باد حاصل ہوگی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ فوج کے اعلیٰ عہدیدار بھی جائداد کے مالک بن چکے ہیں۔ اس لئے ''افراد کے مسلح جتھوں'' کے اندر افسروں کی پرت کے مادی مفادات بھی ان نئے ملکیتی رشتوں سے وابستہ ہیں جو اب قائم ہو چکے ہیں۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر چین

اکیسویں صدی کے آغاز پر چین، امریکہ، جاپان اور جرمنی کے بعد چوتھی بڑی عالمی معاشی طاقت بن چکا تھا اور امریکہ اور جاپان کے بعد صنعتی اشیاء بنانے والا تیسرا بڑا ملک تھا۔ 2004ء میں دنیا میں استعمال ہونے والی کل کنکریٹ کا نصف چین میں استعمال ہوا۔ چین اب نہ صرف فوجی حوالے سے، جو یہ پہلے ہی تھا، بلکہ معاشی حوالے سے بھی ایک بڑی طاقت بنتا جا رہا تھا۔

شروع میں غیر ملکی سرمایہ داروں کا خیال تھا کہ وہ چین کو اپنی منڈی کھولنے پر مجبور کر دیں گے اور پھر وہاں اپنی اشیاء کے ڈھیر لگا دیں گے۔ تاہم چین میں ہونے والی پیش رفت سامراجیوں کی توقعات کے برعکس ہوئی۔ چین برآمدات کرنے والے بڑے ممالک میں شامل ہو گیا۔ تجارتی اشیاء میں امریکہ کا چین کے ساتھ خسارہ 205 ارب امریکی ڈالر کی ریکارڈ حد تک پہنچ چکا تھا۔ ان کی شکایت تھی کہ چین ضرورت سے زیادہ برآمدات کر رہا ہے۔ وہ امریکہ، یورپ اور ساری دنیا میں برآمدات بھیج رہا تھا۔ اس دوران وہ ہر وقت ایسے محصولات لاگو کرنے کی بات کرتے تھے جن سے

چین کی برآمدات کو محدود کیا جا سکے۔لیکن چین کے مال پر روک لگانے کیلئے انہیں بہت زیادہ محصولات عائد کرنا پڑتی تھیں جو وہ نہیں کر سکے کیونکہ چین کی پیداواری صلاحیت کا معیار بہت اعلیٰ اور اس کی اشیاء انتہائی سستی ہیں۔

پیداواری قوتوں کی بے انتہا ترقی' معیشت میں دیوہیکل تبدیلی اور سرمایہ دارانہ تعلقات کے استحکام کے ساتھ یہ بات منطقی ہو جاتی ہے کہ چین ایک سامراجی ملک کا رویہ اختیار کرے گا۔ چین خام مال درآمد کر رہا تھا اور صنعتی اشیاء اور سرمایہ برآمد کر رہا تھا۔اس دوران تیل کی قیمتوں میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چین کے اندر تیل کی بے تحاشا مانگ تھی جواب تیل استعمال کرنے والا دنیا کا دوسرا بڑا ملک تھا اور یہ خام لوہا، سیسہ، باکسائیٹ، ٹمبر، زنک، میگانیز، ٹن اور سویا بین بھی بڑی تعداد میں درآمد کر رہا تھا۔

اس دوران چین میں معیشت کی دیوہیکل بڑھوتری کا ایک اور پہلو یہ بھی تھا۔ پیداواری قوتوں کی بے انتہا ترقی کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ بھی بہت زیادہ طاقتور ہوا۔ ہر سال 2 کروڑ افراد ہجرت کر کے شہروں کی طرف گئے۔شہری علاقوں میں بہت بڑی ترقی سے چین میں بہت تیز رفتار تبدیلی رونما ہوئی ہے کیونکہ دیہات کے غریب کسان غربت سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ 2006ء میں آبادی کا 40 فیصد شہروں میں رہتا تھا۔چین کے 166 شہر ایسے تھے جن کی آبادی 10 لاکھ سے زائد ہے۔رجحان دیکھ کر اندازہ لگایا گیا کہ آئندہ 15 سالوں کے دوران توقع ہے کہ 30 کروڑ افراد شہروں میں منتقل ہو جائیں گے۔چین میں تعمیرات کی صنعت میں ابھار تھا۔محض تعمیرات کی صنعت سے 3 کروڑ 80 لاکھ افراد وابستہ تھے۔80 سے زائد شہروں میں وہ زیر زمین ٹرانسپورٹ کے نظام تعمیر کر رہے تھے۔اس سے معیشت پر یہ اثر پڑا کہ لوہے، کنکریٹ وغیرہ کی مانگ میں اضافہ ہو گیا۔اس سے چین کے سماج میں پرولتاریہ کی تعداد میں ایسا اضافہ ہوا ہے جو پہلے کبھی کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔

2006ء کے ایک اندازے کے مطابق آئندہ 15 برسوں میں شہری آبادی 80 کروڑ تک پہنچ جائے گی۔تاریخی طور پر یہ پرولتاریہ کا سب سے بڑا ارتکاز تھا۔ایک بے مثال مظہر۔ یہ تاریخ میں اپنی طرز کی سب سے بڑی تحریک تھی اور اس سے تاریخ کا سب سے بڑا پرولتاری طبقہ وجود میں آیا۔ یہ دنیا کا طاقتور ترین پرولتاری طبقہ بن جائے گا۔

شہروں کی طرف ہجرت کرنے والے کسان دیہات میں کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اجتماعی زرعی فارم برباد ہوگئے۔ یہاں صحت، پنشن وغیرہ جیسی مراعات کا ایک پورا سلسلہ موجود تھا۔ لیکن سرمایہ دارانہ بحالی کے عمل میں چین کی دیہی آبادی کے دو تہائی حصے پنشن اور دوسری حاصلات سے محروم ہوتے گئے۔ اس لئے وہ شہروں میں ملازمت کے متلاشی تھے۔

ہم اس مظہر کو پہلے بھی دیکھ چکے ہیں جب لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا سے لوگ ہجرت کر کے امریکہ اور یورپ گئے۔ وہ بدترین ملازمتیں کرنے پر تیار تھے اور انتہائی خراب حالات میں زندگی بسر کرتے رہے لیکن کم از کم ان کی کچھ نہ کچھ آمدن تھی جو وہ واپس اپنے گھروں کو بھیج سکتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ غربت سے فرار حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ اس کے باوجود وہ بمشکل گزر بسر کر رہے تھے۔ وہ آج چین میں جو بے انتہا دولت پیدا کر رہے ہیں اس کا ثمر انہیں بہت کم ملتا ہے۔ مستقبل میں اس صورتحال کے اندر انقلابی تحریکوں کا امکان پوشیدہ ہے۔

اس تمام تر عمل کا ترقی پسندانہ پہلو یہ ہے کہ اس سے کروڑوں کی تعداد میں سرمایہ داری کے ''گورکن'' یعنی پرولتاریہ پیدا ہوئے۔ اس حوالے سے صنعتی ترقی عمومی طور پر ایک ترقی پسندانہ عمل ہے۔ اس سے ایک ایسا طبقہ جنم لے رہا ہے، اگرچہ بہت بھاری قیمت چکا کر، جو سماج کی تبدیلی کا فریضہ سرانجام دے گا۔ شہروں میں محنت کش طبقے کے بہت بڑے بڑے علاقے وجود میں آ رہے ہیں جہاں بے انتہا تضادات کا ارتکاز ہو رہا ہے۔

اگرچہ اس دوران چین میں سرمایہ داری بہت تیزی سے ترقی کرتی رہی ہے پھر بھی منصوبہ بند معیشت کا قلع قمع ایک رجعتی قدم تھا۔ اگر مزدوروں کی حقیقی جمہوریت پر مبنی ایک حکومت ہوتی تو باآسانی نہ صرف اس معاشی ترقی کے مقابلے میں ترقی کی جا سکتی تھی بلکہ اس سے کہیں آگے جایا جا سکتا تھا اور شرحِ نمو کے عدم توازن اور بے ہنگم پن اور سماجی پولرائزیشن سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی۔

2006ء میں بھی جب شرحِ نمو بہت تیز رفتاری سے بڑھ رہی تھی تو مختلف طبقوں، شہروں اور دیہاتوں، سرمایہ داری کے مخصوص زونوں اور ریاستی ملکیت میں چلنے والے صنعتی زونوں کے درمیان بے انتہا پولرائزیشن تھی۔ سماجی تفریق کا کوئی انت نہیں تھا۔ شہروں کے 10 فیصد امیر ترین لوگوں کے پاس دولت کا 45 فیصد جب کہ 10 فیصد غریب ترین لوگوں کے پاس صرف 1.4 فیصد تھا۔ ایک طرف ایک نیا بورژوا طبقہ پیدا ہو رہا تھا جبکہ بیروزگاروں کی تعداد 20 کروڑ تک پہنچ چکی تھی۔

چین کے اندر مختلف علاقوں پر غیر مساوی ترقی کے بھی اثرات مرتب ہوئے۔ ان میں کچھ

علاقے اس ترقی سے فیض یاب نہیں ہوئے جو ساحلی اور مشرقی بحرالکاہل کے ساحل کے علاقوں میں ہو رہی تھی۔ اس غیر مساوی ترقی کے پیش نظر چین میں قومی سوال کے پھٹ پڑنے کا خدشہ موجود ہے۔ چین میں 10 کروڑ افراد کا تعلق اقلیتی قومیتوں سے ہے۔ (ان میں تبتی، ترکمانی، منگول، یوغر شامل ہیں) اور پولیس کے ساتھ مسلسل جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح کی پولرائزیشن میں قومی سوال تیزی کے ساتھ دوبارہ ابھر کر سامنے آ سکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ معاشی ترقی سے کچھ لوگوں کا معیارِ زندگی بہتر ہوا لیکن اس عمل کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ معاشی ترقی نے استحکام کی ضمانت فراہم کرنے کی بجائے مزدوروں میں زیادہ جنگجوانہ جذبات اور سماجی اضطراب کو جنم دیا۔ اس کا بڑا سبب زندگی اور کام کے حالات اور وہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعے دولت تقسیم ہو رہی ہے۔ عوام کو ان بیوروکریٹوں سے نفرت ہے جو ان کی تمام تر حاصلات کو برباد کر رہے ہیں۔

چین میں مزدوروں کے حالات زندگی وہی ہیں جو برطانیہ کے مزدوروں کے 19ویں صدی میں تھے جیسا کہ فریڈرک اینگلز نے انہیں مفصل طور پر بیان کیا تھا۔ پوری دنیا میں کان کنی میں ہونے والی کل اموات کی 80 فیصد چین میں ہوتی ہیں۔ جبکہ دنیا کے کل کوئلے کا صرف 30 فیصد چین میں پیدا ہوتا ہے۔ 1991ء میں کام کی جگہوں پر حادثات کی وجہ سے 80 ہزار مزدور ہلاک ہوئے۔ 2003ء میں یہ تعداد تیز رفتار اضافے کے ساتھ 4 لاکھ 40 ہزار ہو گئی۔ محنت کش طبقے پر دباؤ ناقابلِ یقین حد تک بڑھ گیا۔ یہ کوئی خوش وخرم مستحکم سماج نہیں ہے جو ایک پرآسائش مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہو۔ 20 سے 35 سال کی عمر کے لوگوں میں اموات کا سب سے بڑا سبب خودکشی تھی۔ اس بلند ترین شرحِ نمو میں بھی ہر سال 20 لاکھ 50 ہزار افراد خودکشی کرتے تھے۔ اور ان سے ہٹ کر سالانہ 25 لاکھ سے 35 لاکھ تک دیگر افراد خودکشی کی کوشش کر رہے تھے۔ کروڑوں لوگ روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بڑے بڑے مظاہرے ہو رہے تھے لیکن سرمایہ داری کی طرف سفر بے رحمی سے جاری رہا۔

چین میں جو کچھ ہوا اس کی روس کے اندر سرمایہ داری کی ابتدائی ترقی کے ساتھ گہری مماثلت ہے جو 100 سے زائد سال پہلے وہاں ہوئی تھی۔ پرانے زرعی کمیونوں کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد 19ویں صدی کے آخر میں صنعت نے جو ترقی کی اس کے ساتھ ایک تازہ دم پرولتاریہ وجود میں آیا جو دیہات چھوڑ کر آئے تھے۔ پرولتاریہ کے وجود میں آنے اور اس عمل کے نتیجے میں

جوخوفناک حالات پیدا ہوئے ان کے سبب پہلے 1905ء کا انقلاب اور پھر اکتوبر انقلاب ہوا۔ اس وقت چین میں طبقاتی کشمکش کے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور اس کا نتیجہ بھی ویسا ہی یعنی ایک وسیع تر انقلابی بغاوت کی صورت میں برآمد ہوگا۔

پہلے ہی بہت سخت اور جرات مندانہ ہڑتالیں جاری ہیں۔ 2000ء میں ہر طرح کے لیبر تنازعات میں 12.5 فیصد، 2001ء میں 14.4 فیصد اضافہ ہوا۔ 1999ء میں 7000 ''متحدہ اقدامات'' (جیسا کہ وہ انہیں کہتے ہیں) ہوئے جو عمومی طور پر ہڑتالیں یا کام آہستہ کر دینے کے اقدامات تھے جن میں بحیثیت مجموعی 250,000 افراد نے حصہ لیا۔ یہ 1992ء سے لے کر 2002ء تک 900 فیصد کا اضافہ ہے جو ہر سال 20 فیصد کے حساب سے اضافہ بنتا ہے۔ اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ معاشی ترقی میکانکی انداز میں سماجی استحکام میں نہیں بدلتی۔ ایسے ممالک میں دراصل صورتحال اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔

باب 11

چینی سامراج؟

ناہموار سرمایہ دارانہ استواری اور معیشت کے وسعت اختیار کرنے سے چین کا سامراجی کردار اپنانے کے عمل میں داخل ہونا ناگزیر اقتصادی قانون تھا۔ نائیجیریا کے ریاستی مرکزی بینک کے سابق گورنر لامیڈو ساناوسی نے 10 جنوری 2015ء کو بیان دیا ہے کہ ''ہم اپنے آپ کو ایک نئے قسم کے سامراج کے سامنے کھول رہے ہیں۔ اس میں چین افریقہ سے خام مال سستے داموں حاصل کرتا ہے اور ان سے تیار کردہ مصنوعات واپس بھیجتا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ہنر اور ٹیکنالوجی برآمد نہیں کرتا۔'' سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چین کا سامراجی ہونا کس حد تک بڑھ چکا ہے اور اس سامراجی کردار کے داخلی اور خارجی مضمرات کیا ہیں؟ چین دنیا بھر میں سرمایہ برآمد کرنے کے ساتھ ساتھ خام مال اور دیگر مفادات کے تحفظ کے لیے عالمی سیاست کے ایک اہم کھلاڑی کے طور پر بھی ابھرا ہے۔ چین جہاں لاطینی امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا سے خام مال درآمد کر رہا ہے وہاں سرمائے کی برآمد سے ان براعظموں کی سیاست اور معیشت پر بھی گہرے انداز میں اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ صورتحال دیگر سامراجی قوتوں سے ٹکراؤ کا باعث بن رہی ہے جس میں امریکہ سرِ فہرست ہے۔ لیکن عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ ہونے کے باعث امریکہ اور چین کے مفادات جہاں ایک دوسرے سے متصادم ہیں وہاں جڑے بھی ہوئے ہیں۔ چین امریکہ کو برآمدات کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ 2014ء میں امریکہ کا کل تجارتی خسارہ 500 ارب ڈالر سے زائد تھا جس میں 342 ارب ڈالر سے زائد خسارہ چین سے تھا۔ ایسے میں اگر امریکی معیشت گراوٹ کا شکار ہوتی ہے تو چین کی معیشت بھی بحران میں چلی جائے گی۔ اس کے علاوہ دنیا میں امریکی ڈالر کے سب سے زیادہ ذخائر چین کے پاس ہیں جن کا حجم 4 کھرب ڈالر کے قریب پہنچ

چکا ہے۔امریکی ڈالر کو پہنچنے والا نقصان چین کی معیشت کو بڑے دھچکے لگا سکتا ہے۔دوسری جانب سینکڑوں امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی چین میں بھاری سرمایہ کاری موجود ہے۔ چین کی سستی اور ہنر مند محنت سے وہ اپنے منافعوں میں تیزی سے اضافہ کر رہے ہیں۔چین میں موجود امریکی چیمبر آف کامرس کی ممبر کمپنیوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے جبکہ 3500 سے زائد افراد انفرادی طور پر اس کے ممبر ہیں۔دوسری جانب چین کی جانب سے امریکہ میں ہونے والی سرمایہ کاری میں تیزی آ رہی ہے اور 2014ء میں 12 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی گئی۔اس صدی کے دوران اب تک چین کی جانب سے امریکہ میں 47.5 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی جا چکی ہے۔

لیکن اس تمام تر تجارت اور کاروبار میں معاشی رقابت بھی اپنی جگہ موجود ہے۔امریکی حکومت پر مسلسل دباؤ ہے کہ چین کے ساتھ تجارتی خسارہ کم کیا جائے۔اس خسارے کی وجہ سے امریکہ میں روزگار کے مواقع میں ہونے والی کمی کو ایک اہم سیاسی ایشو بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔اسی طرح دنیا کے مختلف خطوں میں خام مال اور معدنی وسائل کے حصول اور منڈیوں کی تلاش کے لیے ہونے والے مقابلوں میں چین اور امریکہ کی حکومتیں اپنے ممالک کے سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے مصروف عمل ہیں۔پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی بنیادی وجہ عالمی سطح پر منڈیوں کی تقسیم اور ان پر اجارہ داری کا حصول ہی تھا۔آج بھی امریکہ، چین اور یورپی طاقتیں دنیا بھر میں منڈیوں کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مختلف محاذوں پر برسرِ پیکار ہیں۔طاقتوں کے موجود توازن کے باعث کسی عالمی جنگ کی پیش گوئی تو نہیں کی جا سکتی لیکن چھوٹی جنگوں، تنازعات، پراکسی جنگوں اور خانہ جنگیوں کا تسلسل موجود ہے اور اس میں کمی آنے کا کوئی امکان نہیں۔

کرنسی کی جنگ

امریکی سامراج کے دنیا پر غلبے کے لیے اس کا سب سے بڑا ہتھیار ڈالر ہے۔مختلف ممالک کے مابین ہونے والی تجارت امریکی ڈالروں میں ہی ہوتی ہے۔اسی لیے ہر ملک اپنے غیر ملکی زرِ مبادلہ کے ذخائر میں ڈالر کی بڑی مقدار کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔کسی بھی ملک کی معاشی کیفیت کو جاننے کا ایک اہم معیار وہاں موجود ڈالر کے ذخائر کا حجم ہے۔ڈالر سے پہلے برطانوی

کرنسی پونڈ سٹرلنگ انٹرنیشنل کرنسی تھی۔ اس کی بنیاد 1866ء کے بحران میں رکھی گئی تھی جب Overend Gurney بینک کے تقریباً ایک ارب پاؤنڈ کے دیوالیہ کے بعد عالمی ہیجان کے دوران برطانیہ نے بڑے پیمانے پر قرضے جاری کیے تھے۔ اسی نقشِ قدم پر چلتے ہوئے امریکی فیڈرل ریزرو نے 1929ء کے معاشی بحران کے دوران دوسرے ممالک کے بینکوں سے کرنسی سواپ swap کے ذریعے ڈالر کے سامراجی کردار کو مستحکم کیا تھا۔

2008ء کے معاشی بحران کے بعد چین نے بھی اپنی کرنسی یوان کو عالمی سطح پر مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی قدر میں گراوٹ نہیں کی۔ اس سے پہلے یہ دنیا میں غیر ملکی کرنسی کے طور پر ڈالر کے ذخائر رکھنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کے پاس 4 کھرب ڈالر کے قریب یہ ذخائر موجود ہیں۔ اس حوالے سے چین کے پاس امریکی معیشت کو غیر مستحکم کرنے کی کنجی بھی ہے کیونکہ اتنے بڑے پیمانے پر ڈالر کے ذخائر کو منڈی میں فروخت کر کے امریکی معیشت کو غیر مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے عالمی معیشت عدم استحکام کا شکار ہو جائے گی اور خود چینی معیشت منہدم ہو سکتی ہے۔ اس لیے جہاں چین امریکی سامراج اور ڈالر کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کا خواہاں ہے وہاں وہ اس عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو بھی غیر مستحکم نہیں کر سکتا۔

اسی بنیاد پر چین یوان کو عالمی کرنسی کے طور پر مستحکم کرنے کے لیے متوازن اور محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے لیے جو حربے چینی حکمران استعمال کرنے جا رہے ہیں ان میں کرنسی کی قدر میں کمی بھی شامل ہے۔ 98-1997ء میں ایشیا کے مالیاتی بحران اور پھر 2008ء کے بحران میں چین نے ڈالر کے مقابلے میں اپنی کرنسی کی قدر کو مستحکم رکھا گو کہ اس وقت وہ اس میں بڑی حد تک کمی کر سکتے تھے۔ لیکن اب کرنسی کی قدر میں کمی کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے برآمدات میں اضافہ ممکن ہو گا کیونکہ دیگر ممالک کی اشیا کے مقابلے میں چینی مصنوعات سستی دستیاب ہوں گی۔ دوسرا اس سے درآمدات کی قیمت میں بھی اضافہ ہو گا جس سے تفریطِ زر (Deflation) کے رجحان میں کمی آئے گی۔ لیکن اگر چین ایسا کرتا ہے تو بہت سے ایشیائی ممالک کو بھی اپنی کرنسی کی قدر میں کمی کرنی پڑے گی جس سے ایک کرنسی جنگ کا آغاز ہو سکتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا خطرہ سرمائے کی بیرونِ ملک منتقلی میں اضافہ ہے۔ پہلے ہی اس رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ 2014ء کی تیسری سہ ماہی میں چین سے باہر منتقل کیے جانے والے سرمائے کا حجم 63 ارب ڈالر تھا۔ چوتھی سہ ماہی میں یہ حجم 90 ارب ڈالر ہو گیا جو اس سہ ماہی کے

جی ڈی پی کا 3 فیصد بنتا ہے۔ یہ ایک ریکارڈ خسارہ تھا۔اس کے علاوہ چینی کمپنیوں کی جانب سے ادا کیے جانے والے قرضوں میں بھی اضافہ ہوگا جن کا حجم ایک کھرب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے۔

لیکن اس سے بھی بڑا نقصان اس اقدام کے خلاف کیے جانے والے امریکہ کے اقدامات سے ہوگا۔ جو چین کی کرنسی کی آزادانہ حرکت پر شکایت کریں گے اور چینی مصنوعات کی درآمد پر مزید پابندیاں لگانے کی جانب بڑھیں گے۔لیکن ان تمام خطرات کے باوجود چینی حکمران یوان کی ڈالر کے مقابلے میں قدر میں کمی کی جانب بڑھ سکتے ہیں۔

امریکی سامراج کا مقابلہ کرنے کے لیے چین اپنی بینکاری کو بھی وسعت دے رہا ہے۔ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا مقابلہ کرنے کے لیے چین معاشی مشکلات کے شکار بہت سے ممالک کو نسبتاً آسان شرائط پر قرضے دے رہا ہے۔ان میں وینزویلا ایک ایسی معیشت ہے جس کو 2007ء سے اب تک چین 50 ارب ڈالر کا قرض دے چکا ہے۔ گہری کساد بازاری کا شکار وینزویلا کی معیشت سے اتنے بڑے پیمانے پر قرضوں کی واپسی مشکوک نظر آتی ہے۔اسی طرح ارجنٹائن کی معیشت کو دیوالیہ پن سے بچانے کے لیے بڑے پیمانے پر قرضے دیئے گئے۔روس کی تیل کی کمپنیوں کو چین 30 ارب ڈالر سے زائد کے قرضے دے چکا ہے۔لڑکھڑاتی ہوئی روسی معیشت کے لیے چین کے قرضے امید کا ایک اہم سہارا ہیں۔

ان تینوں ممالک کی معیشتوں کو چین نے دیوالیہ پن سے بچانے میں مدد کی ہے لیکن اس کے بدلے میں یہ شرط عائد کی ہے کہ ان ممالک میں تعمیرات کے ٹھیکے چینی کمپنیوں کو دیئے جائیں گے۔ اس کے برعکس آئی ایم ایف قرضے کے بدلے میں اس ملک کی مالیاتی پالیسیوں میں مداخلت کرتا ہے اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ چین نے 2008ء سے 2014ء کے اختتام تک تقریباً 30 ممالک سے کرنسی سواپ کی ہے جس کا حجم 500 ارب ڈالر ہے۔ان ممالک میں کینیڈا سے لے کر پاکستان جیسے ممالک شامل ہیں۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے انتظامی امور میں اپنی معیشت کے حجم کے مطابق حصہ نہ ملنے کے باعث چین نئے مالیاتی اداروں کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ 100 ارب ڈالر کی رقم سے برکس بینک کا آغاز کرنے بعد اکتوبر 2014ء میں ایشین انفرااسٹرکچر بینک (AIIB) کی بنیاد رکھی گئی۔ اس بینک کا مقصد ایشین ڈیولپمنٹ بینک ADB کا مقابلہ کرنا ہے جس میں جاپان کی اجارہ داری

ہے۔اسی طرح نومبر 2014ء میں 40ارب ڈالر مالیت کے شاہراہِ ریشم فنڈ کا اعلان کیا گیا۔اس فنڈ کو ایک ترقیاتی بینک سنبھالے گا جس کی پشت پر چین ہے۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک میں چین کی مانگ کے مطابق اگر اصلاحات نہیں کی جاتیں اور یورپی اور امریکی سامراج چین کو اس میں حصہ نہیں دیتے تو چین کی جانب سے شروع کیے جانے والے نئے بینک پہلے سے موجود عالمی مالیاتی اداروں کے لیے مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔

انٹرنیشنل بینکر بننے کے ساتھ ساتھ چین اپنی کرنسی کو بھی انٹرنیشنل سطح پر لے جا رہا ہے۔لیکن باقی دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے اپنے مقامی بینکوں کو تیار کرنے سے پہلے ہی یہ اقدام خود چین کے لیے مشکلات پیدا کریں گے۔یہ بینک پہلے ہی سرمائے پر کنٹرول کو کم کرنے کی مانگ کر رہے ہیں جس کے باعث عالمی منڈی میں موجود خطرات سے نپٹنا مشکل ہو جائے گا۔اس دوران چین سے باہر جانے والے سرمائے میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔اس صورتحال نے چین کو مزید محتاط کر دیا ہے اور چائنہ ڈیولپمنٹ بینک کے غیر ملکی قرضوں کی شرح 11-2009ء میں 50 فیصد سے کم ہو کر 2013ء میں 10 فیصد ہو گئی تھی۔تیل کی قیمتوں میں کمی سے پہلے ہی CDB نے وینزویلا کو قرضے دینے میں احتیاط شروع کر دی تھی۔

عسکری تیاری

چین اور امریکہ کے تعلقات کے حوالے سے دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔چین عسکری میدان میں امریکہ سے کہیں زیادہ کم تر ہے لیکن اس کے باوجود کسی تنازعے یا جنگ کی صورت میں امریکی فوج کو بڑا نقصان پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔خاص طور پر مغربی بحرالکاہل میں چین کی عسکری قوت امریکی مفادات کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔انہی خطرات سے نپٹنے کے لیے چین سے ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود امریکہ چین کے قریب اپنی عسکری قوتوں کو بہت زیادہ بڑھا اور مضبوط کر رہا ہے۔ہونولولو میں موجود پیسیفک کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر موجود ہے جس کی ایک بہت بڑی فوجی بیس بحرالکاہل میں گوام نامی جزیرے پر قائم ہے۔یہ جزیرہ امریکہ سے 6 ہزار میل کے فاصلے پر جبکہ چین سے 2 ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔امریکہ ہر سال دفاعی ضروریات پر سینکڑوں ارب ڈالر خرچ کرتا ہے۔2013ء میں امریکہ نے اپنے جی

ڈی پی کا 3.8 فیصد دفاع پر خرچ کیا جبکہ 2011ء میں یہ 4.6 فیصد تھا جس کا حجم 664.84 ارب ڈالر بنتا ہے۔ 2014ء میں 575 ارب ڈالر دفاع پر خرچ کیے گئے۔ عراق اور افغانستان میں شکستوں اور فوجوں کے انخلا کے بعد دفاعی بجٹ میں کمی ہوئی تھی لیکن اب داعش اور دوسری دہشت گرد تنظیموں کے دوبارہ ابھرنے کے بعد دفاعی بجٹ میں اضافہ متوقع ہے۔

دوسری جانب چین اپنے جی ڈی پی کا 12 فیصد سے زائد دفاع پر خرچ کرتا ہے۔ 2014ء میں اس کا حجم 131.57 ارب ڈالر تھا۔ اس طرح امریکہ کے بعد چین دنیا میں دفاع پر خرچ کرنے والا دوسرا بڑا ملک ہے۔

موجودہ صورتحال میں امریکہ اور چین کے براہ راست ٹکراؤ کے امکانات انتہائی کم ہیں اور تضادات کا اظہار دیگر ممالک میں نظر آتا ہے۔ امریکہ چین کے ہمسایہ ممالک میں بھی اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سفارتکاری اور دیگر ذرائع سے اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے تاکہ چین کی بڑھتی ہوئی سامراجی طاقت کو کنٹرول کیا جا سکے۔

چین جہاں ایک سامراجی طاقت کے طور پر پوری دنیا میں سرمایہ برآمد کر رہا ہے وہاں اس کے 20 ہمسایہ ممالک کی سیاست اور معیشت بھی اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مشرق میں جاپان سے لے کر جنوب میں ویت نام، جنوب مغرب میں ہندوستان اور شمال میں روس تک چین کے ہمسایہ ممالک سے تعلقات کی جہاں ایک لمبی تاریخ ہے وہاں موجودہ عالمی صورتحال میں وہ چین کے لیے فائدے اور نقصان دونوں کا باعث بن سکتے ہیں۔ حال ہی میں جاپان سے چند جزیروں پر قبضے کا ابھرنے والے تنازعہ دونوں ممالک میں حالتِ جنگ کا باعث بن گیا تھا۔ مشرقی چائنہ سمندر کو چین اپنے زیر تسلط علاقہ سمجھتا ہے اور اس پر امریکی ایما پر جاپانی مداخلت اس کے لیے باعث خجالت تھی۔ شمالی کوریا کے ساتھ چین کے تعلقات بھی امریکہ، جنوبی کوریا، جاپان اور روس سے تنازعے کا باعث رہتے ہیں۔ جبکہ کمبوڈیا کی جانب چینی پالیسی ویت نام، تھائی لینڈ کے مفادات کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔ اسی طرح برما کے ساتھ چین کے تعلقات ہندوستان اور بنگلہ دیش پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔

ان ممالک سے پہلے چین کا سامراجی کردار چین میں موجود مظلوم قومیتوں اور اقلیتوں پر جبر سے واضح ہوتا ہے۔ تبت اور سنکیانگ سے لے کر تائیوان اور ہانگ کانگ تک چین کی سامراجی کردار کی حامل ہوتی ہوئی ریاست اپنے تسلط کو بدترین جبر کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہے۔

امریکہ اور دیگر مغربی سامراجی قوتیں چین پر اپنا دباؤ بڑھانے کے لیے اور چینی سامراج کے مقابلے میں اپنے سامراجی مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے ان علاقوں میں چینی ریاست کے جبر کے خلاف نہ صرف آواز بلند کرتی رہتی ہیں بلکہ وہاں موجود قومی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق کی جدوجہد کی پشت پناہی بھی کرتی ہیں۔ اسی طرح چین میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، جمہوریت کی عدم موجودگی اور دیگر آمرانہ قوانین پر اکثر شور مچایا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے والے مغربی ذرائع ابلاغ اور تنظیموں کا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ اس جبر کا شکار عوام کو چھٹکارا دلایا جائے بلکہ ایسا کرنے سے وہ چین کے حکمران طبقے پر دباؤ ڈال کر اپنے مفادات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

روس اور وسطی ایشیا

روس اور چین کے باہمی تعلقات کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ سوویت یونین کے انہدام اور چین میں سرمایہ داری کی استواری کے بعد دونوں ریاستوں کے خطے میں اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے تضادات موجود ہیں بلکہ عالمی سرمایہ داری کا حصہ ہونے کے باعث ان کے مفادات مشترک بھی ہیں۔ 2008ء کے عالمی معاشی بحران کے باعث جہاں عالمی سرمایہ داری زوال پذیر ہے وہاں امریکی سامراجی قوت بھی پہلے کی نسبت کمزور ہوئی ہے۔ ایسے میں جہاں سرمایہ داری کو سہارا دینے کی ذمہ داری ابھرتی ہوئی معیشتوں کو دی گئی وہاں روس اور چین جیسی نئی سامراجی ریاستیں بھی اپنے اثر و رسوخ میں اضافے کے امکانات کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد روس اور چین کے تعلقات میں بہت بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ چین میں انقلاب کے بعد جہاں ماؤ نے سٹالنسٹ روس کی اجارہ داری کو تسلیم کر لیا تھا وہاں دونوں ممالک کی بیوروکریسیوں کے باہمی مفادات کے ٹکراؤ کے باعث Sino Soviet Split (سوویت۔ چین تنازعے) کے باعث پوری دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی اور وہ ماسکو نواز اور بیجنگ نواز حصوں میں تقسیم ہو گئیں تھیں۔ امریکہ اور سوویت یونین کے مابین سرد جنگ کے دوران چین کو ایک تیسرے مگر نسبتاً کمزور دھڑے کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ باہمی تنازعے کے باعث بہت سے مواقع پر چین نے سوویت یونین کی مخالفت میں سامراجی قوتوں کی حمایت بھی کی تھی۔ امریکی صدر رچرڈ نکسن کے دورۂ چین کے بعد امریکہ چین تعلقات کی بحالی کا

عمل بھی شروع ہو گیا تھا جو سوویت روس کے لیے باعثِ تشویش تھا۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد چین اور روس میں نہ صرف تعلقات بحال ہوئے بلکہ تجارت میں بھی تیزی آئی ۔ خاص طور پر اسلحے اور تیل کی تجارت میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا۔ 90ء کی دہائی میں G-7 ممالک کی جانب سے چین پر اسلحے کی فروخت پر پابندیوں کے باعث روس وہ ملک تھا جو چین کی اسلحے کی ضروریات پوری کر سکتا تھا۔ 1990ء سے 2007ء کے درمیان روس نے چین کو 15.8 ارب ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا۔ چین کی اپنی دفاعی صنعت کی ترقی کے باعث ان درآمدات میں کمی آتی گئی۔

90ء کی دہائی میں تیز ترین صنعتی ترقی کے باعث چین تیل درآمد کرنے والا بڑا ملک بن گیا۔ 2010ء میں چین نے روس سے دو کروڑ ٹن تیل درآمد کیا۔ لیکن اس دوران چین سعودی عرب، انگولا اور ایران سے زیادہ تیل درآمد کرتا رہا۔ اس کی وجہ قیمتوں کے تنازعے کے علاوہ روس کا عدم استحکام اور ٹوٹتا ہوا خستہ حال انفرااسٹرکچر بھی تھا۔ لیکن موجودہ عالمی صورتحال میں چین اور روس کے باہمی تعاون میں تیزی آ رہی ہے اور بہت سے بورژوا تجزیہ نگار اسے امریکی سامراج کے مقابلے میں ایک ابھرتی ہوئی مشترکہ قوت قرار دے رہے ہیں۔

روس کی ریاست یوکرائن کے تنازعے میں الجھی ہوئی ہے جہاں یورپی یونین اور امریکی سامراج کھل کر خطے میں روس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ اسی طرح 2008ء میں عالمی معیشت کے شدید بحران کے دوران 'BRICS' کو معیشت کے دوبارہ ابھار کی بنیاد قرار دیا جا رہا تھا۔ ان سے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ عالمی سطح پر گرتی ہوئی کھپت کو بحال کریں گے اور معیشت کو سہارا دیں گے۔ وقت اور حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اندازے غلط تھے اور آج یہ معیشتیں خود تیزی سے زوال پذیر ہیں۔ لیکن اس دوران امریکی معیشت سمیت یورپی یونین کی معیشتیں بھی دوبارہ نہیں ابھر سکیں۔ ایسے میں ان ابھرتی معیشتوں اور دیگر ترقی یافتہ معیشتوں کے مابین تنازعات اور تضادات ابھر رہے ہیں۔

امریکی سامراج کی زوال پذیری بھی نئی سامراجی قوتوں کے لیے خلا پیدا کر رہی ہے جس میں چین یہ جگہ لینے کے لیے سب سے زیادہ تیزی سے مصروفِ عمل ہے۔ حال ہی میں قائم ہونے والا برکس بینک بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ 15 جولائی 2014ء کو ہونے والے برکس ممالک (برازیل، روس، بھارت، چین، جنوبی افریقہ) کے ایک معاہدے کے نتیجے میں

100ارب ڈالر کی رقم سے اس بینک کا آغاز کیا گیا۔اس کو ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا متبادل بنانے کا اعلان کرنے کا مقصد چین اور دیگر ممبر ممالک کا عالمی اجارہ داری میں اپنے حجم کے مطابق حصے کا حصول ہے۔یہ بینک بھی ورلڈ بینک کی طرز پر انفرااسٹرکچر کے منصوبوں کے لیے سالانہ 34ارب ڈالر تک کے قرضے دے سکتا ہے۔بینک کی جانب سے قرضے دینے کا آغاز 2016ء میں کیا جائے گا۔ انفرااسٹرکچر کے منصوبوں کے علاوہ عالمی سطح پر نقد رقم (Liquidity) کے دباؤ سے نپٹنے اور قرضوں کی ادائیگی میں مدد کے لیے بھی یہ بینک مدد کرے گا۔اس بینک کی تاسیسی رقم 100ارب ڈالر میں چین سب سے زیادہ 41ارب ڈالر تک حصہ ڈالے گا۔

اس بینک کا مستقبل بھی عالمی سطح پر تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی معاشی صورتحال کے ساتھ وابستہ ہے۔جس وقت اس بینک کو قائم کرنے کے لیے مذاکرات کیے جارہے تھے اس وقت ممبر ممالک کی معیشتیں تیز رفتاری سے ترقی کررہی تھیں جن میں سرفہرست چین کی معیشت تھی۔لیکن ابھی اس بینک کے عملی طور پر آغاز میں ایک سال کا وقفہ ہے اور ممبر ممالک کی معیشتیں روبہ زوال ہیں۔روس کی معیشت بھی ایک زوال (Recession) کی جانب تیزی سے بڑھ رہی ہے جبکہ چین کی شرح ترقی بھی سست روی کا شکار ہوکر 7 فیصد کی خطرناک حد سے نیچے گرنے کے امکانات ہیں۔گوکہ ابھی بھی چین کے پاس نقد رقم کے وسیع ذخائر موجود ہے جن سے اس بینک کو عملی طور پر فعال کیا جاسکتا ہے۔لیکن عالمی سطح پر معاشی زوال کے باعث مختلف ممالک کو قرضے دینے کا کاروبار بھی محفوظ دکھائی نہیں دے رہا۔آئی ایم ایف اور یورپین سنٹرل بینک جیسے ادارے بھی مختلف ممالک سے اپنے قرضوں کی واپسی کے لیے تگ ودو کررہے ہیں جن میں یونان اور اسپین جیسے ممالک بھی شامل ہیں۔ایسے میں نئے قرضے دے کر منافع کا حصول آسان نہیں ہوگا۔

لیکن اس بینک کے قیام کا بنیادی مقصد چینی سامراج کا عالمی بینکاری اور معیشت میں اپنا حصہ تسلیم کروانا ہے۔ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف سرمایہ داری کے عروج کے دور میں پروان چڑھے تھے اور ان کا ایک سامراجی کردار ابھر کر سامنے آیا تھا۔آج عالمی سطح پر سرمایہ داری میں وہ گنجائش نہیں کہ کوئی نیا بینک ان جیسا سامراجی کردار حاصل کرسکے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کے زوال کی شدت جہاں سامراجی قوت کو بکھرنے پر مجبور کررہی ہے وہاں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی سامراجی اجارہ داری بھی کمزور ہوکر بکھرنے کے امکانات موجود ہیں۔ایسی صورتحال میں

جہاں یہ نئے بینک ان اجارہ داریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائے جا رہے ہیں وہاں وہ انہیں سہارا دینے کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔لیکن اس تمام صورتحال میں ان کی باہمی کشمکش میں شدت آئے گی اور عالمی معیشت میں نئے تضادات جنم لیں گے۔

اس دوران روس اور چین کے معاہدے صرف باہمی تجارت تک اور خطے تک موجود نہیں بلکہ ایران اور شام میں امریکہ اور سعودی عرب کے تسلط کا مقابلہ کرنے سے لے کر افغانستان، بھارت اور بحرالکاہل تک ان کا تعاون موجود ہے۔لیکن روس کے ساتھ تعلقات میں جہاں چین امریکی سامراج کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے وہاں امریکہ کے ساتھ جڑے اس کے مفادات ان تعلقات کو زیادہ گہرا اور مؤثر بنانے میں بھی رکاوٹ ہیں۔سوویت یونین کے انہدام کے بعد دونوں ممالک نے اپنی سرحدوں سے جوہری تنصیبات ہٹانے کے عمل کا آغاز کیا۔

وسطی ایشیا اور کوریا میں بھی چین اور روس کے مفادات کا ٹکراؤ موجود ہے۔وسطی ایشیا میں تضادات سے نپٹنے کے لیے 2001ء میں شنگھائی کوآپریشن آرگنائزیشن (SCO) قائم کی گئی۔ اس کے ممبر ممالک میں چین اور روس کے علاوہ کزاکستان، کرغستان، تاجکستان اور ازبکستان شامل ہیں۔آغاز میں اس تنظیم کے قیام کا مقصد سرحدوں پر فوجوں کی موجودگی میں کمی تھی۔قیام کے بعد ممبر ممالک چین کی سرحد پر تعینات فوجوں کو سرحد سے سو کلومیٹر پیچھے لے گئے۔اس تنظیم کے ذریعے چینی حکمران وسطی ایشیا میں اپنے سامراجی مفادات کا تحفظ جاری رکھے ہوئے ہیں اور خطے میں روس کے تسلط کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی!

جاپان اور کوریا

2010ء میں چین دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن گیا اور جاپان کو تیسرے نمبر پر دھکیل دیا۔لیکن آج بھی جاپان چین سے زیادہ ایجادات کر رہا ہے، زیادہ سرمایہ کاری کر رہا ہے اور جدید تکنیک سے مزین مصنوعات کی برآمدات میں چین سے آگے ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ جاپان ایک فوجی قوت بھی ہے اور دنیا کا چھٹا بڑا دفاعی بجٹ رکھتا ہے۔دو لاکھ 37 ہزار افراد پر مشتمل جاپان کی سیلف ڈیفنس فورسز جدید تکنیک سے لیس ہیں۔چین اور جاپان جغرافیائی طور پر بھی قریب ہیں اور مشرقی چائنہ سمندر میں شنگھائی سے صرف 500 میل کے فاصلے پر جاپان کی حدود کا

آغاز ہو جاتا ہے۔

جاپان اور چین کے حالیہ تنازعہ کی وجہ سینکا کو (Senkaku) جزائر تھے جنہیں چین میں Diaoyutai جزائر کہا جاتا ہے۔ جاپان کے زیر تسلط جزائر پر چین اپنا حق تسلیم کروانا چاہتا ہے۔ چین مشرقی چائنہ سمندر میں واقع ان جزائر کے قریب سمندر سے گیس حاصل کر رہا ہے جسے جاپان اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس تنازعے کے باعث کچھ عرصہ کے لیے حالتِ جنگ کی کیفیت بن گئی تھی اور دونوں ممالک ایک دوسرے کو جارحیت کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ دونوں ممالک میں ایک دوسرے کے خلاف قومی جذبات ابھارنے کی بھی کوشش کی گئی۔ لیکن بالآخر جنگ ملتوی ہو گئی اور اب پہلے والی صورتحال دوبارہ برقرار ہے۔ جاپان تائیوان میں بھی چین سے تصادم کی تحریکوں کو غیر اعلانیہ مدد فراہم کرتا رہتا ہے۔ چین اور تائیوان کے تنازعے کی طوالت جاپان کے مفاد میں ہے جس سے وہ چین کی بڑھتی ہوئی عسکری قوت کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی بجائے تائیوان کی جانب مبذول رکھ سکتا ہے۔ شمالی کوریا کے مسئلے پر بھی جاپان اور چین کا تنازعہ موجود ہے۔ جاپان اسے اپنے مفادات کے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے جبکہ چین کے لیے وہ ایک منڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تنازعات کے باوجود چین اور جاپان کی باہمی تجارت بھی بڑے پیمانے پر موجود ہے اور باہمی تعلقات کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ چین میں کمیونسٹ نظریات پہنچانے کا آغاز بھی جاپان سے ہی ہوا تھا جب مارکس اور اینگلز کی تحریروں کے جاپانی تراجم چین پہنچے اور ان کا چینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ حکمران طبقات کی قومی تعصب اور جنگوں کی تاریخ کے باوجود دونوں ممالک کے محنت کشوں کی طبقاتی جڑت کی بھی ایک تاریخ ہے۔

کوریا کے دونوں ممالک کی مشترکہ آبادی 7 کروڑ سے زائد ہے۔ جنوبی کوریا دنیا کی چوتھی بڑی معیشت ہے جس کا حجم 800 ارب ڈالر سے زائد ہے۔ جزیرہ نما کوریا کی دو حصوں میں تقسیم عالمی سامراجی قوتوں کی بندر بانٹ کا نتیجہ ہے۔ شمالی کوریا کی سٹالنسٹ حکومت سوویت یونین اور منصوبہ بندی پر قائم سوشلسٹ چین کی امداد پر انحصار کرتی رہی ہے جبکہ جنوبی کوریا امریکی سامراج کے زیرِ تسلط رہا ہے۔ آج بھی دونوں ممالک کے محنت کش عوام میں اس تقسیم اور دشمنی کے خاتمے کے لیے بڑے پیمانے پر خواہش موجود ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام مصنوعی تقسیموں کے ذریعے اپنا تسلط جاری رکھتا ہے۔ اسی تقسیم کے باعث دونوں جانب بڑے پیمانے پر اسلحے پر اخراجات کیے جاتے ہیں۔ سرمایہ دار چین بھی خطے میں اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ان تعصّبات کو جاری رکھنا چاہتا

ہے۔چین کے جنوبی کوریا سے سرحدی تنازعات بھی ابھر رہے ہیں۔

چین کے ساحلوں سے شروع ہو کر 2 ہزار میل کے فاصلے تک موجود ان حدود پر چین اپنا سامراجی تسلط قائم رکھنے کے لیے امریکی حلیفوں جاپان، جنوبی کوریا اور تائیوان سے مسلسل برسرِ پیکار ہے۔شمال میں جاپانی جزیروں سے شروع ہو کر تائیوان کے جنوبی حصے تک اس پٹی پر اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لیے چین اپنی بحری قوت میں بھی اضافہ کر رہا ہے۔

بحرالکاہل کے دیگر ہمسائے

تائیوان کے جنوب مغرب میں جنوب مشرقی ایشیا کے دیگر ہمسایوں میں فلپائن، ملائشیا، برونائی، انڈونیشیا، سنگاپور اور ویت نام ہیں۔سمندر میں مچھلی کے حصول سے لے کر وہاں موجود معدنی وسائل پر تسلط اور اہم بحری گزرگاہوں کے کنٹرول پر چین کے ان ممالک سے تنازعات موجود رہتے ہیں۔امریکی سامراج بھی چین کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتا رہتا ہے۔اسی طرح بحرالکاہل کے جنوب میں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، نیوگنی، فجی اور درجن کے قریب چھوٹے ممالک ہیں۔اسی طرح کمبوڈیا، ویتنام اور تھائی لینڈ بھی چین کے قریب ہونے کی وجہ سے اس کی اجارہ داریوں کے کھیل کا حصہ ہیں۔

ساؤتھ چائنہ سمندر سے ہر سال ایک کروڑ ٹن مچھلی حاصل کی جاتی ہے جبکہ تیل اور گیس کے حصول کے لیے بھی اب یہاں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی جا رہی ہے۔چین اس علاقے میں تسلط کے لیے یہاں موجود امریکی بحری بیڑوں سے تنازعات ابھار رہا ہے اور ان کے لیے یہاں مشکلات پیدا کر رہا ہے۔امریکہ جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی تنظیم آسیان (ASEAN) کے ذریعے خطے میں اپنے سامراجی مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔اس تنظیم کے ممبران میں انڈونیشیا، ملائشیا، فلپائن، سنگاپور، تھائی لینڈ، برونائی، کمبوڈیا، لاؤس، برما اور ویت نام شامل ہیں۔ 2010ء میں امریکہ نے یہ اعلان کیا کہ وہ ساؤتھ چائنہ سمندر میں جہاز رانی کے لیے ''قومی مفاد'' میں مکمل آزادی رکھتا ہے۔جغرافیائی طور پر دور ہونے کے باوجود یہ اعلان امریکہ کے سامراجی عزائم کا اظہار ہے۔آسیان ممالک پہلے ہی چین پر دباؤ ڈالتے رہے ہیں کہ وہ خطے میں جارحیت سے دور رہے۔ایسے میں کسی بھی سرحدی تنازعے پر حالتِ جنگ کا ابھرنا حیران کن نہیں ہوگا۔خاص طور پر کسی بھی ملک میں انقلابی تحریکوں کے ابھرنے کی صورت میں ان قومی تعصبات کو ابھارا جا سکتا ہے تاکہ بیرونی

دشمن کا خوف مسلط کر کے عوام پر جبر جاری رکھا جائے۔ چین میں محنت کش طبقے کی ابھرنے والی تحریکوں کو بیرونی جنگوں کو ابھار کے کچلنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اس سامراجی پھیلاؤ اور تسلط میں چین کی پیپلز لبریشن آرمی (PLA)، جو اس کی ریاستی فوج بھی ہے، کا کردار بہت زیادہ اہمیت کا حامل بن گیا ہے۔ اس سے چینی فوج کا نہ صرف سیاسی جبر بڑھا ہے بلکہ سرمایہ دارانہ استواری کے عمل میں اپنی اس اہمیت کو استعمال کرتے ہوئے PLA کے اشرافیہ جرنیلوں نے معیشت میں بھی مداخلت کی ہے۔ چین میں اس وقت PLA کے تین لاکھ کے قریب مختلف اقتصادی کاروبار چل رہے ہیں۔ اس میں کرپشن کا وسیع پیمانے پر پھیل جانا بھی اب بے نقاب ہو چکا ہے۔ 1949ء میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد پہلی مرتبہ ''کمیونسٹ پارٹی'' نے PLA کے 15 اعلیٰ جرنیلوں کے کیس کھولے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے چینی فوج کس قدر کھوکھلی ہو رہی ہے۔ لیکن دوسری جانب چین دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں بیرونی دفاع سے زیادہ اخراجات داخلی سیکیورٹی پر کیے جا رہے ہیں۔

چین کے یہ جنوبی ہمسائے بھی اس کے عزائم سے بیزار ہیں۔ ان کو پریشانی یہ ہے کہ چین کے بڑھتے ہوئے معاشی تسلط سے ان کی معیشت اور تجارت پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ لاؤس اور برما جیسے ممالک کو یہ خطرہ ہے کہ چین کی مصنوعات کا ان کی منڈیوں میں سیلاب آیا ہوا ہے اور اس میں ان کی صنعتیں ڈوب رہی ہیں۔ چین ایسے ڈیموں سے بجلی پیدا کر رہا ہے جن سے جنوبی ممالک مثلاً ویتنام میں طوفانی سیلاب جنم لے سکتے ہیں۔ ان ممالک میں بھی یہ احساس شدت سے بڑھ رہا ہے کہ چین لوہے، تارکول اور کنکریٹ سے تعمیرات تو کر رہا ہے لیکن ٹیکنالوجی کی تفصیلات کا تبادلہ نہیں کر رہا اور ان پراجیکٹوں پر مقامی مزدوروں کی جگہ چینی مزدوروں کو لایا جا سکتا ہے۔ ویتنام سے لے کر برما تک کے ممالک کو یہ خوف لاحق ہے کہ چین کے سیاسی اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ منڈیوں پر جبر اور قبضہ بھی ہو رہا ہے۔ چین اپنے علاقائی تسلط کے ان عزائم کو تیزی سے پھیلا رہا ہے کیونکہ ان معیشتوں کا انحصار چینی معیشت پر بہت زیادہ بڑھ چکا ہے۔ چینی صدر شی جن پنگ کی شاہراہِ ریشم کی تعمیر کو تجزیہ نگار دوسری عالمی جنگ کے بعد کے امریکی ''مارشل پلان'' سے تشبیہہ دے رہے ہیں۔ یورپ اور جاپان میں اس مارشل پلان کی ''تعمیرِ نو'' سے امریکہ نے اپنا سامراجی تسلط قائم کرنے کے عزائم کو پورا کرنے میں اہم کردار استوار کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چین کی اس سرمایہ کاری کو ''چینی مارشل پلان'' قرار دیا جا رہا ہے۔

افریقہ

1980ء میں چین اور افریقہ کی باہمی تجارت کا حجم ایک ارب ڈالر تھا جو 2000ء میں 10ارب ڈالر ہو گیا۔ 2006ء میں یہ حجم 55ارب ڈالر پہنچ گیا جس کے بعد چین افریقہ سے تجارت کرنے والا دوسرا بڑا ملک بن گیا۔ 2006ء میں امریکہ کی افریقہ سے تجارت کا حجم 91ارب ڈالر تھا۔ 2009ء میں چین امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ گیا جب اس تجارت کا حجم 114ارب ڈالر تک پہنچ گیا۔ 2012ء کے اختتام تک یہ حجم 198.5ارب ڈالر تھا جب امریکہ کی افریقہ سے تجارت 99.8ارب ڈالر تھی۔ افریقہ میں چین کی سب سے زیادہ تجارت جنوبی افریقہ سے ہے جس کا حجم 20.2ارب ڈالر سے زائد ہے۔ 2012ء میں چین نے گھانا کو 3ارب ڈالر کا قرضہ دیا جو اس کے کل جی ڈی پی کا 10 فیصد تھا۔

افریقہ میں چین سے تجارت کرنے والے اہم ممالک میں انگولا، سوڈان، چاڈ، لیبیا، کانگو، نائیجیریا، ایکویٹوریل گنی، گیبون اور کیمرون شامل ہیں۔ یہ سب چین کو تیل بیچتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں سے تانبا، خام لوہا، معدنیات اور کپاس بھی چین کو برآمد کی جاتی ہے۔ چین نے ڈی آر کانگو کی تانبے اور کوبالٹ کی معدنیات کے حصول کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے۔ اسی طرح افریقہ چین کی مصنوعات کے لیے ایک منڈی کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہاں الیکٹرانک کی مصنوعات سے لے کر، ہلکی صنعتی مصنوعات اور مکینیکل اور الیکٹریکل کی صنعت کی مصنوعات بڑے پیمانے پر فروخت ہوتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ سے زیادہ چینی باشندے نجی طور پر افریقہ منتقل ہو چکے ہیں اور وہاں تجارت اور دیگر بہت سے کاروباروں سے وابستہ ہیں۔ بہت سے افریقی ممالک میں چین سے آنے والے افراد ہوٹل میں کھانا پکاتے، چکلے چلاتے اور دوسرے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح افریقہ میں سرمایہ کاری کرنے والی چینی کمپنیاں اپنے ساتھ محنت کش بھی چین سے لاتی ہیں۔ جو انتہائی کم تنخواہ اور سہولیات کے ساتھ کام کرنے پر مجبور ہیں۔ افریقہ میں پھیلی شدید غربت کے باوجود چین کے سستے مگر ہنر مند محنت کش ہی چینی سرمایہ داروں کے لیے ترجیح ہیں۔

چین افریقہ میں امریکہ اور فرانسیسی سامراج کے ساتھ مدِ مقابل ہے۔ فرانس، برطانیہ،

ہالینڈ اور دیگر یورپی ممالک کی طرح چین کی افریقہ میں نوآبادیات کی کوئی تاریخ نہیں۔اسی وجہ سے افریقی حکمران بآسانی چین کے ساتھ عوام دشمن معاہدے کر سکتے ہیں۔ سابقہ سامراجی ممالک کی کمپنیوں کے ساتھ ایسے ہی معاہدے زیادہ غیر مقبول ہو جاتے ہیں اور عوامی ردِعمل ابھرنے کا خدشہ موجود رہتا ہے۔افریقہ میں اپنی مداخلت بڑھانے کے ساتھ ساتھ چین یہاں مکمل سامراجی عزائم کے ساتھ اپنا تسلط گہرا کرنا چاہتا ہے۔صرف 2010ء تک افریقہ میں 25 کنفیوشس انسٹی ٹیوٹ قائم ہو چکے تھے تاکہ چینی زبان کی ترویج کی جائے۔اسی طرح ہزاروں افریقی طلبا کو چین میں تیکنیکی تربیت کے لیے منگوایا جاتا ہے۔چین کی ابھی تک افریقہ میں براہِ راست فوجی موجودگی نہیں لیکن اقوامِ متحدہ کے بہت سے امن دستوں میں چینی فوجی موجود ہیں۔

حال ہی میں چین نے جنوبی سوڈان میں اپنے 700 فوجی بھیجنے کا اعلان کیا ہے جو اس براعظم میں چین کی پہلی عسکری مداخلت ہوگی۔سوڈان میں چین کی مداخلت ایک عرصے سے جاری ہے۔صرف 2006ء تک چین یہاں تیل کی پیداوار اور پائپ لائنوں میں دس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کر چکا تھا۔سرمایہ کاری کا زیادہ حجم جنوبی سوڈان میں تھا اور جنوب سے شمال تک پائپ لائنیں بچھائی گئیں جبکہ شمال میں بندرگاہوں پر سہولیات کے قیام کے لیے اور رفائنریوں میں سرمایہ کاری کی گئی۔اس دوران چین کے لیے افریقہ سے تیل کے حصول کے لیے سوڈان پہلے نمبر پر آ گیا۔اسی بڑھتی ہوئی تجارت کے پیشِ نظر چین کی سوڈان کے داخلی معاملات میں بھی مداخلت بڑھتی چلی گئی ہے۔سوڈان میں جاری کئی دہائیوں پرانی خانہ جنگی، ''دارفور'' کا مسئلہ اور باغیوں کی کاروائیوں میں چین اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں سے لے کر حکومت میں اثر ورسوخ تک ہر حربہ استعمال کرتا رہا ہے۔اسی طرح سوڈان اور چاڈ کے باہمی تعلقات میں بھی چین کا کردار اہم تھا کیونکہ چین نے چاڈ کے تیل کے ذخائر کے حصول کے لیے بھی بھاری سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔اسی مداخلت کے باعث دوسری سامراجی قوتوں سے ٹکراؤ بھی ناگزیر تھا۔جنوبی سوڈان کے علیحدہ ملک بننے کے بعد بھی وہاں سامراجی قوتوں کا کھلواڑ ابھی جاری ہے اور پراکسی جنگیں اور خانہ جنگیاں معمول بن چکی ہیں۔چین کے 700 فوجیوں کا دستہ یقیناً اس براعظم میں چین کے سامراجی تسلط کا آغاز ہے جس میں اضافے کے امکان کے ساتھ ساتھ امریکہ، فرانس اور دیگر قوتوں سے ٹکراؤ کا امکان بھی موجود ہے۔ان تنازعات میں نہ صرف مقامی

بدعنوان حکمرانوں کو استعمال کیا جائے گا بلکہ قومی، لسانی، قبائلی اور دیگر تعصّبات کو ابھار کر اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا جائے گا۔اس سامراجی جنگ میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت کے ساتھ ساتھ لاکھوں لوگ مسلسل غربت اور بیماری میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے۔صرف اس سامراجی نظام کا خاتمہ کر کے ہی اس خونریز بربریت سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

لاطینی امریکہ

یہاں بھی چین خام مال کے حصول کے لیے سرگرم ہے۔اس برِاعظم کی سب سے بڑی معیشت برازیل ہے جو چین کو خام لوہا اور زرعی اجناس فراہم کر رہا ہے جن میں سویابین، اناج، گوشت وغیرہ شامل ہیں اور چینی مصنوعات کی ایک منڈی بھی ہے۔دونوں ممالک باہمی تجارت میں ڈالر کی بجائے اپنی کرنسیوں کو بھی استعمال کر رہے ہیں۔چلی اور پیرو بھی چین کو خام لوہا اور تانبا فراہم کر رہے ہیں۔ارجنٹائن سے چین سویابین، گوشت اور دوسری زرعی پیداوار حاصل کر رہا ہے۔وینزویلا میں چین نے تیل کی پیداوار کے لیے درجنوں ارب ڈالر کے قرضے دیئے ہیں جس کے باعث گزشتہ عرصے میں وینزویلا کی معیشت امریکی اثر ورسوخ سے باہر نکلنے کا فائدہ اٹھاتی رہی ہے لیکن وینزویلا کی موجودہ معاشی صورتحال اور سرمایہ داری کا خاتمہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ان کی واپسی سنگین حد تک مشکوک ہوگئی ہے۔کیوبا سے بھی تجارت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔2007ء کے بعد سے چین کیوبا کا دوسرا بڑا تجارتی پارٹنر تھا۔لاطینی امریکہ میں اپنی مصنوعات کی فروخت اور خام مال کے حصول کے لیے وہ امریکہ کے سامراجی منرو نظریے (Monroe Doctrine) کو چیلنج کرتا رہا ہے۔1823ء میں وضع کی گئی اس پالیسی کے مطابق برِاعظم شمالی و جنوبی امریکہ میں امریکی اثر ورسوخ کسی بھی دوسری سامراجی قوت سے زیادہ ہونا چاہیے۔اس پالیسی میں یورپی سامراجی طاقتوں کو تنبیہ کی گئی تھی کہ شمالی یا جنوبی امریکہ میں یورپی سامراجی قوتوں کی جانب سے نوآبادیاں بنانے کی کوشش کو جارحیت تصور کیا جائے گا اور اس کا جواب امریکہ فوجی مداخلت سے دے گا۔امریکہ آج تک اس برِاعظم کو اسی پالیسی کے تحت اپنا پچھواڑہ سمجھتا رہا ہے۔

چین کی تجارت کے باعث لاطینی امریکہ کی بہت سی معیشتوں کو سہارا ملا تھا جو چینی معیشت

کی سست روی کے باعث اب دوبارہ بحران کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ چین چلی کا 40 فیصد تانبا خریدتا تھا۔ 2015ء میں آئی ایم ایف کی جانب سے چینی معیشت کی سست روی کے اعلانات کے مطابق تانبے کی قیمت میں 11 فیصد تک کمی واقع ہو چکی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ

اس خطے سے چین اپنی تیل کی ضروریات کے حصول کے لیے رجوع کرتا رہا ہے جبکہ بدلے میں یہاں اپنی تیار مصنوعات اور اسلحہ فروخت کر رہا ہے۔ تیل کی بڑے پیمانے پر درآمد کے باعث اس خطے کے ساتھ چین کی تجارت خسارے میں ہی رہی ہے۔ تمام ممالک سے چین کے دوستانہ تعلقات ہیں جن میں اسرائیل اور فلسطین دونوں شامل ہیں۔

سعودی عرب اور شام کو اسلحے کی فروخت سے لے کر ایران کی سٹریٹجک حمایت تک چین اس خطے میں اپنا اثر ورسوخ جاری رکھے ہوئے ہے۔ عالمی سطح پر تیل کی قیمتوں میں گراوٹ کے باعث ایران کی معیشت بحران کا شکار ہے اور چین کی تیل کی درآمدات میں بھی کمی آ رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایرانی بندرگاہوں کے توسط سے خلیج فارس تک رسائی چین کی امریکی سامراج کے خلاف خطے میں ایک اہم پیش رفت ہے۔ لیکن مشرقِ وسطیٰ میں چین اور سعودی عرب کے درمیان تجارتی، اقتصادی اور فوجی ساز وسامان کے تعلقات ان کے اپنے اپنے بدلتے مفادات کے تحت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ان میں ''گرمائش'' بھی پیدا ہو رہی ہے۔ سعودی امریکہ سے رعایتیں حاصل کرنے کے لئے یہ تعلقات بڑھا رہے ہیں جبکہ چین خام تیل کا پیاسا ہے۔

جنوبی ایشیا

اندازوں کے مطابق 2030ء تک ہندوستان کی آبادی چین سے زائد ہو جائے گی۔ برکس ممالک کا حصہ ہونے کے باعث عالمی معیشت کی بحالی میں دیگر ممالک کے ساتھ ہندوستان کی معیشت پر بھی انحصار کیا جا رہا تھا۔ سامراجی مقاصد کے لیے بھی امریکہ ہندوستان کی ریاست کو خطے میں چین کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چین اور ہندوستان کے مابین ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے میں واقع سرحدی تنازعات پر شدید تضادات موجود ہیں۔ تبت اور

ارونا چل پردیش میں یہ زیادہ واضح ہو کر ابھرے ہیں۔ چین کی بحری قوت میں اضافے کے ساتھ بحر ہند میں بھی نئے تنازعے ابھرنے کے امکانات موجود ہیں۔

لیکن تنازعے کا مرکز تبت ہے۔ چین کے کنٹرول میں یہ علاقہ ہندوستان کے شمال میں 1600 میل تک پھیلا ہوا ہے جو نیپال اور بھوٹان تک جاتا ہے۔ بدھ مت ثقافت اور سنسکرت رسم الخط کے باعث ہندوستان کا تبت میں اثر و رسوخ ایک لمبے عرصے سے موجود رہا ہے۔ 1951ء میں چین کے تبت پر کنٹرول کے بعد ہندوستان نے تسلیم کر لیا کہ تبت چین کا حصہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کنٹرول کو کم کرنے کی کوشش جاری رکھی گئی۔ 1959ء میں جب دلائی لاما نے چینی اقتدار کیخلاف ایک ناکام بغاوت کی تو ہندوستان نے اسے جلاوطنی میں حکومت قائم کرنے کی اجازت دی۔ لاکھوں جلاوطن تبتیوں کو بھی ہندوستان میں خوش آمدید کہا گیا۔ ہندوستان نے 9 ہزار افراد پر مشتمل ایک پیرا ملٹری فورس بھی بنا رکھی ہے جس میں بڑی تعداد تبت کے لوگوں کی ہے جو اس کی شمالی سرحد پر موجود ہوتی ہے۔ اس خطے میں اکسائی چن سے لے کر دوسرے علاقوں تک پر بھی دونوں ممالک کے تنازعات موجود ہیں۔ امریکی سامراج بھی چین پر اپنا دباؤ بڑھانے کے لیے دلائی لاما اور تبت کے مسئلے کو ابھارتا رہتا ہے۔

لیکن اس دوران چین بھارت کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر بن کر بھی ابھرا ہے اور 2014ء میں 65 ارب ڈالر کی دوطرفہ تجارت کی گئی جسے 2015ء میں 100 ارب ڈالر تک لے جانے کا ہدف ہے۔ اس مساوات میں ہندوستان کا چین سے تجارتی خسارہ 40 ارب ڈالر تک کا ہے۔ جسے ہندوستان کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ برما میں زمینی پل کے ذریعے بھی سڑک اور ریل کے تجارتی رستے بڑھائے جا رہے ہیں۔

ایک ارب سے زائد آبادی پر مشتمل دونوں ممالک میں مفادات اور تضادات کا یہ باہمی تعلق جاری و ساری ہے اور ان میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ لیکن ہندوستان اور چین کے درمیان تضادات سب سے زیادہ سری لنکا میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ راجا پکسا کی نیم آمرانہ حکومت میں چین نہ صرف تیزی سے سرمایہ کاری اور تجارت بڑھا رہا تھا بلکہ نیوی کا عسکری اڈہ بھی ہندوستان کے ساحل کے سامنے تعمیر کر رہا تھا۔ اکانومسٹ نے یہ شک ظاہر کیا ہے کہ حالیہ انتخابات میں راجا پکسا کی شکست میں ہندوستان کی خفیہ ایجنسی ''را'' کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس سے سری لنکا میں چین ہندوستان پسِ پردہ تضادات شدت اختیار کریں گے۔

پاکستان کے ذریعے بھی چین ہندوستان سے دشمنی نبھاتا رہتا ہے۔ پاکستان جہاں چینی مصنوعات اور اسلحے کی ایک منڈی ہے وہاں گوادر کی بندرگاہ کے ذریعے مشرقِ وسطیٰ کے تیل اور دیگر اشیا کی تجارت کے لیے اہم گزرگاہ کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں تھرپارکر کے کوئلے سے لے کر توانائی کے منصوبوں تک بڑی چینی سرمایہ کاری کے معاہدوں کے اعلانات کیے جارہے ہیں۔ اس سرمایہ کاری کے ذریعے بھی پاکستان کے محنت کشوں کا بدترین استحصال ہوگا اور چین کے سامراجی مفادات کے حصول کے ساتھ ساتھ بڑے منافعے بھی حاصل کیے جائیں گے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سنکیانگ کے صوبے میں دہشت گردوں کی پشت پناہی پر بھی چین پاکستان سے احتجاج کرتا رہا ہے۔ پاکستان کے ساتھ سرحد پر واقع اس صوبے کی اکثریت یوغر (Uyghur) قوم کے مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ پاکستانی ریاست جہاں اپنے ملک میں دہشت گرد تنظیموں کی پشت پناہی کر رہی ہے وہاں وہ چین سمیت مختلف ممالک میں اپنے مفادات کے حصول کے لیے انہیں استعمال کرتی ہے۔ چینی ریاست بھی اسلامی دہشت گردی کے خوف کو استعمال کر کے نہ صرف سنکیانگ بلکہ وسیع علاقے پر ریاست کے جبر کو مزید مسلط کرتی ہے۔ آنے والے عرصے میں مزدور تحریک میں شدت کے باعث ایسے خوف اور دہشت کو ہڑتالوں کو کچلنے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

چین بنگلہ دیش، نیپال، مالدیپ اور سری لنکا میں بھی اپنا اثر ورسوخ بڑھاتا چلا جارہا ہے۔ سری لنکا کے جنوبی ساحل پر ہمبن ٹوٹا کے مقام پر چین ایک نیا شہر اور بندرگاہ تعمیر کر رہا ہے۔ اس سے بحرِ ہند میں اس کا اثر ورسوخ کئی گنا بڑھ جائے گا۔ اسی طرح کولمبو ائیر پورٹ کو جدید بنانے کے لیے بھی چین اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ اسی طرح 29-27 دسمبر 2014ء کو چینی وزیرِ خارجہ نے بنگلہ دیش کا دورہ کیا اور سوناڈیا جزیرے پر ایک جدید گہرے پانی کی بندرگاہ تعمیر کرنے کی پیشکش کی۔ اسی طرح ڈھاکہ سے کاکس بازار تک ریلوے لائن بچھانے کی بھی پیشکش کی گئی۔ اس سے پہلے چٹاگانگ کی بندرگاہ کو بھی جدید بنانے کے لیے سرمایہ کاری کی جا چکی ہے۔ انڈامان سمندر سے برما کے رستے چینی صوبے یونان تک 2.5 ارب ڈالر کی لاگت سے گیس پائپ لائن بچھائی جا چکی ہے۔ اس پائپ لائن سے آنے والی گیس کے ذریعے چین اپنی گیس کی 6 فیصد ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ اسی طرح مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ سے آنے والی گیس کا فاصلہ 1200 کلومیٹر تک کم ہوگیا ہے جنہیں پہلے انڈونیشیا اور ملائشیا کے درمیان واقعہ خلیج ''ملاکا'' سے

گزرنا پڑتا تھا۔ 20ارب ڈالر کی لاگت سے اسی طرز پر ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ بھی ہے جس کے ذریعے برما کا خام مال چین لے جایا جا سکے گا۔ چین نے برما کی سٹوئے بندرگاہ پر بھی بھاری سرمایہ کاری کر کے اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔

پاک چین ''دوستی''؟

پاکستان کے حکمرانوں نے 55 سال سے پاک چین دوستی کا شور مچا رکھا ہے۔ لیکن یہ دوستی بھی معاشی اور حاکمیت کے مفادات پر مبنی ہے۔ یہ مفادات پاکستان اور چین کے حکمرانوں کے ہیں، عوام کے نہیں۔ 1978ء سے پیشتر جب چین میں ایک منصوبہ بند معیشت تھی تو قومی تنگ نظری کی سٹالنسٹ پالیسی کے تحت ماؤ اور دوسرے لیڈر چین کے قومی تشخص اور عالمی اثر و رسوخ کے لیے پاکستان جیسے ممالک سے تعلقات بڑھاتے اور انہیں نسبتاً بہتر شرائط پر امداد دیتے تھے۔ لیکن چین میں سرمایہ دارانہ استواری کے بعد چین کی پاکستان کو امداد بھی سامراجی نوعیت کی سرمایہ کاری بن چکی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ زلزلوں اور سیلابوں جیسی آفات پر پچھلے چند سالوں میں امریکہ نے چین سے زیادہ رفاہی رقوم فراہم کی تھیں۔ پاکستان کے حکمرانوں کو جب کبھی امریکہ مسترد کرتا رہا تو وہ چین کا سہارا لیتے رہے۔ لیکن اب تو چین اور پاکستان کے تعلقات مکمل طور پر دونوں ممالک کے سرمایہ داروں کے معاشی اور اقتصادی مفادات بن چکے ہیں۔ پاکستان کی افواج بھی دنیا میں سب سے زیادہ اسلحہ اور فوجی ساز و سامان چین سے حاصل کرتی ہیں۔ حال ہی میں شائع ہونے والی ایک نئی کتاب ''چین پاکستان ایکسز، ایشیا کی نئی جیو پولیٹکس'' میں اینڈرو سمال لکھتا ہے، ''چین اور پاکستان کے تعلقات جو ماؤ کے دورِ حکمرانی میں قائم ہوئے تھے وہ ہندوستان سے مشترکہ دشمنی اور دوسرے بہت سے باہمی مفادات پر مبنی ہیں۔ دونوں فوجوں کے درمیان خفیہ سودوں کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ یہ اسلامی بنیاد پرستی کے مسائل سے بالاتر ہے--- چین پاکستان کو ایٹمی بم کے حصول میں امداد کے علاوہ سب سے زیادہ فوجی ساز و سامان دینے والا ملک ہے--- جیسے جیسے چین ایشیا میں پھیل رہا ہے پاکستان اس کے بندرگاہوں، پائپ لائنوں، سڑکوں اور تیل اور گیس کی ترسیل کے لیے ریلوے کے منصوبوں کا مرکزی ملک بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ یہ مشرقِ وسطیٰ سے رابطے کا اہم ترین ذریعہ بھی ہے۔''

لیکن حکمرانوں کی پاک چین دوستی دونوں ممالک کے عوام کے منافی ہے۔ پاکستان میں

ابھرنے والی انقلابی تحریکوں کو کچلنے کے لیے پاکستان کے حکمران جہاں چینی حکمرانوں کی سامراجی حمایت حاصل کریں گے وہاں یہ تحریکیں چین کے محنت کشوں میں تحرک اوران کی حمایت کا باعث بنیں گی۔ یہی کیفیت چین میں محنت کشوں کی کسی بڑی تحریک کے پھٹنے کی صورت میں بھی جنم لے گی۔

قومی جبر، تائیوان اور ہانگ کانگ

چین کا قومی سوال سرمایہ داری کی استواری کے بعد زیادہ شدت سے سلگ رہا ہے۔ 1911ء کے انقلاب کے بعد سن یات سین نے چین کو کثیر النسلی ملک قرار دیا جس میں 'ہان' نسل کے چینیوں کے علاوہ چار مزید گروہ رہ سکتے تھے جن میں مانچو، منگول، تبتی اور مسلم شامل تھے۔ ماؤ نے ایک ملک گیر سروے کے بعد چین میں رہنے والی اقلیتوں کی تعداد 55 قرار دی اوران کے مخصوص حقوق مقرر کیے گئے۔ آج چین میں رہنے والی سب سے بڑی اقلیت ژوانگ ہیں جو ویت نام کی سرحد اور خلیج ٹانکن کے درمیانی علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ سابقہ مختلف ثقافتی گروہوں کا ملغوبہ ہیں اور بڑی حد تک لسانی اور ثقافتی طور پر چینی سماج کا حصہ بن چکے ہیں۔ اسی طرح شمال مشرق میں رہنے والے کوریائی اور تھائی لینڈ کی سرحد کے نزدیک ینان صوبے میں رہنے والے ڈائی مرکزی حکومت کے خلاف ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ چینی منگولیا میں بھی قومی جبر اور نسلی تعصبات پائے جاتے ہیں اور منگولیا کی جانب مدد کے لیے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن منگولیا خود دنیا کے غریب ترین ممالک میں شامل ہوتا ہے۔ پہلے یہ سوویت یونین کی امداد پر انحصار کرتا رہا اور اب چینی تجارت پر اس کا بڑا انحصار ہے۔ تبت اور سنکیانگ صوبوں میں قومی جبر کے جذبات شدت سے پائے جاتے ہیں۔ سرمایہ داری کی استواری کے بعد جتنا زیادہ یہاں سرمایہ کاری کی گئی ہے اتنا ہی یہاں قومی جبر کے خلاف مزاحمت میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ حکومتی مداخلت کو اپنی ثقافت میں 'ہان' چینیوں کی سامراجی یلغار تصور کرتے ہیں۔ ہندوستان تبت کی قومی تحریک کو استعمال کرنے کی مسلسل کوشش میں رہتا ہے، اسی طرح ماضی میں روس نے سنکیانگ میں مداخلت کی اور اس قومی جبر کے خلاف نفرت کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح تائیوان کا مسئلہ چین کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جاپان نے تائیوان پر قبضہ کر کے اسے اپنی نوآبادی بنایا لیکن جب وہ دوسری عالمی جنگ میں شکست کھا گئے تو امریکہ نے

تائیوان کو چین میں شامل ہونے سے روکا اور وہاں چیانگ کائی شیک کو پناہ دے کر مسلط کیا گیا۔

30 جون 1997ء کو ہانگ کانگ کا کنٹرول برطانیہ سے واپس چین کو دے دیا گیا۔ چینی بیوروکریسی نے اسے ایک بہت بڑی کامیابی قرار دیا۔ اس تاریخی دن کے موقع پر برطانوی جھنڈا (یونین جیک) ہانگ کانگ سے اتار لیا گیا اور اس کی جگہ چینی پرچم لہرایا گیا۔ اس رات جنوبی چین کے سمندر میں واقع وسیع چٹان پر واقع یہ کالونی دوبارہ چین کا حصہ بن گئی۔ ہانگ کانگ انیسویں صدی کے آغاز میں ہی برطانوی تسلط میں آ گیا تھا۔ 1842ء کے نانکنگ سمجھوتے کے تحت ہانگ کانگ کے جزیرے کو برطانوی شہنشاہیت کی سلطنت کا حصہ بنا لیا گیا۔ 1889ء میں ایک اور سامراجی معاہدے کے تحت اسے دوبارہ 99 سال کی لیز پر لے لیا گیا۔ عالمی سطح پر چین کی ابھرتی ہوئی قوت کے باعث اور سرمایہ داری کا حصہ بننے کے باعث چین برطانیہ سے اس معاہدے پر عملدرآمد کرانے میں کامیاب ہوا اور یہ جزیرہ واپس اپنی تحویل میں لے لیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جب سامراجیوں نے مختلف معاہدوں کے ذریعے بندر بانٹ کی تو ہانگ کانگ کو برطانیہ کے پاس ہی اس خطے میں سامراجی اڈے کے طور پر رہنے دیا۔ 1949ء کے چینی انقلاب کے خوف سے ہانگ کانگ، سنگاپور، تائیوان، جنوبی کوریا وغیرہ کے جزیروں اور شہروں کو امریکی سامراج نے قومی قبضے اور تسلط میں بے پناہ ترقی دی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی خطہ بھی علیحدہ نہیں ہے۔ تائیوان یا فارموسا اور ہانگ کانگ چین کے جزیرے ہیں۔ جنوبی کوریا کوریائی جزیرے کا ایک حصہ ہے جسے شمال سے کاٹ کر سامراجی اڈے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی طرح سنگاپور ملایا کا ایک جزیرہ ہے۔ یہاں امریکی مشرقی کمان کے کمانڈر جنرل میکارتھر (Mc Arthur) نے جبر کے ذریعے اصلاحات کروائیں اور زمین کی حد ملکیت ایک ایکڑ مقرر کی۔ اس کے علاوہ چینی انقلاب کے ریلے کو روکنے کے لیے ان جزیروں اور امریکی سامراج نے بے پناہ سرمایہ کاری کی تاکہ یہاں چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں کسی حد تک سماجی استحکام پیدا کیا جا سکے۔ اس قسم کے ملکوں کی سرمایہ دارانہ کامیابی کی مثالیں مضحکہ خیز ہیں۔

ہانگ کانگ اور ماکاؤ کو چین میں خصوصی انتظامیہ ریجن (Special Administrative Region) کے طور پر شامل کیا گیا۔ چین میں شمولیت کے وقت ہانگ کانگ کا جی ڈی پی چین کے جی ڈی پی کا بیس فیصد تھا اور اس معیشت نے چین کے تیس لاکھ

افراد کو روزگار فراہم کر رکھا تھا۔ آج بھی ہانگ کانگ چین کا اہم تجارتی پارٹنر ہے۔ 2009ء میں امریکہ اور جاپان کے بعد ہانگ کانگ چین کا تیسرا بڑا تجارتی پارٹنر تھا اور چین میں بیرونی سرمایہ کاری کا سب سے بڑا ذریعہ۔

ہانگ کانگ میں ایک پیچیدہ انتخابی نظام کی بدولت چیف ایگزیکٹو اور قانون سازی کے لیے منتخب دیگر افراد چین کی مرضی سے ہی آتے ہیں۔ انہی جکڑ بندیوں کے خلاف ایک درمیانے طبقے کی تحریک بھی چل رہی ہے جو جمہوری اصلاحات کے مطالبے کر رہے ہیں۔ ہانگ کانگ میں ایسی تحریکیں پہلے بھی چلتی رہی ہیں لیکن یہاں کی سب سے مضبوط روایت تیانامن اسکوائر کے ساتھ یکجہتی میں چلنے والی تحریک تھی۔ آج بھی ہر سال اس واقعہ کی یاد جوش و خروش سے منائی جاتی ہے۔

لیکن چین کے لیے سب سے اہم مسئلہ تائیوان کا ہے جو زمینی طور پر چین سے جدا ہے۔ دیگر قومی مسائل سے ہٹ کر یہاں 1949ء سے ہی چینی ''کمیونسٹ'' نئی حکومت کی ایک مخالف حکومت قائم ہے۔ اسے عالمی سطح پر تو چین کا حصہ تسلیم کیا جاتا ہے لیکن کچھ ممالک آج بھی تائیوان کی حکومت کو ہی تائیوان سمیت پورے چین کی حکومت مانتے ہیں۔ جبکہ امریکہ اس مسئلے کے چین کے ساتھ 'پرامن' حل کے لیے جارحیت کے لیے بھی تیار ہے۔ چین کے ساحل سے سو میل کے فاصلے پر واقع یہ جزیرہ جدید بندرگاہوں اور امریکی ایئر بیسوں سے لیس ہے۔ یہاں سے نہ صرف چین کے جنوب مشرقی ساحلوں سے ہونے والی تجارت پر نظر رکھی جا سکتی ہے بلکہ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ سے چین، کوریا اور جاپان جانے والے تجارتی راستوں کی بھی نگرانی ہو سکتی ہے۔ امریکی جنرل ڈگلس میکارتھر تائیوان کو 'کبھی نہ ڈوبنے والا بحری بیڑہ' اور آبدوز قرار دیتا تھا۔ امریکی یہاں سے ویت نام اور کوریا کی جنگ میں مداخلت سے لے کر چین میں کمیونزم مخالف پراپیگنڈہ پھیلاتے رہے ہیں۔ کومنتانگ کے ذریعے چین پر بہت سے حملے بھی یہاں سے کروائے گئے۔ عسکری کاروائیوں سے زیادہ یہاں کی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور ترقی چین کے عوام کو متوجہ کرنے کا زیادہ بڑا ہتھیار رہی ہے۔ 1971ء تک اقوام متحدہ میں چین کی نمائندگی تائیوان میں ہی قائم ریپبلک آف چائنہ کے ذریعے کی جاتی رہی۔ امریکی صدر رچرڈ نکسن کے 1972ء کے چین کے دورے سے پہلے پیپلز ریپبلک آف چائنہ کو اقوامِ متحدہ میں چین کی نمائندگی ملی۔ لیکن جہاں ماؤ اور نکسن نے اپنے تعلقات کو استوار کیا وہاں امریکہ نے تائیوان کی فوجی امداد جاری رکھی جس کے باعث تائیوان چین کا مکمل حصہ نہیں بن سکا۔ چین میں سرمایہ داری کی استواری کے بعد بھی امریکہ تائیوان

کے ذریعے چین پر دباؤ رکھنے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ وہاں نام نہاد آزادی کی تحریکوں کی حمایت کے ساتھ ساتھ ایف 16 جہازوں کی فروخت اور دوسرے حربوں کا استعمال جاری ہے۔ لیکن امریکی مسلط کردہ تحریکوں کے علاوہ تائیوان میں محنت کش طبقے کی ایک تحریک بھی ہے۔ تائیوان میں جدید صنعت میں کام کرنے والا محنت کش طبقہ بھی موجود ہے جس کے مفادات خطے کے دیگر محنت کشوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

سرمایہ داری کے زوال اور معیشت کے بحران میں حکمران طبقات اور سامراجی قوتیں قومی تعصّبات کو بھڑکانے کی کوشش کریں گی تاکہ محنت کش طبقے کی جڑت میں دراڑیں ڈالی جاسکیں۔ سرمایہ دارانہ استواری سے چین میں قومی جبر اور نسل پرستی زیادہ شدت پکڑ گئی ہے۔ چین کی یہ سرمایہ دار اشرافیہ چینی شاونزم کو استعمال کرتی رہی ہے۔ آنے والے دنوں میں اس قومی شاونزم کو صرف طبقاتی جدوجہد اور یکجہتی سے ہی شکست دی جاسکتی ہے۔ اس سامراجی یلغار اور سرمایہ دارانہ استحصال کا خاتمہ صرف محنت کش طبقے کی جڑت اور جدوجہد کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔ صرف بالشویک طرز پر ایک سوشلسٹ انقلاب ہی تمام قومی تعصّبات کا خاتمہ کر کے ایک ایسا سماج تخلیق کر سکتا ہے جہاں ہر قسم کا جبر ختم ہو جائے۔

باب 12

چین کدھر؟

چین کا موجودہ صدر شی جن پنگ (Xi Jinping) مارچ 2013ء میں برسر اقتدار آیا تو عالمی ذرائع ابلاغ ترقی اور خوشحالی کے ایک نئے دور کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ یہ صدر پہلے سے زیادہ پر اعتماد اور با صلاحیت ہے اور چین کی عالمی سرمایہ داری سے جڑت کو مزید مضبوط کرے گا۔ اسی دوران دس سال صدر رہنے والے ہو جن تاؤ (Hu Jintao) اور اس کے وزیر اعظم وین جی بیاؤ بڑے پیمانے کی کرپشن کے الزامات کا سامنا کر رہے تھے۔ نیو یارک ٹائمز نے رپورٹ دی کہ اپنے اقتدار کے دوران وین جی بیاؤ کے خاندان نے 2.7 ارب ڈالر سے زائد کی دولت خرد برد کی۔ صدر ہو جن تاؤ کا اکلوتا بیٹا افریقی اور یورپی ممالک سے کاروبار

میں کروڑوں ڈالر کے فراڈ کے مقدمات کا سامنا کر رہا تھا۔

شی جن پنگ کا ہو جن تاؤ کے دس سالہ دور کے بعد میں آنا چین میں اقتدار کی منتقلی کے متعلق بھی اہم سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ ابھی تک یہ ایک معمہ ہے کہ چین میں نئے صدر اور وزیر اعظم کا انتخاب کیسے اور کیونکر ہوتا ہے۔ چین میں مغربی ممالک کی طرز پر نہ ہی کوئی سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے اور نہ ہی آمریت۔ سٹالنسٹ طرز پر سوویت یونین اور منصوبہ بند چین میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرح یہاں بھی بیوروکریسی میں موجود اعلیٰ اہلکاروں کی ملی بھگت اور پسند و ناپسند سے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ بظاہر چین میں سیاسی طریقہ کار وضع کیا گیا ہے جس کے مطابق چین کی واحد پارٹی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ 2011ء میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد تقریباً 8 کروڑ کے لگ بھگ تھی جو کل آبادی کا تقریباً 6 فیصد بنتا ہے۔ اس پارٹی میں اب سرمایہ داروں سمیت سماج کے ہر شعبے سے ممبران موجود ہیں۔ پارٹی کے ذریعے ہی حکومت، فوج، معیشت، ثقافتی اور تعلیمی اداروں میں تقرریاں کی جاتی ہیں۔ پارٹی ہی تمام پالیسیاں ترتیب دیتی ہے اور ان پر عملدرآمد کے لیے ریاستی ڈھانچوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔

تحریری طور پر ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ نیشنل پیپلز کانگریس کے پاس ہے جس کے مندوبین کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ 2013ء میں ''پیپلز'' کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں 31 ارب پتی (ڈالروں میں) تھے۔ جبکہ اسی کانگریس کے ساتھ ہونے والی عوامی سیاسی مشاورتی کانفرنس میں 52 ارب پتی تھے۔ یہ وہ ارب پتی ہیں جو قانونی طور پر اپنے اثاثوں کا اعلان کر چکے ہیں۔ غیر قانونی اور غیر اعلان کردہ ارب پتیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کانگریس کی منتخب کردہ مرکزی کمیٹی کی میٹنگ سال میں ایک یا دو دفعہ محض رپورٹیں سننے کے لیے منعقد کی جاتی ہے۔ اس کے ممبران کی تعداد دو سو سے چار سو کے درمیان ہوتی ہے۔ مرکزی کمیٹی اپنے اختیارات پولٹ بیورو کو تفویض کرتی ہے جس کے ممبران کی تعداد 22 ہے اور وہ ہر مہینے میٹنگ کرتے ہیں۔ لیکن چین میں پولٹ بیورو سے بھی زیادہ طاقتور ادارہ پولٹ بیورو سٹینڈنگ کمیٹی (PBSC) ہے جس کے ممبران کی اس وقت تعداد 7 ہے۔ یہی 7 افراد چین کے تمام اہم امور پر فیصلے کرتے ہیں اور آئندہ قیادت کا فیصلہ بھی کرتے ہیں۔ پچھلے صدر ہو جن تاؤ کے وقت PBSC کے ممبران کی تعداد 9 تھی جن میں سے 7 ایک ساتھ ریٹائر ہوئے۔ دو بچ جانے والوں میں سے ایک اس وقت صدر اور دوسرا وزیر اعظم ہے۔

چین کا صدر ریاست کا سربراہ ہوتا ہے اور اس عہدے کے ساتھ پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور سنٹرل ملٹری کمیشن کے چیئرمین کا عہدہ بھی رکھتا ہے۔ ماؤ کے بعد ریاست کے چیئرمین کا عہدہ اس کے اعزاز میں ختم کر دیا گیا تھا۔ ماؤ نے ملٹری کمیشن کے چیئرمین کے عہدے کو ثقافتی انقلاب میں بھرپور انداز میں استعمال کیا تھا۔ ماؤ کے بعد ڈینگ کو اقتدار دلانے میں فوج میں ماؤ کے جانشین ہوگواؤ ینگ (Hua Guofeng) نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ڈینگ نے عہدوں کی بجائے پارٹی، فوج اور بیوروکریسی میں اپنے ذاتی تعلقات کے ذریعے حکومت کی۔ اس کا سب سے بڑا عہدہ نائب وزیراعظم کا تھا۔ 1989ء کے بعد جب جیانگ زمن چین کا صدر بنا اس وقت ڈینگ کے پاس واحد عہدہ تاش کھیلنے والی ایسوسی ایشن (Bridge Playing) کا اعزازی چیئرمین تھا۔ لیکن اس کے باوجود 1997ء میں اپنی وفات تک وہ چین کا طاقتور ترین شخص تھا۔

جیانگ زمن نے 2002ء میں اقتدار ہوجن تاؤ کو دیا۔ اس دوران چین نے بلند ترین شرحِ ترقی حاصل کیا اور منصوبہ بند معیشت کو حتمی طور پر ختم کرتے ہوئے سرمایہ داری کو چین میں استوار کیا۔ اب شی جن پنگ ایک نئے عہد میں برسرِ اقتدار آیا ہے۔ اس کا والد شی ژانگ شن 1930ء کی دہائی میں گوریلا جنگجو تھا اور انقلاب کے بعد ماؤ کا ڈپٹی وزیراعظم بنا۔ ثقافتی انقلاب کے دوران وہ ماؤ کے زیرِ عتاب آیا اور اسے کئی سال نظر بند رکھا گیا۔ ماؤ کے بعد ڈینگ کے برسرِ اقتدار آنے پر وہ دوبارہ اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوا۔ چین میں سرمایہ داری کی بنیاد رکھنے کے حوالے سے اس کا کردار اہم ہے کیونکہ اس نے شینزن (Shenzhen) اکنامک زون کی بنیاد رکھی تھی۔ شی کے برسرِ اقتدار آنے پر اس کے باپ کے کردار کو مزید نمایاں کیا جا رہا ہے۔ موجودہ صدر خود بھی ثقافتی انقلاب کے دوران اپنے پر ہونے والے جبر کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جب اسے محض دیہاتوں میں داخلی جلاوطنی کا شکار ہونا پڑا۔ ماضی کے انقلابیوں کی برسرِ اقتدار اولادوں کو ذرائع ابلاغ 'شہزادے' کہتے ہیں جو آج ارب پتی ہو چکے ہیں۔

موجودہ صدر بھی مہنگی گاڑیوں کا شوقین ہے اور اس کے شاہانہ طرزِ زندگی کے بہت سے قصے میڈیا میں آتے رہتے ہیں۔ اس کی بیوی پینگ لی یوان (Peng Liyuan) بھی خبروں کا موضوع بنی رہتی ہے۔ چین کی مشہور ملٹری فوک گلوکارہ اور میجر جنرل کو پہلی دفعہ خاتونِ اول کا لقب دیا جا رہا ہے۔ ڈینگ کے برسرِ اقتدار آنے پر ماؤ کی بیوی کی گرفتاری کے بعد چینی افسر شاہی

اپنی بیویوں کو منظر عام پر نہیں لاتی تھی۔ لیکن اب صدر اور خاتون اول کسی شاہی جوڑے کی مانند چین پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

شی کی شخصیت کی تشہیر سے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اس طرح مشکل معاشی اور سیاسی فیصلے کرنے میں مدد ملے گی اور وہ سخت فیصلے کر سکے گا لیکن دوسری طرف تمام تر بحرانوں اور سماجی انتشار کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوگی۔ جدلیاتی طور پر اس کی شخصیت کو جتنا زیادہ ابھارا جا رہا ہے اور اس کی ریاست پر مضبوط گرفت کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اتنی ہی چینی ریاست داخلی تضادات کا شکار ہے اور اس کی اشرافیہ باہمی ٹکراؤ کے عالم میں ہے۔ شی نے آتے ہی سٹینڈنگ کمیٹی کے ریٹائر ہونے والے چند سینئر افراد کے خلاف کرپشن کے مقدمے قائم کر دیئے۔ ہو جن تاؤ کی صدارت میں تمام تر داخلی معاملات کا سربراہ ژو یانگ کینگ (Zhou Yongkang) تھا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور عدلیہ سمیت تمام داخلی معاملات اسی کی زیرِ نگرانی کام کر رہے تھے۔ شی نے برسرِ اقتدار آتے ہی یہ تمام اختیارات اپنے پاس رکھے اور سٹینڈنگ کمیٹی کے افراد کی تعداد 9 سے کم کر کے 7 کر دی گئی۔ اس کے بعد Zhou کیخلاف بدعنوانی کے مقدمات قائم کر کے تفتیش کا آغاز کر دیا۔ اس کے بہت سے قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر کے تفتیش کا آغاز کر دیا گیا۔ دو لاکھ کے قریب افراد کو جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے جن میں سے کئی خودکشی پر مجبور ہو گئے۔ یہ صورتحال چین کے حکمران طبقے کی داخلی کشمکش اور انتشار کی وضاحت کرتی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی

کمیونسٹ پارٹی کا مستقبل کیا ہے؟ جب تک معیشت میں استحکام تھا اس وقت تک کمیونسٹ پارٹی کی قیادت صورتحال کو قابو میں رکھنے اور کسی حد تک سماج اور پارٹی کے اندر استحکام برقرار رکھنے میں کامیاب رہی لیکن اب باہمی تضادات کا آغاز ہو چکا ہے جس کا اظہار صدر شی کی جانب سے بدعنوانی کیخلاف ایک مہم کے آغاز میں ہوتا ہے۔ چینی ذرائع ابلاغ میں اس مہم کا یہ واویلا ہے کہ موجودہ صدر بدعنوانی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے پرعزم ہے۔ لیکن اس کا مقصد بدعوانی کا خاتمہ نہیں کیونکہ اس صورت میں تو چین کی پوری ریاست ہی منہدم ہو جائے گی۔ اس کا مقصد اپنے سیاسی مخالفین کو ختم کرنا ہے۔ حکمران طبقے کے باہمی تضادات اسے کمزور کرنے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ بظاہر مضبوط نظر آنے والی دیوہیکل پارٹی کو جب کسی بڑے سنجیدہ طوفان، کسی بڑے معاشی بحران، کسی بڑے طبقاتی تصادم، قومی تصادم یا کسی بھی طرح کے سماجی تصادم کا سامنا کرنا پڑا تو

مختلف دھڑے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی، ماضی کی کمیونسٹ پارٹیوں کی طرح نہ پارٹی ہے اور نہ ہی کمیونسٹ۔ 1949ء میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد سے کمیونسٹ پارٹی ہمیشہ ریاستی ڈھانچے کا حصہ اور افسر شاہی کا ٹولہ رہی ہے۔

تاہم بڑے دھماکہ خیز واقعات کے باعث ریاست پر اس کی گرفت ٹوٹ سکتی ہے۔ روس کی بیوروکریسی کے ضمن میں یہ کام ایک اضطراری طریقے سے ہوا۔ سابقہ دیوہیکل سٹالنسٹ پارٹی (CPSU) کئی ایک دھڑوں میں بٹ گئی تھی جو مختلف گروپوں کے مفادات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس میں کئی ایک کمیونسٹ پارٹیاں بھی برآمد ہوئیں جن میں سے کچھ حقیقی معنوں میں مزدوروں کی پارٹیاں تھیں۔ چین میں یہی عمل مستقبل میں مختلف پیمانے پر دہرایا جاسکتا ہے لیکن اتنی زیادہ دولت کی سرائیت سے اس کے کسی دھڑے کے مزدوروں کی حقیقی پارٹی بننے کے امکانات نہایت ہی مخدوش ہیں۔ اس وقت معاملات پر چین کی بیوروکریسی کو کنٹرول حاصل ہے۔ اور پارٹی کو سرمایہ داری کی ترویج کیلئے استعمال کیا جارہا ہے۔

ایک بات یقینی ہے کہ یہ عمل اتنا آسان نہیں ہوگا۔ جیسے جیسے نوخیز سرمایہ دارانہ معیشت نئے تضادات کو جنم دے گی اس سے پارٹی کی بالائی سطح پر ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگی۔ دراصل اس طرح کی تقسیم پہلے ہی موجود ہے جیسا کہ ملکیتی حقوق کے قوانین میں مزید تبدیلیوں کے حوالے سے تصادم سے نظر آیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے اندر موجود اس تقسیم کے عمل کو بحیثیت مجموعی دیکھنا پڑے گا اور جائزہ لینا پڑے گا کہ یہ کہاں جارہا ہے۔ یہ اس نکتے پر جا پہنچا ہے جہاں سرمایہ دارانہ رشتے استوار کیے جاچکے ہیں۔ اجرتی محنت اور سرمائے کے درمیان تفریق' منڈی کی مقابلہ بازی' منافع کی قوتِ محرکہ اور اس طرح کے دیگر عوامل موجود ہیں۔ اب بھی پرانے نظام کی مضبوط باقیات موجود ہیں لیکن یا تو ان کی نجکاری کی تیاری ہورہی ہے یا پھر وہ ریاستی سرمایہ دارانہ کمپنیوں کی حیثیت سے کام کررہی ہیں۔ ہمیں اس ریاستی شعبے کو مدِ نظر رکھنا چاہیے لیکن ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ معیشت میں نجی شعبہ بھی متحرک ہے اور سرمایہ دارانہ بحالی کی تحریک کو مستحکم کیا جاچکا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اتنے بڑے ملک کی دیوہیکل بیوروکریسی کے اندر باہم متصادم رجحانات مخالف دھڑے ہوں جن کے خیالات اور مفادات ایک دوسرے سے متضاد ہوں۔ ایک دھڑا ایسا ہے جو تمام تر عمل کے اوپر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس عدم استحکام کی وجہ سے متفکر ہے جو اس سرمایہ دارانہ استواری کی وجہ سے پیدا ہورہا ہے۔ وزیرِ اعظم اور صدر کو بھی یہ تفکرات لاحق ہیں

کیونکہ انہیں وہ خطرات نظر آ رہے ہیں جو مسلسل عدم توازن اور دھڑے بندیوں کی وجہ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ دھڑا چاہتا ہے کہ عوام کو لگنے والی چوٹوں کی شدت کم کرنے کیلئے اصلاحات کی جائیں۔ چونکہ انہیں نیچے سے انقلاب کا خطرہ ہے اس لئے وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ کم ترقی یافتہ علاقوں میں کچھ سرمایہ کاری کی جائے اور سماجی شعبے میں زیادہ اخراجات کیے جائیں۔

ان کا سرمایہ داری سے کوئی حقیقی اختلاف نہیں اور وہ سرمایہ داری کی ترقی اور استحکام کو روکنے کیلئے کوئی سرگرم مداخلت نہیں کریں گے لیکن انہیں یہ فکر لاحق ہے کہ عدم مساوات اور بڑھتے ہوئے سماجی اضطراب کی وجہ سے کسی لمحے پرولتاریہ کی انقلابی تحریک بھڑک سکتی ہے۔ بلاشبہ وہ درست ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ پرانے سٹالنسٹ ڈھانچے کو برقرار رکھنے کا نتیجہ بھی کسی لمحے عوام کی تحریک کی صورت میں برآمد ہو سکتا ہے اور بالآخر سارا نظام منہدم ہو سکتا ہے۔ اس لئے بیوروکریسی کا یہ دھڑا اس عمل کو پیچھے کی طرف نہیں لے جائے گا بلکہ وہ عوام کا کرب کم کرنے کیلئے چند سماجی اصلاحات متعارف کروانے کی کوشش کریں گے۔

چین کے مشرقی علاقوں کی بیوروکریسی (جس کی نئے سرمایہ دار طبقے کے ساتھ انتہائی گہری جڑت ہے) سمجھتی ہے کہ یہ عمل انتہائی کلیدی ذرائع کو صنعتی ترقی سے نکالنے کے مترادف ہے۔ اس عمل کو آہستہ کرنے کے بجائے وہ اس کو تیز کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پرانے نظام کی باقیات کو ختم کر دیا جائے۔ اس لئے موجودہ تصادم سرمایہ داری کے حامیوں اور ''واپس لوٹنے'' والوں کے درمیان نہیں۔ یہ تصادم اس نکتے پر ہے کہ بحیثیت مجموعی نظام کو استحکام کیسے فراہم کیا جا سکتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ بالآخر اس عمل کے نتیجے میں کمیونسٹ پارٹی ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں زیادہ عدم استحکام جنم لے گا۔ یوں اس وقت بیوروکریسی کے اندر تضادات موجود ہیں اور ان کی عکاسی مختلف قانون سازیوں یا بدعنوانی کیخلاف مہم میں ہوتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئی ہے کہ یہ عمل سیدھی لکیر میں چلنے والا نہیں اور اس کا براہِ راست تعلق سماج اور معیشت کی کیفیت اور طبقاتی کشمکش کی شورش کی سطح سے ہے۔

معیشت کا تناظر

2014ء میں چین کا گروتھ ریٹ (شرحِ نمو) کم ہو کر 7.3 فیصد پر آ گیا جو گزشتہ

24 سالوں میں سب سے کم ہے۔ سولہ برسوں میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ حکومت اپنا مقرر کردہ گروتھ ریٹ کا ہدف حاصل نہیں کر سکی جو 7.5 فیصد تھا۔ 2015ء کے لیے آئی ایم ایف نے چین کی شرحِ ترقی کا اپنا ہی مقرر کردہ ہدف 7.1 فیصد سے کم کر کے 6.8 فیصد کر دیا ہے۔ فنانشل ٹائمز کے مطابق 2014ء میں چین کے 31 میں سے 30 صوبے اپنی ترقی کا ہدف حاصل نہیں کر سکے۔ جس صوبے نے اپنا ہدف حاصل کیا وہ تبت ہے جو چین کی سب سے چھوٹی معیشت ہے۔ یہ اعداد و شمار چین کے 'معجزاتی' عروج کی تنزلی کے انجام کے آغاز کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ سرمایہ داری کا بحران دنیا کی سب سے زیادہ برآمدات کرنے ولی معیشت (''مصنوعات کی پیداوار کے انجن'') میں داخل ہو رہا ہے۔

بظاہر 2008ء میں عالمی سطح پر آنے والے بدترین معاشی بحران سے چین عارضی طور پر بچ نکلا تھا۔ 2008ء میں جب جی ڈی پی کا سالانہ گروتھ ریٹ 14.2 فیصد سے گر کر 9.8 فیصد ہوا تو حکومت نے 586 ارب ڈالر کے ایک پیکیج کا اعلان کیا۔ اس پیکیج کا حجم تو امریکہ کے بیل آؤٹ پیکیج جتنا ہی تھا لیکن چین کی معیشت امریکی معیشت کے ایک تہائی تھی۔ چینی حکام 2008ء میں پھٹ کر سامنے آنے والے بحران کی نوعیت اور شدت کو درست طور پر نہیں سمجھ سکے تھے اور انہوں نے سمجھے رکھا کہ یہ معمول کا بحران ہے جو آیا ہے اور جلد ٹل جائے گا۔ اور ہماری پالیسیاں جوں کی توں جاری رہیں گی۔ 586 ارب ڈالر کے پیکیج کی وجہ سے مرکزی حکومت کے قومی قرضوں کی شرح میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چین کا قومی قرضہ ماضی میں بہت ہی سست روی سے بڑھتا آ رہا تھا۔ 1978ء میں اس کی شرح صفر تھی۔ 1997ء میں یہ 7 فیصد تک آیا۔ 2003ء میں 20 فیصد سے کچھ ہی کم، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے عالمگیر بحران کی کیفیت میں پبلک اخراجات کے ضمن میں یہ قرضہ 2010ء میں 37 فیصد کو چھو رہا تھا۔ اس وقت ریاست کی جانب سے بڑے پیمانے پر قرضوں کی فراہمی سے معیشت کو وقتی سہارا ملا۔ لیکن اس کے باوجود عالمی سرمایہ داری کا حصہ ہونے کے باعث چین متاثر ہو رہا تھا اور اس کی برآمدات میں کمی آ رہی تھی۔ اس موقع پر ریاست نے انفراسٹرکچر میں بھاری سرمایہ کاری کی جس کے باعث معیشت چلتی تو رہی اگرچہ پہلے کی نسبت اس کی شرحِ ترقی کم ہو چکی تھی۔ ان اقدامات کی بھی مالیاتی معیشت کو بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعمیرات اور بھاری صنعت میں وسیع پیمانے پر زائد صلاحیت پیدا ہو گئی۔ پراپرٹی اور دیگر شعبوں میں 'Speculative' بلبلے بننے کے باوجود ریاست نے اس عمل کو جاری رکھا۔

عالمی سطح پر سرمایہ دار چین پر امیدیں لگائے بیٹھے تھے اور خیال کر رہے تھے کہ چین کی معیشت پوری دنیا کو معاشی زوال سے باہر نکال لے گی۔ لیکن جس طرح مارکسیوں نے نشاندہی کی تھی کہ اس سے صرف عارضی افاقہ ہوا جبکہ معیشت میں بڑے بلبلے پھولتے چلے گئے۔ پراپرٹی کی منڈی پھیلتی گئی اور 2010ء میں اپنی انتہا پر ایک اوسط گھر کی قیمت ایک خاندان کی اوسط آمدن سے بارہ گنا زیادہ تھی۔ اس پروگرام کے باعث 2012ء تک معیشت 9 فیصد سے زیادہ شرح تک ترقی کرتی رہی۔ لیکن اب پراپرٹی کے بلبلے سے ہوا نکلنی شروع ہوگئی تھی۔ اس کے بعد سے چین کی شرحِ ترقی ہر سال کم ہوتی جا رہی ہے۔

چین نے جب ابھرنا شروع کیا تھا تو بہت سے لوگوں نے اسے سرمایہ دارانہ نظام کے درخشاں مستقبل کی ضمانت سمجھنا شروع کر دیا تھا (ان میں کچھ خود کو مارکسسٹ کہلانے والے بھی شامل تھے)۔ لیکن چین کے ابھار نے صرف سرمایہ دارانہ نظام کے اندرونی تضادات کو تیز کرنے کا ہی کام کیا۔ ایک عرصے تک کیلئے تو چینی معیشت کی دھماکہ خیز ترقی نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو آکسیجن فراہم کیے رکھی۔ اب یہ عظیم الشان سہولت اپنی الٹ میں تبدیل ہو کر عظیم الشان جھنجلاہٹ بن چکی ہے۔ چینی معیشت میں کی جانے والی بے تحاشا سرمایہ کاری نے بھاری مقدار میں سستی اشیا کی شکل میں اپنا اظہار کیا جسے چین سے باہر اپنے لئے منڈیاں درکار پڑتی گئیں۔ عالمگیر سطح پر پیداوار کرنے والوں کیلئے چین کی سستی اشیا کی بھرمار نے ایک دہائی سے زائد عرصے میں زائد پیداوار کے بحران کو اور بھی شدید کیا ہے۔

دیہی علاقوں سے سستی محنت کی بے پناہ فراہمی، جدید مشینری اور تکنیک جسے بھاری ریاستی سبسڈی کی پشت پناہی حاصل تھی، ان سب عوامل نے مل کر چین کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ ایک طاقتور صنعتی بنیاد تعمیر کر سکے۔ اس کیفیت نے دنیا بھر میں روزگار اور صلاحیتوں کو تاراج کیا۔ جن ملکوں میں مقابلے کی صنعت اور صلاحیت تھی، وہاں فیکٹریاں بند ہوتی چلی گئیں۔ چین سے سستی اشیا کے بہاؤ کی وجہ سے غیر ملکی کمپنیاں دہل کے رہ گئیں۔ شروع شروع میں تو شرحِ منافع بہت ہی زیادہ تھا لیکن جیسا کہ مارکس واضح کرتا ہے کہ پھر جب دوسرے ملکوں کے سرمایہ دار اشیا کا ذخیرہ کر لیتے ہیں تو شرحِ منافع عمومی سطح پر واپس آ جاتا ہے۔ چین میں ہم اس وقت یہی ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ بے تحاشا ترقی کا دور اپنی حدود کو پہنچ چکا۔ اب چین کو ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے جو سرمایہ دارانہ معیشت کا مقدر بن جاتا ہے۔

چین کی کم قیمت کی حامل اشیا نے قریب قریب ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لیکن جونہی کسی ایک مخصوص صنعت کے حوالے سے عالمگیر پیداوار کی بھاری تعداد چین میں داخل ہوئی تو زائد صلاحیت جلد ہی پھلنے پھولنے لگی۔ اب ان کے چینی معیشت کی اس زائد پیداوار (زائد صلاحیت) کی وجہ سے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے ہیں۔ دنیا کی دوسری بڑی معیشت ایک بہت بڑے خطرے کی زد میں آ چکی ہے۔

کینیشین اسٹ (ریاستی سرمایہ داری) طرزِ معیشت کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا تجربہ تھا۔ لیکن اب تضادات کا تناؤ شدت اختیار کر گیا ہے۔ اب وہ سبھی صنعتیں جو کہ اس محرکاتی پیکیج سے مستفید ہوئی تھیں، جن میں فولاد سے لے کر جہاز رانی اور دھات پگھلانے تک شامل ہیں، زائد صلاحیت (جسے زیادہ بہتر الفاظ میں زائد پیداوار کی گنجائش کہا جانا چاہئے) کے ہاتھوں مفلوج ہو کے رہ گئی ہیں۔ چینی معیشت میں پیدا ہونے والی سست روی بے تحاشا نقصانات کا باعث بنے گی جس کے نتیجے میں صنعتی تنزلی کا ایک تکلیف دہ عمل ضرورت بن جائے گا۔

اپنی 17 جون 2013ء کی اشاعت میں فنانشل ٹائمز لکھتا ہے کہ ''کیمیکلز سے لے کر سیمنٹ اور فلیٹ سکرین ٹیلی ویژنوں تک چینی صنعت اشیا کی اس قدر فراوانی کا شکار ہو چکی ہے کہ جس کی وجہ سے چین کے اندر اور باہر منافعوں میں بہت کمی واقع ہوتی جا رہی ہے اور اس کمی کی وجہ سے چین کی کمزور ہوتی معیشت کی نقاہت اور بھی بڑھ جائے گی۔''

چین ایلومینیم اور سٹیل کی عالمی پیداوار کا تقریباً نصف جبکہ سیمنٹ کی پیداوار کا 60 فیصد پیدا کرتا ہے جبکہ پیداوار میں ہونے والا مزید اضافہ اس پر مستزاد ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک ایسی کیفیت میں ہو رہا ہے کہ جب معیشت سست روی کا شکار ہے اور برآمدات کی منڈیاں سکڑ رہی ہیں۔ اگرچہ چین کی فولاد کی صنعت اس وقت بامِ عروج پر ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ اپنی پیداواری صلاحیت کا محض 80 فیصد ہی استعمال کر رہا ہے۔ صنعت سے وابستہ سربراہان اور متعلقہ افسران کا کہنا ہے کہ ہمیں ابھی مزید اس استعمال میں کمی لانا پڑے گی تاکہ شعبے میں توازن کو واپس لایا جا سکے۔ صرف فولاد ہی نہیں سیمنٹ کی صنعت کا بھی یہی حال ہے۔ چین کی انٹرپرائز (صنعتی کاروبار) کنفیڈریشن کے مطابق 2013ء میں سیمنٹ کی دو تہائی پیداوار کو کام میں لایا جا سکا ہے۔

اوشا ہیلے نے 17 جون 2013ء کے فنانشل ٹائمز میں لکھا کہ ''یہاں بے پناہ زائد صلاحیت موجود ہے جبکہ طلب اور رسد میں توازن کیلئے کوئی مناسب بندوبست نہیں۔ ہم دیکھتے

ہیں کہ یہاں دی جانے والی سبسڈی یہاں کی کل صنعتی پیداواری آمدنی کے 30 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ نتیجتاً بہت سی کمپنیاں سبسڈی نہ ملنے کے باعث دیوالیہ ہو جائیں گی۔''

''آٹو موبائل کے شعبے میں زائد صلاحیت بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر گیلی (Geely) جس نے 2010ء میں Volvo کو خریدا تھا، اس کمپنی کے 2011ء کے نقد منافعے براہِ راست سبسڈی (ریاستی مالی امداد) سے ہی حاصل ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سال Geely کو سبسڈی سے ملنے والی آمدنی کی شرح ''Fathom China'' کے تجزیے کے مطابق، اس کے دوسرے بڑے منافع بخش ذریعے، سکریپ کی فروخت سے حاصل ہونے والے منافعوں سے 15 گنا زیادہ رہی۔''

چینی معیشت میں بڑھی ہوئی زائد پیداواری صلاحیت اور کم ہوتی شرح نمو یہ عندیہ دیتی ہے کہ بہت زیادہ تعداد میں لوگ دیوالیہ ہوں گے۔ جس کے مضمرات لامحالہ چین کے ہر طبقے کے لوگوں کی نفسیات پر بہت شدید اور گہرے گے۔

طبقاتی جدوجہد کا تناظر

چینی معیشت کی سبھی کامیابیاں اور کامرانیاں چین کے محنت کشوں کی ہی مرہون منت ہیں جو کہ وکٹوریہ عہد کے برطانیہ کے محنت کشوں کی طرح انتہائی نامناسب کم اجرتوں پر کام کرنے پر مجبور چلے آرہے ہیں۔ چین جسے اپنے تئیں سوشلسٹ چین سمجھا اور قرار دیا جاتا ہے وہاں دنیا کی امارت اور غربت کی سب سے بڑی خلیج ہے۔ چین کے اندر ایک نئی بورژوازی پیدا ہو چکی ہے اور وہ بھی اس قسم کی مراعات سے لیس ہے کہ جس کا آبادی کا بہت بڑا حصہ تصور تک بھی نہیں کرسکتا ہے۔

چین پر ایک انتہائی چھوٹی لیکن ایک انتہائی غیر معمولی امیر ترین اقلیت کا تسلط ہے جو ایک طرف ریاست کو کھا رہی ہے تو دوسری طرف یہ چین کے محنت کشوں کا بھی بدترین استحصال کرتی چلی آرہی ہے۔ لیکن چین کے سرمایہ دار طبقے کی بنیادیں انتہائی خستہ ہیں۔ ڈیڑھ ارب کی آبادی کے ملک میں کروڑ پتیوں (امریکی ڈالروں کے حوالے سے) کی تعداد 1.2 ملین ہے جو کہ کل آبادی کا 0.1 فیصد ہے۔ ان کروڑ پتیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے لیکن اس سے صاف واضح ہوتا

ہے کہ چین کی سرمایہ داری کس قدر کمزور اور ناہموار ہے۔ یہ تعداد اٹلی یا برطانیہ میں موجود کروڑ پتیوں کی مجموعی تعداد سے بھی کم ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے نیچے ان سے کم لوٹنے والے فیکٹری منیجروں، ڈائریکٹروں، فورمینوں، انجینئروں، افسر شاہی اور دیگر بیوروکریٹوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو کہ ریاست اور پارٹی کے اداروں پر براجمان ہے۔ اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ مل کر یہ لوگ ایک اسٹیبلشمنٹ تشکیل دیئے ہوئے ہیں۔

آج دنیا بھر میں استعمال ہونے والے تعیش کے ساز و سامان کی 35 فیصد کھپت چین میں ہوتی ہے۔ ''بارکلیز کیپٹل'' کے مطابق اس شعبے کی 70 سے 80 فیصد شرح پیداوار چین کی کھپت میں اضافے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ 2013ء میں چین کی پر تعیش مصنوعات کی منڈی 18.9 ارب ڈالر تک پہنچ گئی تھی۔ ''BNP پاری باس'' (بینک) کے مطابق 2020ء یہ تک چار گنا بڑھ جائے گی۔ چین کی اشرافیہ 90 ارب یورو اس شعبے میں خرچ کر رہی ہے۔ جبکہ پر تعیش مصنوعات کی قیمتیں یورپ کی نسبت 40 سے 50 فیصد زیادہ ہیں۔ 2014ء میں چین کے بالادست طبقات کے خاندانوں نے بیرونِ ملک عیاشی کے لئے 10 کروڑ دورے کئے۔ ان میں زیادہ تر ''شاپنگ'' کے لئے تھے۔ جبکہ اس وقت چین کی کل آبادی میں سے صرف 4 فیصد کے پاس پاسپورٹ ہیں۔ لیکن اس سب کو مدنظر رکھنے کے باوجود بھی آبادی کی ایک بہت بڑی اکثریت نہ صرف معاشی دولت سے محروم ہے بلکہ اس طاقت سے بھی جو اس کی بدولت میسر آتی ہے۔ دولت کے اس بدترین ارتکاز کے حامل امیروں، ان کے امیرزادوں اور امیرزادیوں کو عوام کی جانب سے مسلسل حقارت اور مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ اور خاص طور پر اس کیفیت میں کہ جب چین کو ''سوشلسٹ'' ملک تصور کیا جاتا ہے۔ ہر ادارے میں ہر سطح پر ہونے والی مکروہ ترین بدعنوانی نے اس حقارت و نفرت کو اور بھی شعلہ انگیز بنا دیا ہے۔

چند ایک انتہائی بدعنوان افسروں کو پھانسی کی سزاؤں کا بھرپور پروپیگنڈہ کر کے ان کو عبرت کا نشان بنانے کی مہم درحقیقت اس لئے مشہور کی جاتی ہے کہ ان کی مدد سے عام چینیوں کے غم و غصے کو کم کیا جائے۔ جبکہ اس سے یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ بدعنوانی کی شرح کو بھی روکا جا سکے جو معیشت کو اتنا کھوکھلا کر رہی ہے کہ اس کے پورے ڈھانچے کے وجود کو خطرہ ہے۔ لیکن بدعنوانی اور لوٹ کھسوٹ ایک افسر شاہانہ و مطلق العنان طرز کی حکمرانی کا لازمی حصہ ہوا کرتی ہے۔ اور جس میں

اس کا حکمران طبقہ اور اس کے دلال، محنت کش عوام کی پیدا کردہ دولت کو غصب کرتے رہتے ہیں۔

محنت کشوں کی نئی نسل کسی طور بھی تیار نہیں ہے کہ وہ کم اجرتوں اور خراب صورتحال میں کام کرے، جسے بدحال دیہاتوں سے آنے والی محنت کشوں کی پرانی نسل کے محنت کش کام ملنے کی غرض سے قبول کرلیا کرتے تھے۔ چینی سماج میں اضطراب کی کیفیت کا اندازہ چین میں ہونے والی کام کی جگہوں پر ہڑتالوں، مظاہروں اور خودکشیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے ہوتا ہے۔ یہاں احتجاج کو سختی سے کچل دیا جاتا ہے اور جہاں چند ایک ہی حفاظتی قانونی حقوق میسر ہیں وہ بھی لاگو ہونا کم سے کم ہو رہے ہیں۔ اس کیفیت میں چین میں بغیر کسی پیشگی انتباہ کے کسی بھی وقت اچانک بڑے دھماکے ہو سکتے ہیں۔ یہ کسی طور کوئی حادثہ نہیں ہے کہ چین کی حکومت پہلی بار اپنے بیرونی دفاع سے کہیں زیادہ اپنے اندرونی دفاع پر خرچ کر رہی ہے۔

مزدور تحریک

معیشت میں یہ سست روی ایک بہت بڑے بحران کا پیش خیمہ ہے جس میں یہ اندازے بھی لگائے جا رہے ہیں کہ آنے والے عرصے میں چین کا گروتھ ریٹ 6 فیصد سے بھی نیچے گر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں چین میں طبقاتی تضادات پھٹنے کی جانب بڑھ سکتے ہیں اور نئے انقلابی طوفان ابھریں گے۔ چینی حکمران اسے ایک ''نیا معمول'' قرار دے رہے ہیں اور اس پکتے ہوئے لاوے کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اگر چین میں موجود مزدور تحریک پر نظر دوڑائیں تو صورتحال واضح ہوتی ہے۔ گروتھ ریٹ میں کمی کو نیا معمول قرار دینے سے محنت کشوں کی تکالیف اور اذیت کو کم نہیں کیا جا سکتا جو ہر روز فیکٹریوں کی بندش سے بیروزگاری اور محرومی کا سامنا کر رہے ہیں اور ان کی تنخواہوں کی عدم ادائیگی میں اضافہ ہو رہا ہے، کم از کم اجرت میں اضافہ نہیں ہو رہا اور سوشل سکیورٹی ادا نہیں کی جا رہی۔

چائنہ لیبر بلیٹن کے مطابق 2014ء میں کم از کم محنت کشوں کی 1378 ہڑتالیں اور احتجاجی مظاہرے ہوئے جو 2013ء کی تعداد (656) سے دوگنا اور 2012ء کی تعداد (382) سے تین گنا زیادہ ہیں۔ 2014ء کی آخری سہ ماہی میں 569 ہڑتالیں ہوئیں جو سب سے زیادہ ہیں۔ ان اعداد و شمار سے نظر آتا ہے کہ چین میں ہونے والی ہڑتالوں اور مظاہروں کی رپورٹنگ

میں اضافہ ہوا ہے لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ چین میں طبقاتی کشمکش میں شدت آ رہی ہے اور تضادات تیز ہو رہے ہیں۔ گزشتہ سال چین کی حالیہ تاریخ کی سب سے بڑی ہڑتال بھی دیکھنے میں آئی جب یوئی یوئین (Yue Yuen) جوتوں کی فیکٹری میں اپریل 2014ء کی ایک ہڑتال میں 40 ہزار محنت کشوں نے حصہ لیا۔

جنوب میں واقع گوانگ ڈونگ صوبہ چین کی مزدور تحریک کا مرکز ہے۔ 2013ء میں 37 فیصد ہڑتالیں یہاں ہوئی تھیں۔ اب پورے چین میں ہڑتالوں کا سلسلہ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ 31 میں سے 22 صوبوں میں گزشتہ سال ہڑتالوں کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ ان بڑھتی ہوئی ہڑتالوں کی مختلف وجوہات ہیں جن میں چین کے محنت کش طبقے کا بڑھتا ہوا شعور سب سے کلیدی وجہ ہے اس کے علاوہ معیشت میں سست روی اور سرمایہ داروں کا سستی لیبر کی خواہش میں اندرونی علاقوں کی جانب رخ کرنا شامل ہے۔

مینوفیکچرنگ (پیداواری صنعت) کے شعبے میں ابھی بھی سب سے زیادہ ہڑتالیں ہو رہی ہیں جہاں 2014ء کی 41 فیصد ہڑتالیں ہوئیں۔ لیکن سب سے زیادہ اضافہ تعمیرات کے شعبے میں ہوا جہاں 2013ء میں 3 فیصد ہڑتالیں ہوئیں لیکن 2014ء میں 18 فیصد۔

2009ء کے بعد سے گھروں کی تعمیر کا شعبہ تیزی سے ترقی کر رہا تھا اور کینیشین پالیسیوں کے نتیجے میں چلنے والا یہ شعبہ چین کی معیشت کا اہم عنصر بن چکا تھا۔ لیکن 2014ء کے آخر میں اس شعبے میں آنے والی تیزی کا اختتام ہوا۔ اب گھروں کی تعمیر کا شعبہ زوال کا شکار ہے۔ فروخت میں کمی اور قرضوں کی دستیابی میں کمی کے باعث اس شعبے سے وابستہ بہت سے سرمایہ دار منافعوں میں کمی کا شکار ہیں۔ اسی وجہ سے اجرتوں کے تنازعات میں اضافہ ہوا ہے۔ 2014ء میں اس شعبے میں ہونے والی 90 فیصد ہڑتالوں کا تعلق اجرتوں کے بقایا جات کی ادائیگی سے تھا۔ یہ ہڑتالیں شمال مشرق کے کم ترقی یافتہ علاقوں اور اندرونی علاقوں میں مرکوز تھیں جہاں ہاؤسنگ کا بلبلہ پھٹا۔

اسی طرح ٹرانسپورٹ کے شعبے میں بھی ہڑتالوں میں اضافہ ہوا۔ اہم بندرگاہوں پر ٹرک ڈرائیوروں کی ہڑتالیں اور جنوری 2015ء میں ٹیکسی ڈرائیوروں کی ہڑتال ہوئی جو پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں کے باعث ٹیکسی کمپنیوں کی جانب سے زیادہ وصولی اور بغیر لائسنس کے ڈرائیوروں کی موجودگی ان ہڑتالوں کی بڑی وجہ بنی۔

ایک اور اہم تبدیلی اساتذہ کی ہڑتالوں میں اضافہ ہے۔ ان ہڑتالوں میں سے اکثر

2014ء کی آخری سہ ماہی میں ہوئیں۔ان میں سب سے زیادہ نمایاں شمال مشرقی صوبے ہیلونگ جیانگ میں ہونے والی ہڑتال تھی۔ یہاں پرائمری اور مڈل سکولوں کے 20 ہزار اساتذہ صوبائی دارالحکومت ہاربن میں جمع ہو گئے اور کم اجرت اور پنشن کی بے قاعدگیوں کے خلاف احتجاج کیا۔نسبتاً کم ترقی یافتہ علاقوں کے سرکاری سکولوں میں ہونے والی یہ ہڑتالیں کم اجرتوں، ریاستی سبسڈی کے خاتمے، باقاعدہ روزگار نہ ہونے،پنشن اور قلیل ہاؤسنگ فنڈ اور کارکردگی کی بنیاد پر اجرتی نظام کے خلاف ہوئیں۔ 'ہوبے' صوبے کے شہروں ژیاؤگن اور اینشی،شانزی صوبے کے شہر یولن،اندرونی منگولیا کے شہر 'باؤتو' سمیت بہت سے غیر ترقی یافتہ علاقوں میں ایسی ہڑتالیں ابھریں۔مالیاتی مشکلات کے باعث مقامی حکومتیں اساتذہ کی تنخواہیں، پنشن اور دوسری رقوم ادا نہیں کر پائیں۔ان کے ساتھ ساتھ نجی سکولوں اور نرسریوں میں بھی اجرتوں کے بقایاجات اور ظالم اور جابر انتظامیہ کے خلاف بھی ہڑتالیں ہوئیں۔ماضی میں اساتذہ ہڑتالیں کرنے میں ہچکچاتے رہے ہیں لیکن موجودہ مشکل حالات انہیں اس طرف مجبور کر رہے ہیں۔

چین کی کوئلے کی صنعت میں دو سالہ زوال کے بعد اس شعبے میں بھی ہڑتالوں اور احتجاجی مظاہروں کا نیا سلسلہ شروع ہوا ہے۔چینی کوئلے کی صنعت کی ایسوسی ایشن کے چیئرمین وانگ ژیازینگ کے مطابق چین میں کوئلے کی نصف سے زیادہ کمپنیاں اپنے مزدوروں کو تنخواہوں کی ادائیگی میں مشکلات کا سامنا کر رہی ہیں اور 70 فیصد سے زائد کمپنیاں گھاٹے میں ہیں۔کان کنوں کے مطالبات اجرتوں کے بقایاجات اور کام کی بندش کے گرد ہیں۔

2014ء میں تمام شعبوں میں ہونے والی ہڑتالوں کا 73 فیصد اجرتوں میں اضافے یا بقایاجات کی ادائیگی کے متعلق تھا۔معاشی ترقی میں سست روی کے ساتھ کم از کم اجرت میں اضافہ بھی سست روی کا شکار ہو گیا ہے۔صرف 20 ریجنز میں کم از کم اجرت میں اضافہ ہوا جس کی اوسط 13.1 فیصد ہے۔یہ 2011ء کے بعد کم ترین اضافہ ہے۔اجرتوں کے مسائل کے علاوہ مزدور یہ بھی مطالبہ کر رہے ہیں کہ مالکان سوشل سکیورٹی ادا کریں اور ہاؤسنگ فنڈ میں حصہ ڈالیں جیسا کہ 'یوی یوین' کی ہڑتال میں نظر آیا۔

ان ہڑتالوں میں اضافہ چین کے حکمران طبقے کے لیے چتاونی ہے۔ماضی میں ترقی کے ادوار میں حکومت ایسی ہڑتالوں میں مذاکرات کے لیے سہولت کار کا کردار ادا کرتی تھی لیکن اب وہ

ان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہڑتالوں کے دوران پولیس کی مداخلت اور گرفتاریوں کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً یوی یوین کی ہڑتال میں پولیس نے نہ صرف ہڑتالی مزدوروں پر تشدد کیا بلکہ اپنے کتے لے کر فیکٹری میں داخل ہو گئی تاکہ مزدوروں کو ڈرا کر دوبارہ کام پر لگایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت مزدور رہنماؤں اور این جی اوز کو بھی ہراساں کر رہی ہے اور انہیں زیادہ عرصے کے لیے گرفتار کر رہی ہے تاکہ انہیں کنٹرول کیا جا سکے۔ اس کا مقصد محنت کشوں کو سرکاری ٹریڈ یونین فیڈریشن کی جانب دھکیلنا ہے۔ آل چائنہ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین چین کی سرکاری اور واحد قانونی یونین ہے۔

چینی اشرافیہ آزادانہ طور پر ابھرنے والی مزدور تحریک کو روکنے کے لیے 'سیفٹی والو' اور دیگر ہتھکنڈے بھی استعمال کر رہی ہے۔ مثلاً 2012ء میں گوانگ ڈونگ صوبے میں شینزن کے علاقے میں محنت کشوں نے جدوجہد کے ذریعے 163 اداروں میں یونین کے نمائندوں کے لیے براہِ راست انتخاب کا حق حاصل کیا۔ حکومت نے اس کا جواب اجتماعی سودا کاری اور معاہدوں کے لیے نئے قوانین سے دیا جن کا اطلاق یکم جنوری 2015ء سے ہو چکا ہے۔ اس کے مطابق صرف سرکاری ٹریڈ یونین ہی مزدوروں کی نمائندگی کر سکے گی۔

چین کی معیشت میں مزید سست روی اجرتوں میں مزید کمی کرے گی اور حالات کار مزید بدتر ہوں گے۔ یہ بیروزگاری میں بھی اضافہ کریں گے اور کام کی دستیابی میں مزید بے یقینی پیدا ہو گی۔ وزیراعظم لی کی کیانگ نے حال ہی میں ایک بیان میں کہا ہے کہ ہر سال محنت کی منڈی میں آنے والے نئے ایک کروڑ افراد کو روزگار کی فراہمی کے لیے چین کی معیشت کا کم از کم 7.2 فیصد کی شرح سے ترقی کرنا ضروری ہے۔ اس سال کے اہداف کے مطابق شرحِ ترقی اس سطح سے نیچے گر سکتا ہے۔ بیروزگاری میں شدید اضافے کا تناظر بھی واضح ہو رہا ہے۔

یہ تمام صورتحال زیادہ بڑی ہڑتالوں، تحریکوں اور احتجاجوں کو جنم دے گی جن میں محنت کش زیادہ بڑے پیمانے پر منظم ہونا شروع ہوں گے۔ چین اب جس 'نئے معمول' میں داخل ہو چکا ہے وہاں صرف معاشی ترقی میں گراوٹ ہی نہیں بلکہ داخلی تضادات اور طبقاتی کشمکش بھی تیز ہو گی۔ چین کا محنت کش طبقہ جاگ رہا ہے۔

انقلاب کی تیاری کا عمل

سرمایہ داری کی ترویج کے ساتھ ساتھ طبقاتی تفریق میں بھی بے انتہا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔اس سے چین کے اندر طبقاتی کشمکش کی بنیادیں استوار ہورہی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ چین اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ عدم مساوات والا ملک ہے۔مجموعی صورتحال یہ ہے کہ اوپر کے 20 فیصد لوگ کل قومی آمدنی کا 50 فیصد استعمال کرتے ہیں جبکہ نیچے کے 20 فیصد لوگوں کو محض 4.7 فیصد حصہ ملتا ہے۔یہ اعداد و شمار اقوام متحدہ کی رپورٹ سے لیے گئے ہیں جو ایک مضمون کی شکل میں ژن ہاؤ نیوز ایجنسی نے شائع کی ہے۔اسی مضمون میں کہا گیا ہے کہ ''محنت اور سوشل سکیورٹی کی وزارت کے انسٹی ٹیوٹ آف لیبر اینڈ ویج سٹڈی'' کی ایک رپورٹ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ 2003ء سے چین میں آمدنی کا فرق بہت تیزی سے بگڑتا آیا ہے اور اب یہ 'نارنجی' (Orange) کی سطح کے خطرے پر پہنچ گیا ہے جو اس ادارے کے معیار کے مطابق دوسری سب سے خطرناک سطح ہے۔اگر کوئی موثر اقدامات نہ اٹھائے گئے تو یہ مزید بگڑ کر 'سرخ' (Red) سطح پر پہنچ سکتا ہے جو سب سے خطرناک سطح ہے۔''

اقوام متحدہ کی اس رپورٹ کی بنیاد گنی (Gini) کے پیمانے پر رکھی گئی ہے جو کسی بھی ملک میں عدم مساوات ماپنے کا ایک شماریاتی آلہ ہے۔صفر کا مطلب ہوتا ہے ''مکمل مساوات'' جبکہ ایک کا مطلب ہوتا ہے ''مکمل عدم مساوات''۔چین میں یہ پیمانہ 0.45 تک پہنچ چکا ہے۔بین الاقوامی سطح پر قابلِ قبول معیار کے مطابق جب کسی ملک میں گنی کا پیمانہ 0.40 تک پہنچ جائے تو صورتحال ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔چین میں یہ پیمانہ نہ صرف 0.40 کی حد تک پہنچ چکا ہے بلکہ اس سے آگے جا چکا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ ژن ہاؤ ایجنسی کہتی ہے ''اگر یہ رجحان بلا روک ٹوک جاری رہا تو تمام لوگوں کیلئے مشترکہ ترقی کا مقصد حاصل کرنا ممکن ہی نہیں رہے گا اور بڑھتا ہوا فرق سماجی انتشار کو بھڑکا سکتا ہے۔'' ہمیں چین کے جدید شہروں میں بڑی بڑی بلند و بالا عمارتیں امنڈتی ہوئی نظر آتی ہیں جن کے گرد شہروں میں پھیلی ہوئی غربت کے وسیع و عریض علاقے ہیں۔صرف یہی بات چین میں طبقاتی جدوجہد کو بھڑکانے کیلئے کافی ہے۔

اس صورتحال میں مارکسیوں کے فریضے کیا ہیں؟ یقیناً پہلا فریضہ تو یہ ہے کہ اس بات کی وضاحت کی جائے کہ کیا ہو رہا ہے۔اگر مارکسیوں کو چین کے مزدوروں، طلبا اور کمیونسٹ پارٹی کے انفرادی طور پر دیانت دار ممبران سے بات چیت کا آغاز کرنا ہے تو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ ان

کا تجزیہ حقیقی ٹھوس صورتحال کے عین مطابق ہو۔اس لئے انہیں چاہیے کہ چینی معیشت، سماج اور سیاست کے ہر ایک پہلو کا تفصیلی مطالعہ کریں۔ یہ ایک سنجیدہ غلطی ہوگی کہ ایک پیچیدہ، متضاد اور ایک ایسے عمل کا پہلے سے تیار فارمولوں کی بنیاد پر جائزہ لیا جائے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی اور جن کا مزدوروں اور نوجوانوں کی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔اس طرح کے طرزِ عمل کے ساتھ وہ کسی منزل کو نہیں پا سکتے۔

اسی طرح چین کی روایات کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ روسیوں کے پاس بالشویکوں، لینن اور ٹراٹسکی کی روایات ہیں۔ چین کے اندر ایسی روایت کا فقدان ہے۔ چین کی سب سے بڑی روایت ماؤازم ہے۔ تاہم یہ واحد روایت نہیں ہے۔ یہاں چن ڈوشو (Chen Tu Hsiu) (1879-1942ء) کی روایت بھی ہے جو چین کی کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے ایک ہے اور جو ایک خاص وقت میں ٹراٹسکی ازم کی طرف مائل ہوا تھا۔

1917ء کے اکتوبر انقلاب کے چن ڈوشو پر زبردست اثرات مرتب ہوئے تھے جس سے وہ سمجھنے لگا تھا کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خاتمے ہی سے سماجی ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ 1919ء کی سامراج دشمنی کی چار مئی کی تحریک کا لیڈر تھا۔ اگلے سال اس نے دیگر انقلابی قوتوں سے مل کر چین کی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی جس کی پہلی نیشنل کانفرنس جولائی 1921ء کو شنگھائی میں ہوئی تھی۔

وہ ایک المناک انجام سے دوچار ہوا تھا۔ 1926ء میں سٹالن کے احکامات پر عمل کرنے سے چین کا انقلاب شکست سے دوچار ہوا۔ تاہم کمیونسٹ انٹرنیشنل نے کسی طرح کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور تمام تر الزامات چن (Chen) پر عائد کر دیئے اور 1927ء میں اسے پارٹی کی قیادت سے ہٹا دیا گیا۔ اس نے یہ مطالبہ کیا کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پالیسی کا سنجیدگی کے ساتھ ازسرِ نو جائزہ لیا جائے جس کے نتیجے میں 1929ء میں اس پر حزبِ مخالف سے تعلق رکھنے کا الزام عائد کر کے پارٹی سے نکال دیا گیا۔ اس نے بعد میں ٹراٹسکی کی لیفٹ اپوزیشن میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

یہ ایک مثبت پہلو ہے کہ آج کل چین میں چن ڈوشو کے نام پر سوسائیٹیاں بنائی گئی ہیں جن کا مقصد اس کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ حال ہی میں خاص کر طلبا کے اندر مارکسی بحثوں پر مبنی سرکلز قائم کیے گئے ہیں۔ کچھ پرتوں کے اندر مارکسزم کے حقیقی نظریات پھر سے تلاش کرنے کی پیاس

موجود ہے۔ اس سے ایک حقیقی ترقی پسند معاشرے کی طرف بڑھنے کی خواہش کی عکاسی ہوتی ہے جو محض ایک سوشلسٹ سماج ہوسکتا ہے جس کی بنیاد مزدور جمہوریت پر رکھی جائے۔

مارکسیوں کو ان ترقی یافتہ پرتوں، مزدوروں اور نوجوانوں کو واضح طور پر بتانا ہوگا کہ ان کے نزدیک چین میں کیا ہوا ہے۔ انہیں منصوبہ بند معیشت کی برتری کی وضاحت کرنی ہوگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ چینی بیوروکریسی کے بحران کا تجزیہ بھی کرنا ہوگا اور اس بات کا بھی کہ ایسا کیوں ہوا اور ماؤاسٹ نظام کیونکر بچ نہیں پایا۔ کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے 1949ء کے اس انقلاب کا تناظر دو سال قبل 1947ء میں لکھ دیا تھا۔ ٹراٹسکی اور ٹیڈ گرانٹ کی تحریریں چین کے انقلاب اور تضادات سمجھنے کے لئے لازم ہیں۔

اگرچہ اب بھی ریاستی شعبے میں چلنے والی معیشت اور ریاستی ڈھانچہ دونوں کے اعتبار سے پرانے نظام کی باقیات موجود ہیں لیکن چین کو جس بنیادی فریضے کا سامنا ہے وہ سماجی اور معاشی انقلاب ہے۔ معیشت کا فعال اور منافع بخش حصہ نجی شعبے کے پاس ہے۔ سرمایہ داری کی استواری کا عمل ایک ایسی حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ ''چینی خصوصیات کے حامل سوشلزم'' کی تمام تر باتیں محض ایک فریب ہے جس پر کوئی یقین نہیں کرتا حتیٰ کہ چینی بیوروکریسی بھی۔ اگرچہ متضاد رجحانات موجود ہیں لیکن اب یہ عمل ایک ایسے نکتے تک پہنچ گیا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔

ریاستی ڈھانچہ پہلے بھی ایک بے ہودہ آمرانہ بیوروکریٹک نظام پر مبنی تھا اور اب سرمایہ دار اشرافیہ کے جبر سے اور اذیت ناک ہے اور اسے سرمایہ داری اور سٹالنزم کے انتہائی حقارت آمیز پہلوؤں میں ضم کر دیا گیا ہے۔ بیرونی خول یا ہیئت ایک سٹالنسٹ ریاستی ڈھانچے کی ہے لیکن اصل میں یہ سرمایہ دارانہ ہے۔ اس صورتحال سے وہ تضادات جنم لے رہے ہیں جو کسی مخصوص لمحے پر ایک انقلابی تحریک کو جنم دے سکتے ہیں۔

چین اس وقت اپنے تئیں ایک عالمی قوت ہے۔ اس کا مقدر عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات خاص کر عالمی معیشت سے جڑا ہوا ہے۔ اسی طرح چین کے اندر رونما ہونے والے واقعات کے معاشی اور سیاسی دونوں اعتبار سے اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوں گے۔

خاص کر آنے والے دور میں چین کے محنت کش طبقے نے ایک کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ نپولین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''جب چین جاگتا ہے تو ساری دنیا لرزتی ہے۔'' نپولین کی بات کو

آسان لفظوں میں بیان کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کا سویا ہوا دیو چین کا پرولتاریہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مزدور طبقے کا اجتماع ہے۔ جب وہ اٹھ کھڑا ہوگا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکے گی اور اس سے تمام تر عالمی صورتحال بدل جائے گی۔ چین کا انقلاب اس کرۂ ارض پر سوشلزم اور نسلِ انسانی کے کمیونسٹ مستقبل کی نوید بنے گا۔

BIBLIOGRAPHY

BOOKS

1. Ted Grant , The unbroken Thread

2. Wang Fan-His , Chinese Revolution

3. Leo Trotsky, The Third International after Lenin

4. Jain Bozan , The Concise History of China

5. Leon Trotsky , Problems of Chinese Revolution

6. V.I. Lenin, Critical Remarks on the National Question

7. Alan Woods, Where is China Going?

8. J.V. Stalin, Problems of Leninism

9. Mao Ze Tung , New Democracy

10. Dr. Li Zhisui, Private Life of Chairman Mao

11. Erick R. Wolf, Peasant Wars of the Twentieth Century

12.Selected Works of Mao Ze Tung
(People's Publishing House - Peking)

13. Salomon Brothers , The Economy of PRC Analysis and Forecasts

14.Journal of Contemporary Asia Vol.26 No.2 1996

16.China After Deng by William H. Overholt

17.China Can Say No by Tang, Zhang, Qias, Song & Gu

18. Harold R. Isaacs, The Tragedy of Chinese Revolution

19. Andrew Scobell & Andrew J. Nathan, China's Search for Security

20. Andrew Small, The China-Pakistan Axis, Asia's New Geopolitics

JOURNALS, PERIODICALS AND REPORTS

1. Pervaiz Gorgani, The 1945-49 Revolution (Tabqati Jiddojehad) March 1982

2. Report July 1996, CNAM - China

3. Asia Week (Hong Kong)

4. The Economist (London)

5. Time (New York)

6. Far East Asian Economic Review (Hong Kong)

7. News Week (New York)

8. Financial Times (London)

9. The Nation (Lahore)

مصنف کی دیگر کتابیں!

1۔ سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان (1) لندن، جنوری 1983ء

2۔ پاکستان میں قومی مسئلہ اور نظریۂ کنفیڈریشن لندن، مئی 1983ء